غربت کے کتنے چہرے

تالیف : محمد یونس
ترجمہ : قاضی جاوید

مشعل

غربت کے کئی چہرے

تالیف: محمد یونس

ترجمہ: قاضی جاوید

مشعل

آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

غربت کے کئی چہرے

تالیف: محمد یونس

ترجمہ: قاضی جاوید

کاپی رائٹ (c) انگریز-1987 گرامین بینک، بنگلہ دیش
کاپی رائٹ (c) اردو—1997 مشعل

MashalBooks.org

ناشر: مشعل
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

مندرجات

پیش لفظ	حسین مجروح	5
دیباچہ	محمد یونس	11
بیل ٹال کی زرینہ		22
بختاور کی کہانی		34
تقدیر کی ماری مایا رانی		83
پھول جان کی زندگی		95
محفل کا گھر		117
زلیخا کی موت		129
حلیمہ کی آس		141
شماری کی خوشیاں		151
ماریا کا حال		169

MashalBooks.org

جمنا کے انداز	180
محنت کش گھریلو عورت	194
رابعہ کی زندگی	205
دکھوں کی بیٹی	219
تارا	231
آسیہ کی نجات	246

MashalBooks.org

پیش لفظ

معجزے خدائی بھی ہوتے ہیں اور انسانی بھی۔ خدائی معجزے صراحت کے طلب گار ہوتے ہیں نہ ان کے برپا ہونے میں آدمی کی صوابدید کو دخل۔ البتہ انسانی دل و دماغ سے نمودار ہونے والے معجزوں پر مکالمہ بھی ہوسکتا ہے اور ان کی پلکوں پر استفادے کے چراغ بھی جلائے جا سکتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نوع انسانی کی غالب تعداد لگے بندھے معمول کے مطابق زندگی گزارنے کے باوصف، قدم قدم پر معجزوں کی متلاشی ہوتی ہے۔ موجود سے نامطمئن رہنا، آدمی کی گھٹی میں پڑا ہے لیکن ہیئت موجودہ کی رسی تڑا کر کسی موہوم امکان کو کھوجنا، ہر کسی کے بخت میں نہیں ہوتا۔

انسانی تجربہ ایک ایسا بینک ہے جس میں جستجو کی پونجی سے جو چاہے کھاتہ کھول سکتا ہے۔ البتہ انسانی معجزہ محض جستجو کے بل پر رونما ہوتا ہے نہ آرزو کے لاسے۔ یہ کہیں بھی ہوسکتا ہے اور کسی کے ہاتھوں سے۔ محنت اور ارادہ شرط سہی لیکن سبھی کے بوئے ہوئے بیج برگ و بار کب لاتے ہیں۔ انسانی معجزہ ہر روز، ہر جگہ نہیں ہوتا کہ اسے معمول و موجود سے چڑ ہے۔ ایک مدت سے ہماری سر زمین معجزوں سے خالی ہو چکی ہے لیکن اسی دب اکبر کے ٹوٹے ہوئے تارے میں، ایک ایسا معجزہ ظہور میں آ چکا ہے جس کی چکا چوند سے ہم تو خیر کیا مرعوب ہوتے (کہ ایک مدت سے ہم نے خدائی معجزوں سے مرعوب ہونے کا کام بھی خدا پر ہی چھوڑ رکھا ہے) لیکن اس کرشمے نے دنیا بھر کے مالیاتی نظاموں کو اچنبھے میں ڈال رکھا ہے۔ عالمی اقتصادیات کے وہ سامری جنہیں تیسری (اور چوتھی) دنیا کے درماندگان کی نجات کے لئے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے تجویز کردہ نسخہ ہائے شفا کے سوا کوئی سبیل نظر نہیں آتی، گرامین بینک کے معجزے سے انگشت بدنداں ہیں۔

MashalBooks.org

سرمایۂ بھرے پیٹ کا چوہا ہوتا ہے جو خالی بھڑولے میں مینگنیاں بھی نہیں ڈالتا۔ سود اور خود غرضانہ منفعت پر مبنی بینک کاری نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پیاس سے جاں بہ لب شخص کے لئے یہ پانی کے ایک قطرے کا روادار نہیں ہوتا جبکہ اپھارے سے پھولی ہوئی تو ند پر پوری چھاگل الٹا دیتا ہے۔ ایسے میں افتادگان خاک کی مسیحائی کون کرے۔ آسمان ان سے خفا، زمین ان سے بیزار۔ ویسے بھی محرومیوں اور فاقہ مستیوں کو مقدر کی بیاض میں لکھ دینا اور اگلے جہاں میں صبر کا میٹھا پھل چکھنے کی تسلی، صدیوں تک ان کے پرکھوں کا شیوہ رہا ہوتا ہے، سو طمع (یعنی حالت بدلنے) اور بے صبرے پن میں وہ نا خلف کیوں ٹھہریں۔

چند استثنائی صورتوں کے سوا، پس ماندہ ممالک کے تعلیمی نظام، اس طور مرتب کئے جاتے ہیں کہ دانش گاہیں، کیچوے سازی کے مراکز بن جاتی ہیں۔ کیچوے جنہیں زمین پر رینگنا مرغوب ہوتا ہے اور جو کچلے جانے کے قوی امکان کے باوجود سر اٹھا کر چلنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ تاہم قدرت کا اپنا نظام الاوقات ہے۔ جس طرح فرعون (رامیس ۲) کی ہر ممکن پیش بندی کے باوصف، موسیٰ کی پرورش اس کے اپنے محل میں ہوئی، اسی طرح تدریسیت کی کیچوے سازی سے کبھی کبھار، شہباز بھی نمودار ہو جاتے ہیں جن کی اڑان تیز اور نگہ بلند ہوتی ہے اور جو افکار تازہ سے وطن کی کشت ویراں کو اس طرح سیراب کرتے ہیں کہ صدیوں محو ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد یونس ایک ایسے ہی عبقری ہیں جنہوں نے گرامین بنک کے ذریعے بنگلہ دیش کی محروم طبقوں خصوصاً خواتین کی اقتصادی خوش حالی اور سماجی ترقی کا خواب دیکھا اور اسے سچ کر دکھایا۔

بنگلہ دیش ایسی نچلی سطح کی معیشت اور دقیانوسی معاشرت میں غربت کی انتہائی لکیر، 1975ء میں آج کی نسبت بے حد شرم ناک تھی۔ محدود ذرائع آمدنی، کثرت اولاد، آئے دن طوفانوں اور غیر مستحکم سیاسی صورت حال نے غریبوں کے لئے موعودہ سونار بنگلہ کے چہرے پر مایوسی کی بھوبل مل دی تھی۔ محروم طبقات کی خواتین کو دوہرے استحصال کا سامنا تھا۔ کم عمری میں شادی، کثیر العیالی اور کم خوراکی کے علاوہ ان کے لئے آزادانہ محنت کے مواقع اور پیداواری ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ظاہر ہے ایک روائتی اور پس ماندہ معاشرے میں اس سے مختلف صورت حال کی توقع بھی کیسے کی جا سکتی تھی۔ دوسری جانب، مروجہ بنکاری

نظام یا دیگر اداراتی ذرائع میں غریبوں کی مالیاتی ضروریات کا کوئی اہتمام تھا نہ گنجائش۔

ڈاکٹر محمد یونس نے 1975ء میں چٹا گانگ یونیورسٹی کے قریبی گاؤں' جوبرا میں غریب عورتوں کی اقتصادی حالت اور کارکردگی کے بارے میں ایک جائزہ مرتب کیا تو صورت حال کی سنگینی ان پر مزید واضح ہوئی۔ اول تو خواتین کے لئے آمدنی کے آزادانہ مواقع ہی میسر نہ تھے لیکن جنہوں نے ہمت کر کے یا بامر مجبوری' گھریلو ہنر (مثلاً ٹوکریاں بنانا وغیرہ) کو محدود تجارتی پیمانے پر اختیار کیا' ان کی محنت اور ہنر کا بیش تر ثمر بھی بیوپاری ہی ہڑپ کر جاتے۔ یہ خواتین اپنی تیار کردہ اشیاء ان بیوپاریوں کے ہاتھ فروخت کرنے پر اس لئے بھی مجبور تھیں کہ ذاتی سرمائے کے فقدان کے باعث انہوں نے خام مال یا اپنی دیگر ضروریات کے لئے بیوپاریوں سے پیشگی رقوم لی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر یونس ایسے دردمند اور تخیل شعار شخص کے لئے یہ صورت حال نا قابل برداشت تھی۔ چنانچہ 1976ء میں انہوں نے جوبرا ہی کے مقام پر قلیل سرمائے اور محدود پیمانے پر گرامین بنک پراجیکٹ کی داغ بیل ڈالی جس کے تحت بے زمین اور قلاش دیہاتیوں (مردوں اور عورتوں) کے روزگار اور اقتصادی حالت کے سنوارنے کے لئے سرمایہ اور مشاورت فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا۔

ایک ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی بیس فی صد سے زائد نہ ہو اور آبادی کا معتدبہ حصہ غربت کی انتہائی لکیر سے بھی نیچے زندگی کو گھسیٹ رہا ہو' گرامین بنک ایسا منصوبہ' محض دیوانے کی بڑ دکھائی دیتا ہے۔ تاہم خلوص اور مقصد پر یقین' دو ایسے ہتھیار ہیں جن سے چٹانوں کا سر قلم اور سمندروں کا غرور منہدم کیا جا سکتا ہے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق انفرادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بجائے اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ پانچ سے دس افراد کا ایک گروپ بنا دیا جائے جو مقامی طور پر اپنی ضروریات کا تعین کرے اور اپنے ارکان کی اقتصادی سرگرمیوں کے لئے درکار سرمایہ (جو بیشتر حالتوں میں چند سو ٹکے ہوتا) فراہم کرے۔ شخصی ضمانت پر فراہم کردہ ان محدود قرضوں کی ادائیگی اور اس کی وصول یابی بھی گروپ کے فنڈ ہی کی سطح پر ہفتہ وار قسطوں میں ایک سال کے اندر کرنی ہوتی۔ چونکہ اس بنک کے قرضوں کا انتظام بھی انہی کے ہاتھ میں تھا جو براہ راست اس کے سرمائے سے مستفید ہوتے' لوگوں کے بجائے۔ ہر ہفتے بنک خود چل کر' مقررہ جگہ پر ان کی ضرورتوں کا جائزہ لینے اور مطلوبہ سرمایہ فراہم کرنے کے لئے موجود ہوتا۔ (کاغذی کارروائی سے نجات

اس پر مستزاد تھی) یہ تجربہ انتہائی کامیاب رہا اور محض چھ سات سال' یعنی اکتوبر 1983ء تک گرامین بینک پچاس ہزار سے زائد بے زمین غریبوں میں 160 ملین ٹکا (بنگلہ دیشی روپیہ) کے قرضے تقسیم کر چکا تھا جن میں عورتوں کا تناسب 40 فیصد تھا۔ تجارتی بینک کاری کے مسلمہ معیارات بالکل برعکس' گرامین بنک کے نادہندگان کی شرح ایک فی صد سے بھی کم ہے جو قرضوں کی لغت میں حیران کن بات ہے۔ بنک کاری کی تاریخ میں اس انوکھے تجربے کی کامیابی کے سات سال کے اندر ہی اس پراجیکٹ کو ایک مکمل بینک کی شکل دے دی گئی جس کے ساٹھ فیصد حصص حکومت کے پاس جبکہ چالیس فی صد بے زمین لوگوں کے پاس ہیں۔ اس تجربے کی کامیابی اور پھیلاؤ کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ بیس سال کے عرصے میں اس کا دائرہ کار بنگلہ دیش کے کونے کونے میں پھیل گیا اور روز بہ روز اس کی بچتوں' اس سے مستفید ہونے والوں اور ملکی معیشت کے فروغ اور استحکام میں گرامین بنک کسی اور ادارے کی نسبت زیادہ فعال کردار ادا کیا ہے۔

زیر نظر کتاب گرامین بینک کے سرمائے اور امداد سے مستفید ہونے والی چند خوش نصیب خواتین کی آپ بیتیوں پر مشتمل ہے جن کی محرومیوں اور دکھوں کی بے صدا راتوں کو گرامین کے اجالے نے جگمگا دیا۔ یہ کہانیاں ایک طرف غربت' طبقاتی ناہمواری اور استحصال کے مارے ہوئے بنگلہ دیشی معاشرے کا بھیانک چہرہ دکھاتی ہیں تو دوسری طرف ایک ایسے خوش کن منظر نامے سے روشناس کراتی جسے پڑھ کر زندگی پر ہمارا ڈولتا' جمتا ایمان مستحکم تر ہو جاتا ہے اور غریبوں کا عجزان کے اعتماد کا اعجاز ہو جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کی نسبت پاکستان کی معیشت اور معاشرت کہیں زیادہ پیچیدہ اور ناہموار ہے۔ یہاں بیسویں صدی کے پس خوردہ تیکنیکی مظاہر کے پہلو بہ پہلو قبل مسیح کی تہذیبی اور اقدار بھی مروج ہیں اور اٹھارویں/انیسویں صدی کے پیداواری رشتے بھی۔ دور تک تک پھیلے ہوئے غربت اور جہالت کے صحرائے گوبی میں مصنوعی خوش حالی کے ایسے نخلستان بہ کثرت ملتے ہیں جہاں بیل گاڑی' پجیرو کی منزل کھوٹی کرتی ہے۔ جاگیری تام جھام پر استوار پاکستانی معاشرے میں جہاں وسائل پر دسترس کی بالائی اور زیریں انتہا' دنیا کے بیش تر ممالک کو شرم سار کرتی ہے' گرامین ایسے معجزے کی رونمائی بہت پہلے ہو جانی چاہئے تھی۔ پاکستان جو اپنی پچاس سالہ زندگی میں سیاست اور معیشت کے میدانوں میں بے شمار الٹے سیدھے تجربوں

کی آماج گاہ رہا ہے، اگر اپنے نصیب کا گرامین سورج طلوع نہیں کر پایا تو اسے قومی بدقسمتی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے (اب کہیں لاہور میں اور خیر پور سندھ میں متحرک غیر سرکاری تنظیموں نے گرامین کی طرز پر محروم و پس ماندہ عورتوں کی خود کفالت کے لئے چھوٹے موٹے قرضوں کا ڈول ڈالا ہے۔ دیکھیں مفاد وابستہ اور عناد پیوستہ کے ہاتھوں، اس قطرے کو گہر بننے کی مہلت ملتی ہے کہ نہیں۔)

ایک ایسے ملک میں جہاں بچتوں کی شرح مجموعی قومی پیداوار کا صرف تیرہ (13) فیصد ہو آبادی کا نصف سے زائد حصہ صاف پانی کی نعمت سے محروم ہو، چالیس (40) فی صد بچے شیر خواری کی عمر میں دنیا سے روٹھ جاتے ہوں (اس کے باوجود آبادی میں شرح نمو باقی دنیا سے فزوں تر ہو) اور حقیقی شرح خواندگی دس بارہ فی صد سے متزاد نہ ہو، بے صدا زندگیوں کے لئے گرامین بینک ایسے بے نفس تجربے کی افادیت دو چند ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں چھوٹے قرضوں کی روایت نہیں رہی۔ اگرچہ پہلے دو عشروں میں بھی حکومتی سطح پر ناداروں کی اشک شوئی کے لئے کچھ نہ کچھ اداراتی قرضوں/اشک شوئی کا اہتمام کیا گیا لیکن ستر کی دہائی میں پہلی بار تجارتی بینکوں کے ذریعے چھوٹے دکانداروں اور مصنوعاتی آجروں کے لئے بڑے پیمانے پر قرضوں کا اہتمام کیا گیا۔ بعد ازاں زرعی شعبے میں بھی چھوٹے کاشتکاروں (بشمول مزارعین) کے لئے پیداواری قرضوں کے بلا سود اجراء کو تجارتی بینکوں کے لازمی اہداف کے طور پر نافذ کیا گیا۔ اسی سطح بے روزگار نوجوانوں کے لئے مختلف حکومتوں نے، اپنے اپنے ادوار میں خود کفالتی /روزگاری قرضوں کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن دفتری کاروائیوں، بدعنوانی، اقرباپروری اور مشنری جذبے کی عدم موجودگی کے باعث، ان تمام فلاحی اقدامات کے اثرات و افادیت نہ صرف محدود رہی بلکہ بعض صورتوں میں منفی ردعمل کا موجب بھی۔ دیہات کی سطح پر، جاگیردارانہ سوچ اور برادری ازم کے باعث، امداد باہمی کے ادارے بھی اس انقلاب کے پیشوائی میں ناکام رہے جو محروموں کے لہو ان کے لئے کھاد کر دیتا۔ شاید معجزے اور انقلاب حکومتی سرپرستی کے بجائے عاشقی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد یونس اور انکے گرامین بنک نے تو یہی ثابت کیا ہے۔

کتاب کے مترجم، قاضی جاوید، فلسفے کے علاوہ سماجی عمرانیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا شمار، اردو کے ان گنے چنے نثر نگاروں میں کیا جا سکتا ہے جو معروضی حقائق

MashalBooks.org

اور جدید علوم کے بیانیہ میں بلاغت، کشاد اور روانی کے ستارے اس مہارت سے جڑتے ہیں کہ پوری عبارت کہکشاں ہو جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب کے ترجمے میں بھی موصوف نے اسی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ پوری کتاب پڑھ جایئے مجال ہے کہیں دم رکے یا نظر کسمائے۔ ادارہ مشعل بھی مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اردو دان قارئین کی ذہنی غذا کے لئے ایک ایسی کتاب کا اہتمام کیا جو معجزے برپا کرنے کی لہک کو ہوا دیتی ہے۔

حسین مجروح

لاہور

MashalBooks.org

دیباچہ

اس کتاب میں بنگلہ دیش کی چند غریب عورتوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ سب ہماری جانی پہچانی عورتیں ہیں۔ ڈراموں، فلموں، ناولوں اور کئی دوسرے حوالوں سے ہم ان کو جانتے ہیں۔ شاید ذاتی طور پر بھی ہم ان سے بے خبر نہیں ہیں، یا کم از کم ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری شناسا سا کردار ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم عمر رسیدہ رضیہ سے بے خبر ہوں جو ہر روز برتن مانجھنے، کپڑے دھونے اور صفائی کرنے ہمارے گھر آتی ہے۔ جواں سال حمیدہ سے بھی ہم ناواقف نہیں جو بچے کو گود میں اٹھائے ہر روز ہماری سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہے اور جس کو اٹھانے کے لئے کم و بیش روزانہ ہی ہمیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا پڑتی ہے۔ (کیونکہ ہمیں خدشہ ہوتا ہے کہ ہمارے لاڈلے کہیں اس کے میلے کچیلے بچے سے کھیلنا نہ شروع کر دیں)۔

ہم ان عورتوں کو بھی جاننے کا دعوی کرتے ہیں جو رمضان کے مہینے میں خیرات مانگنے ہمارے دروازے پر جمع ہو جاتی ہیں یا پھر عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کا گوشت لینے کے لئے ایک دوسرے کو دھکے دیتی ہوئی ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ شاید ہم اس عورت کو بھی جانتے ہیں جو ایک چاند سا بچہ گود میں اٹھائے نظر آتی ہے اور جس کو دیکھ کر کئی قسم کے شبے ہمارے دلوں میں سر اٹھاتے ہیں۔

بلاشبہ ہم ان سب عورتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ وہ دیہات سے آتی ہیں اور شہروں میں مسائل پیدا کرتی ہیں۔ ہم اکثر شکایت کرتے ہیں کہ آخر حکومت شہروں میں ان کا داخلہ کیوں بند نہیں کرتی؟ (ان کا داخلہ بند ہو جائے تو کیا واقعی ہمیں خوشی ہو گی؟)

ان عورتوں سے ہمارا تعلق بس میکانکی سا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی فرد کے طور پر جاننے کا ہمیں موقع نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض ہماری دور کی رشتہ دار بھی ہو سکتی ہیں۔

ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کا بچپن میں دل و جان سے ہماری دیکھ بھال کی ہو۔ پھر بھی ہم نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ رضیہ کہاں سے آتی ہے' کیا اس کا کوئی گھر بار ہے؟ یوں یہ جانے پہچانے لوگ ہمارے لئے ہمیشہ اجنبی رہتے ہیں۔ چند پیسوں کے عوض وہ ہماری خدمت کرتے ہیں۔ ہماری جلی کٹی باتیں برداشت کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ہم سماج میں ان لوگوں کے کردار کے بارے میں ہر قسم کی جھوٹی سچی کہانیاں گھڑنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ یوں ان کو بخوبی جاننے، کی آڑ میں ضمیر کی کسی خلش کے بغیر' ہم اپنے سماجی ڈرامے میں مردہ سپاہیوں کا کردار ان پر تھوپ دیتے ہیں اور اپنی پسند کے لیبل اپنے ماتھے پر لگا لیتے ہیں۔

اس کتاب کی زرینہ سے ملنے کا موقع ہمیں بنگلہ دیش کے گرامین (دیہی) بنک پراجیکٹ نامی ایک خصوصی منصوبے کی سرگرمیوں کے حوالے سے ملا۔ یہ منصوبہ دیہی غریبوں تک بینکاری کی سہولتیں پہنچانے کی غرض سے شروع کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں جن دوسری عورتوں کی کہانیاں بیان ہوئی ہیں' ان سب سے بھی ہمارا تعلق اسی منصوبے کے سبب بنا۔ ان عورتوں نے گرامین بینک سے چھوٹی موٹی رقوم کے قرضے لئے اور اپنا مقدر بدلنے کی جدوجہد کی۔

ہم اصل میں یہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا اس منصوبے کے تحت بینک سے رقم حاصل کرنے والی عورتوں کو کوئی فائدہ پہنچا ہے' ان کو قرضے کی واپسی میں مشکلات تو پیش نہیں آتیں اور یہ کہ رقم کی سرمایہ کاری میں ان کو کس قسم کی رکاوٹوں کا سامنا رہا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر ہم نے ایک تحقیقاتی مطالعے کا پروگرام بنایا۔ اس مطالعے کا بنیادی اصول یہ طے کیا گیا کہ ہم ان عورتوں کا جائزہ محض بنک کے قرضدار کے طور پر نہ لیں گے بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان' ایک خاندان کی فرد اور سماجی کی رکن کے طور پر ان کو دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

اس مطالعاتی منصوبے کے تحت مرد اور خاتون قرضداروں کے کوائف جمع کئے گئے۔ یوں یہ چھوٹا سا مطالعہ ہمارے بے رحم معاشرے کی ایک واقعاتی دستاویز بن گیا۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی فرد کی زندگی میں ایسی مثبت تبدیلیاں پیدا کرنا کس قدر آسان ہے جو بظاہر ناقابل یقین محسوس ہوتی ہیں۔ ان سچی کہانیوں نے ہمارے کئی پرانے اور گہرے

عقیدے الٹ پلٹ دیئے۔ مثال کے طور پر ہم ہمیشہ سے یقین کرتے چلے آئے ہیں کہ غریب لوگ جاہل اور بے ہنر ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی حالت بہتر بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ حال مست رہتے ہیں اور قدم بقدم آگے بڑھنے کے لئے درکار صبر و استقامت سے محروم ہوا کرتے ہیں۔

زیرِنظر کتاب میں شامل تمام کہانیاں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اگر غریب لوگوں کو تھوڑی بہت مالی امداد میسر آ جائے تو وہ اپنی زندگیوں میں نا قابل یقین حد تک خوش گوار تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جن عورتوں کی کہانیاں ہم نے بیان کی ہیں وہ محض پانچ سو یا ہزار روپے حاصل کر کے اپنا مقدر بدلنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ان میں سے بعض دھان صاف کر کے چاول حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ بعض مٹی کے برتن بنانے کی آرزومند تھیں اور بعض کی خواہش گائے خریدنا تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی خصوصی تربیت کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ روزمرہ کے معمولات یا محنت مزدوری کرتے ہوئے تربیت ان کو پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ ان کو تو بس سرمایہ چاہیئے تھا، لیکن ریاست ان کو یہ سہولت مہیا کرنے پر آمادہ نہ تھی؛ حالانکہ یہ عورتیں امدادی رقم واپس کرنے پر تیار تھیں۔ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ یہ صورت حال اس وقت تھی جب کہ حکومتوں کو غربت کے خاتمے کے منصوبوں پر عمل کرنے کے لئے ہر سال اربوں ڈالر کی غیر ملکی امداد مل رہی تھی۔

غربت کا خاتمہ اور روزگار کے مواقع کی فراہمی ہماری ترقیاتی منصوبہ بندی کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ اس تصور کی اکثر اوقات وکالت کی جاتی ہے کہ عام لوگوں کو روزگار مہیا کر کے غربت کے خلاف جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ تاہم غور فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ترقیاتی پالیسی غربت کو ختم نہیں کرتی بلکہ اس کے تسلسل کا باعث بن جاتی ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کے لئے ''خوراک برائے محنت'' کے پروگرام کی مثال لیجئے اس پروگرام کے تحت اگر کسی شخص کو سال بھر کے لئے روزگار مل جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سال بھر اس کو دو وقت کی روٹی ملتی رہے گی۔ لیکن یوں اس کی غربت تو دور نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر اسی شخص کو سال بھر یومیہ اجرت کے طور پر گندم دینے کے بجائے سال کے آغاز میں پورے سال کی گندم کی قیمت کے مساوی رقم دے دی جائے تو وہ کسی نہ کسی طور اس

MashalBooks.org

رقم کی سرمایہ کاری کر سکے گا۔ یوں نہ صرف اس کو دو ٹائم کی روٹی میسر آتی رہے گی بلکہ اپنے لئے معاشی بنیاد بھی بنا سکے گا۔

غربت کے خاتمے کے لئے بڑی بڑی صنعتوں کے قیام کی وکالت کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ بلاشبہ ایسی صنعتوں کے قیام سے روزگار کے موقع بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اضافہ کس قدر ہوتا ہے اور کن لوگوں کے لئے ہوتا ہے؟ آبادی میں بے پناہ اضافہ کے باعث ہمارے ہاں روزگار کے متلاشتی افراد کی تعداد میں ہر سال لاکھوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ تو کیا ہم ایسی صنعتیں مسلسل قائم کر سکتے ہیں جو ان لوگوں کو روزگار دے سکیں؟ الہ دین کے کسی چراغ کی مدد سے ہم یہ صلاحیت حاصل کر لیں تو بھی کیا ہم غربت کو کم کر سکیں گے؟ اس بارے میں سوچنا ضروری ہے کیونکہ یہ امکان بھی موجود ہے کہ ان صنعتوں میں کام کرنے والے محنت کش بھوک کی بلا کو دور رکھنے کی خاطر محنت تو کرتے رہیں گے، مگر اس سے نجات نہ پا سکیں گے۔ ان میں سے اکثر اپنے خاندانوں کو آبائی دیہات میں چھوڑ کر شہروں کو مسکن بنائیں گے اور کچی بستیوں میں غیر انسانی حالات کے جبر کا شکار ہو جائیں گے۔

معاملہ یہ ہے کہ غربت کے خاتمے کی پالیسی روزگار کے مواقع کی فراہمی کی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور گہری ہونی چاہئے۔ اس پالیسی کا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ فرد کو اس کے مقدر کا مالک بنایا جائے۔ اس پالیسی کو لازماً سماجی، معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر محیط ہونا چاہئے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب کبھی ہم اپنی روز افزوں آبادی کو روزگار مہیا کرنے کے منصوبے بناتے ہیں تو لاشعوری طور پر ہماری توجہ مردوں پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کم از کم معاشی حوالہ سے عورتیں معاشرے کا غیر ضروری حصہ ہیں۔ وہ بے چاری غریب بھی ہوں تو پھر وہ کسی معاشی منظر میں نمایاں نہیں ہوتیں۔ سسرالی عزیزوں یا پھر اپنے آجروں کے ظلم و ستم سہنے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی گھریلو کام کاج ایسا نہیں جو وہ جانتی نہ ہوں یا کرتی نہ ہوں۔

گھریلو کام کاج کرتے ہوئے عورتیں جو مہارت حاصل کرتی ہیں۔ اس کو آسانی سے آمدنی کا وسیلہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ گھر میں پکائی جانے والی اشیا جیسے چائے، سموسے مٹھائیاں وغیرہ بازار میں آسانی سے بک سکتی ہیں۔ اس طرح سینے پرونے کی مہارت عورتوں

MashalBooks.org

کے لئے آمدنی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔عورتیں اور بھی بے شمار چھوٹی موٹی چیزیں گھروں میں بناتی ہیں جو بازار میں فروخت ہوسکتی ہیں۔ان میں ٹوکریاں، گڑیاں، کٹھ پتلیاں، چٹائیاں اور پنکھے وغیرہ شامل ہیں۔ وہ مرغیاں، بکریاں، گائیں اور دوسرے گھریلو جانور پال سکتی ہیں۔ جن دیہات میں ہم نے اپنا منصوبہ شروع کیا ہے وہاں آپ کو اکثر ایسی عورتیں ملیں گی جنہوں نے اپنے گھروں میں ہی پرچون یا سبزیوں کی دکانیں کھول لی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں پیداوار اور آمدنی بڑھانے کی کوششوں کے معاملے میں بالکل صفر ہوتی ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ہم نے اپنے تحقیقاتی مطالعے کے منصوبے کے تحت بہت سے مردوں اور عورتوں کے کوائف جمع کئے۔ تاہم اس کتاب میں صرف خواتین کو شامل کیا گیا ہیں۔خواتین کی طرف اس جھکاؤ کے کچھ اسباب ہیں۔ان سب سے ایک ہم بیان کر ہی چکے ہیں۔یعنی یہ کہ ہم لوگوں نے اس حقیقت کو فراموش کر رکھا ہے کہ خواتین ہماری قوت کا لازمی حصہ ہیں۔ چنانچہ ہم اس امر پر اصرار کرنا چاہتے تھے کہ خواتین ہماری افرادی قوت کا بہت ہی موثر جزو ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اپنے معاشرے کی حقیقت کو جاننے کی خاطر عورت کے تجربے سے گزرنا' اس کو جاننا اور محسوس کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم عورت کی نظر سے دیکھیں تو معاشرے کی ساری کج رویاں اور خرابیاں اجاگر ہو جاتی ہیں۔عورت اگر غریب ہوتو پھر سا کے تجربات کے حوالے سے ہم معاشرے کو اور بھی بہتر طریقے سے جان سکتے ہیں ۔ ہمارے معاشرے میں عورتیں اس قدر دبی ہوتی ہیں کہ وہ ہلکا سا احتجاج بھی نہیں کرسکتیں۔لہٰذا سماجی جوروستم کی تمام تدبیریں ان پر آزمائی جاتی ہیں۔غربت کی پیدا کردہ اذیتوں کے ساتھ ساتھ جب مرد کی بالا دستی والے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ جابرانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے تو پھر ان کی صورت حال نا قابل تصور حد تک غیر انسانی ہو جاتی ہے۔

ہماری غریب عورتوں کی اکثریت شوہروں کی ستم رسیدہ ہے۔شوہر ان کو مارتے پیٹتے ہیں' طلاق دیتے ہیں یا ویسے یہ چھوڑ جاتے ہیں۔ بے شمار عورتیں جہیز کے نظام کی لعنت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس حقیقت کو قبول ہی نہیں کرتا کہ یہ عورتیں بھی انسانی ہیں۔ مردوں کی بے رحم حاکمیت نے خود ان عورتوں کو بھی ذہنی طور پر اس قدر مفلوج کر دیا ہے کہ وہ

اپنے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کو نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ اس کو جائز سمجھنے لگتی ہیں۔

1975ء کی بات ہے کہ میں نے غریب عورتوں کے حالات جاننے کے لئے چٹا گانگ یونیورسٹی کے نواحی گاؤں جابرہ میں ایک سروے کیا تھا۔ اس سروے میں، دوسری باتوں کے علاوہ، ہمیں ان عورتوں کی آمدنی کے وسائل پیدا کرنے کی کم وبیش بے ثمر کوششوں کا بھی علم ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے معاشرے میں معاشی سرگرمیاں صرف مرد کا حق خیال کی جاتی ہیں۔ لہٰذا جو عورت اس ممنوعہ سلطنت میں قدم رکھتی، اس کی زندگی دوبھر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔

جابرہ میں چھوٹے موٹے تاجر دست کار عورتوں کی بنائی ہوئی اشیا ناقابل یقین حد تک سستی خریدنے ان کے دروازوں پر آتے اور عورتیں اپنی اشیا ان کو بیچنے پر مجبور ہوتیں کیونکہ انہوں نے اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ان تاجروں سے تھوڑی بہت رقم پیشگی لے رکھی تھی۔ ایسی ہی ایک عورت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سارا دن محنت کر کے ایک تپائی بناتی ہے اور اس کو دن بھر کی مشقت کا معاوضہ پچاس پیسے ملتا ہے۔

کوئی عورت دوسروں کے لئے سارا دن دھان صاف کر کے چاول تیار کرتی ہے تو اس کو آدھا سیر چاولوں اور بچے کچھ کھانے پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ خود دھان خرید کر یہی کام اپنے گھر میں کرے تو اس کی حالت بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اس طریقے سے وہ بیس روپے روزانہ تک کما سکتی ہے۔ ٹوٹا چاول اور چھلکے بھی بچ جاتے ہیں جو فروخت ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہے تو پھر دوسروں کے لئے یہ کام کرنے کی بجائے کوئی اپنے لئے کیوں نہیں کرتی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان غریب عورتوں کے پاس دھان خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرے کی کھڈی پر سارا دن کپڑا بن کر پچیس روپے اجرت پاتا ہے تو اپنی کھڈی پر اتنی ہی محنت کر کے آمدنی دگنی کر سکتا ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ اس کے پاس کھڈی اور دھاگہ خریدنے کے لئے چند سو روپے ہوں۔ یہ معمولی سی رقم ساہوکار سے قرض لی جائے تو اس قدر سود ادا کرنا پڑے گا کہ منافع کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ بنگلہ دیش میں ہر جگہ یہ ساہوکار دس فیصد ماہانہ سود کی شرح دس فی صد یومیہ بھی ہے!!

ان غریب لوگوں کو مالی سرمایہ مل جائے تو پھر وہ اپنی محنت کے ثمرات سے لطف

اندوز ہونے کا موقع بھی حاصل کر سکیں گے۔ اس وقت معاملہ یہ ہے کہ محنت و مشقت کرنے والی کثیر آبادی کے ثمرات پر ایک چھوٹے سے طبقے نے قبضہ جما رکھا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی گرفت میں سرمایہ ہے۔ موجودہ معاشی نظام اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ یہ طبقہ نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ دوسروں کا خون چوس چوس کر مزید طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ یوں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی محنت کے حاصلات سمیٹ کر اس طبقے کی امارت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری آبادی کے بڑے حصے کو اس نے عملی طور پر غلام بنا رکھا ہے۔

غریب لوگوں کو مالی سرمایہ کی سہولت مہیا کرنے کا چونکہ کوئی ادارہ جاتی نظام نہ تھا' لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر میں نے 1976ء میں' جابرہ گاؤں میں' گرامین بینک پراجیکٹ کے نام سے ایک کوشش کا آغاز کیا۔ بینکوں کا کام لین دین ہے۔ لیکن ہمارے بینکوں کو غریبوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف امیروں سے معاملات کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کے تمام قواعد وضوابط امیر لوگوں کو ذہن میں رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔ چنانچہ رائج الوقت بینکاری کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرض صرف سیکیورٹی کی اساس پر دیا جائے۔ دوسری طرف غریب لوگوں کے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جس کو وہ قرض لینے کی خاطر سیکیورٹی کے طور پر پیش کر سکیں۔ چنانچہ پہلے ہی وار میں ان کا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

بینکوں کے سارے معاملات تحریری ہوتے ہیں۔ دستاویزات تیار کروانے کی ساری ذمے داری گاہک پر ڈالی جاتی ہے۔ اب اگر ملک کے 80 فیصد عوام اَن پڑھ ہوں تو ہم آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ نظام کن لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ گویا ہمارا بینکاری کا سارا نظام یوں ترتیب دیا گیا ہے کہ ملک کی خواتین اس سے قطعی طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ اب اگر وہ بے چاری غریب اور اَن پڑھ بھی ہوں تو پھر وہ کسی بینک کی عمارت میں قدم رکھنے کی جرات بھی نہیں کر سکتیں۔

گرامین بنک پراجیکٹ کا آغاز روایتی بینکاری کے تمام مسلمہ ضابطوں کی جرات مندانہ خلاف ورزی کرتے ہوئے کیا گیا۔ اس کا مقصد سیکیورٹی یا ضمانت کی شرائط کے بغیر بنکاری کی سہولتیں غریبوں تک پہنچانا ہے۔ اس طرح وہ ساہوکاروں کے خوں خوار دانتوں سے خود کو محفوظ کر سکتے ہیں، بینک سے مدد لے کر اپنا پسندیدہ وسیلہ آمدنی بنا سکتے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے تنظیمی یونٹ ترتیب دے سکتے ہیں۔ بچت کی عادت کو فروغ دے سکتے ہیں اور یوں

مزید کام کے لئے مواقع تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس منصوبے کی رہنما پالیسی یہ ہے کہ غریبوں سے مراد محض غریب مرد نہیں بلکہ عورتیں بھی ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو خود بنک تک نہیں آتے بنک کو ان تک پہنچنا چاہیئے۔

گرامین بنک صرف بے زمین لوگوں سے معاملات کرتا ہے۔ جن خاندانوں کی قابل کاشت اراضی چوتھائی ایکڑ سے کم ہو ان کو بے زمین سمجھا جاتا ہے۔ گرامین بینک سے امداد لینے کے لئے ان لوگوں کو پانچ پانچ افراد کے گروپ بنانا پڑتے ہیں۔ چند گروپ (زیادہ سے زیادہ دس) مل کر پہلے سے طے شدہ مقام پر ہفتہ وار اجلاس کرتے ہیں۔ ہر گروپ کے پانچ ارکان میں سے ایک چیئر مین اور ایک سیکرٹری منتخب کیا جاتا ہے۔ جب کہ ہر سنٹر کا ایک سنٹر چیف، اور ایک ڈپٹی چیف ہوتا ہے جن کو شریک گروپوں کے ارکان میں سے چنا جاتا ہے۔ بینک میں ہر گروپ اپنا بچت فنڈ رکھتا ہے جس کو ''گروپ فنڈ'' کہا جاتا ہے۔ بینک سے لیا جانے والا ہر قرضہ ایک سال کے اندر ہفتہ وار قسطوں میں واپس کرنا ضروری ہے۔

جابرہ میں گرامین بنک پراجیکٹ کی کامیابی سے حوصلہ پا کر 1979ء میں یہ منصوبہ ضلع ٹنگائیل میں شروع کیا گیا۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیش بنک نے حوصلہ افزائی کی اور تمام بنکوں کی وساطت سے اس پر عمل کیا گیا۔ منصوبے کے تحت نومبر 1979ء میں ضلع ٹنگائیل کے بے زمین لوگوں کو قرضوں کا اجرا شروع ہوا۔ 1982ء میں اس ضلع میں گرامین بنک پراجیکٹ کے تین سال پورے ہو گئے۔ ان دنوں اس کے ارکان کی تعداد 28 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے سترہ ہزار مرد تھے اور گیارہ ہزار عورتیں۔ اس منصوبے کے تحت مجموعی طور پر ساڑھے آٹھ کروڑ بنگلہ دیشی روپے کے قرض دیئے گئے۔ اس رقم میں سے ساڑھے چھ کروڑ روپے پہلے ہی ہفتہ وار قسطوں کے ذریعے واپس ہو چکے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ قرضداروں میں نادہندگان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد ایک فی صد سے بھی کم ہے۔ دوسری طرف گرامین بنک پراجیکٹ کے بے زمین ارکان کی مجموعی بچت دسمبر 1982ء میں ایک کروڑ روپے تک پہنچ چکی تھی۔

یہ تو 1982ء کی بات ہے جب کہ یہ کتاب مرتب کی گئی تھی۔ اس کے بعد گرامین بنک پراجیکٹ نے قابل رشک ترقی کی ہے۔ اس کا دائرہ صرف جابرہ گاؤں یا ضلع ٹنگائیل تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے بنگلہ دیش تک پھیلا دیا گیا ہے۔ یوں پورے ملک میں لاکھوں

MashalBooks.org

غریب اور نادار عورتیں اور مرد اس منصوبے کی مدد سے اپنی زندگیاں بہتر بنا رہے ہیں اور معاشرے کے فعال رکن بن رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اس منصوبے کو سراہا گیا ہے۔ اس پر مضامین مقالات اور کتابیں لکھی گئیں ہیں اور اس کو تیسری دنیا میں غربت کے خلاف جنگ کا موثر آلہ کار قرار دیا گیا ہے۔ اس کی مثال سے تحریک حاصل کر کے دنیا کے کئی ملکوں میں ایسے ہی منصوبے شروع کئے گئے ہیں۔ ایسا صرف ترقی پذیر ملکوں میں نہیں ہوا' بلکہ ترقی یافتہ ملکوں نے بھی اس مثال پر عمل کیا ہے۔

بنگلہ دیش میں گرامین بنک پراجیکٹ کے قرضوں سے غریب عورتیں اور مرد اپنی آمدنی کے وسائل پیدا کر رہے ہیں۔ تاہم عورتوں کے معاملے میں چند خصوصی باتیں قابل ذکر ہیں۔ جب کوئی عورت کمانے لگتی ہے تو عموماً دو نتائج سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ سب سے پہلے اس آمدنی سے اس عورت کے بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑے ملنے لگتے ہیں۔ تعلیم کے دروازے ان پر کھل جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ پورا خاندان آمدنی سے بالآخر فائدہ اٹھانے لگتا ہے۔ کیونکہ آمدنی کا وسیلہ ہاتھ آنے سے عورت گھر بار کی حالت بہتر بنانے پر توجہ دینے لگتی ہے۔

ایک بار ایک عورت نے بڑے فخر کے ساتھ انٹرویو لینے والے کو اپنی جھونپڑی میں ایک چار پائی دکھائی جس پر اس کا تین سالہ بچہ محو خواب تھا۔ اس عورت کو زندگی میں پہلی بار ایک چار پائی نصیب ہوئی تھی! آیئے ہم آپ کو مختصراً بتائیں کہ اس کتاب میں شامل ہونے والی کہانیاں کس طرح جمع کی گئی تھیں۔

ہم نے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں سے حال ہی میں فارغ ہونے والے طالب علموں کی تحقیقی معاونین کے طور پر خدمات حاصل کیں۔ اس وقت منصوبے کے تحت حاصل ہونے والے مواد کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا۔ خیر' ان نوجوانوں کو معمولی تربیت دے کر کوائف حاصل کرنے کے لئے ٹنگائیل اور چٹاگانگ کے مختلف مقامات پر بھیج دیا گیا۔ یہ تو ہم نے ان نوجوانوں کو بتایا تھا کہ لوگوں کی داستانیں کیسے اکٹھی کرنی چاہئیں' تاہم اس سلسلے میں کوئی بے لچک اور طے شدہ اصول ان پر نہیں ٹھونسے تھے۔ ان کو صورت حال کے مطابق اپنا مقصد حاصل کرنے کی آزادی دی گئی تھی۔

MashalBooks.org

ان لوگوں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تقریباً سبھی تحقیقی معاون نوجوان تھے اور ان کا تعلق بھی ضلع ٹنگا ئیل سے نہ تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی دیہاتی بولیوں کو سمجھنا اور زیر مطالعہ عورتوں کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم کرنا ان کے لئے خاصا مشکل تھا۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس سارے تحقیقی منصوبے کا سب سے دشوار مرحلہ ایسا ماحول تخلیق کرنا تھا جس میں کوئی غریب دیہاتی عورت شہر سے آنے والے اجنبی نوجوان پر اس قدر اعتماد کرے کہ اس کو اپنی زندگی کے حقائق بتانے لگ جائے۔

تحقیقی معاونین بار بار ان عورتوں کے گھر جاتے اور ان کو اپنے بارے میں مفصل گفتگو پر آمادہ کرتے۔ کبھی ان کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں اور کبھی وہ ناکام رہتے۔ جس روز کوئی تحقیقی معاون اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور متعلقہ عورت اپنی داستان سنا دیتی تو وہ اسی گاؤں میں اپنے عارضی ٹھکانے پر واپس آ کر ساری باتیں کاغذ پر لکھ لیتا۔ کبھی کبھی عورتوں کے بیانات میں متضاد باتیں آ جاتیں یا پھر تاریخیں اور واقعات الٹ پلٹ جاتے۔ چنانچہ بعد کی ملاقاتوں میں تحقیقی معاونین ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔

ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد تحقیقی معاونین ڈھاکہ واپس آ گئے۔ اور انہوں نے اپنا مواد ریسرچ ڈائریکٹر کے سپرد کر دیا۔ بعدازاں ریسرچ ڈائریکٹر کی نگرانی میں بڑی احتیاط کے ساتھ ان ساری معلومات کی چھان بین کی گئی اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی۔ چنانچہ تحقیقی معاونین دوبارہ ان عورتوں کے پاس گئے اور متعلقہ معلومات حاصل کر کے ان خامیوں کو دور کیا۔ زیر نظر کتاب کا اکثر مواد جون سے اگست 1981ء کے دوران میں حاصل کیا گیا تھا جب کہ ٹنگا ئیل میں گرامین بنک پراجیکٹ اپنے دوسرے برس کے وسط میں تھا۔ اس کتاب میں ہم نے افراد کے نام، ان کی نجی زندگی کے تحفظ کی خاطر، بدل دیئے ہیں۔ البتہ مقامات کے نام حقیقی ہیں۔

بنیادی طور پر یہ کہانیاں سرگزشت کے ذیل میں آتی ہیں چنانچہ ان میں جو تبصرے اور آرا ملتی ہیں، ان کی ذمہ داری مصنفین کے بجائے خود ان کہانیوں کے کرداروں پر آتی ہے۔ ہر کہانی بیان کنندہ کے نقطہ نظر سے پیش کی گئی ہے۔ گویا کتاب میں شامل ہر عورت کی زندگی کے حالات وحقائق اسی طرح پیش کئے گئے ہیں جس طرح کہ وہ ان کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی زندگی میں آنے والے دوسرے افراد اس سے اختلاف کر سکتے ہیں

اور وہ واقعات کو مختلف نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔

ان عورتوں کے کوائف کی فراہمی اور بعدازاں کتابی صورت میں ان کی اشاعت یونیسف یک طرف سے بنگلہ دیش کی ایک گرانٹ کی مرہون منت ہے۔ اس کے لئے ہم بنگلہ دیش میں یونیسف کے نمائندہ' جناب اے فے کونگ اور یونیسف کے عورتوں کے ترقیاتی پروگرام کے سربراہ' بیگم جوشن آرا رحمان' کے شکرگزار ہیں۔ بیگم رحمان ہمارا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ اس کے بغیر شاید یہ کتاب کبھی منظر عام پر نہ آتی۔ میں ان کی طرف سے مسلسل حوصلہ افزائی کے لئے بہت ممنون ہوں۔

مجھے ان تحقیقی معاونین کا شکر یہ بھی ادا کرنا ہے جنہوں نے نامساعد حالات میں محنت کر کے ان خواتین تک رسائی حاصل کی اور ان کے کوائف حاصل کئے۔ البتہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ گنجائش کی کمی کے سبب ہم اس کتاب میں کئی اور کہانیاں شامل نہیں کر سکے ہیں۔ کتاب کی تدوین کے کام میں مجھے جناب ایم جہانگیر' محترمہ نور جہاں بیگم اور جناب عبدالکریم کی مدد حاصل رہی۔ پروفیسر ایچ آئی لطیفی اور دیپال چندرا پورا صاحب نے تحقیقی معاونین کی تربیت کے مشکل کام میں مدد دی اور اس امر کو یقینی بنایا کہ وہ قابل اعتماد معلومات جمع کریں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب میں شامل عورتوں کی کہانیاں اس ملک کی تمام غریب خواتین کی زندگیاں بدلنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

ڈھاکہ — محمد یونس

16 دسمبر 1982ء — ریسرچ ڈائریکٹر

بیل ٹال کی زرینہ

مرزا پور تھانے ضلع ٹنگائیل میں واقع ہے۔ ازگانہ یونین کا علاقہ اسی تھانے کی حدود میں شامل ہے۔ اس یونین کے دیہات میں سے ایک کا نام بیل ٹال ہے۔ ہم یہاں جس زرینہ کی کہانی آپ کو سنانے والے ہیں' وہ اسی گاؤں کے ایک کونے میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا گھر دو کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک کی چھت ہے اور دوسرا چھت سے محروم ہے۔ بغیر چھت کا یہ چھپر ذرا سی بارش سے تالاب بن جاتا ہے۔

زرینہ نے یہ چھپر اپنی گائے کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ گائے اس نے گرامین بنک سے قرضہ لے کر خریدی ہے۔ دوسرا کمرہ حال ہی میں تعمیر کروایا گیا ہے۔ کچی دیواروں کا یہ کمرہ تقریباً ۲۲ فٹ لمبا ہے۔ پٹ سن کی ڈنڈیوں اور بھوسے سے اس کی چھت بنی ہوئی ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں۔ وہاں اندھیرا ہی چھایا رہتا ہے۔

کمرے میں فرنیچر کا کوئی نام و نشان نہیں۔ ایک کونے میں دو تین بوسیدہ چارپائیاں ہیں اور کھجور کی چٹائی پر چند میلے کچیلے تکیے۔ پاس ہی ایک بوری ہے جس میں تقریباً ایک من دھان ہے۔ اس کے ساتھ دیوار پر ایک پھٹی پرانی قمیض، ایک لنگی اور بچوں کے چند پرانے کپڑے لٹک رہے ہیں۔ پٹ سن کے چند تھیلے بھی دیواروں سے لٹک رہے ہیں۔ ان میں بوتلیں اور مٹی کے برتن بھرے ہوئے ہیں۔

کمرے کے دوسرے کونے میں گھریلو استعمال کے چند برتن دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں مٹی کی ایک صراحی' ایلومینیم کا ایک جگ' ایک تھالی' ایلومینیم کے گلاس اور مٹی کے تین دوسرے برتن شامل ہیں۔ ان کے دائیں جانب چولہا ہے۔ اور ٹوکری میں جلانے کی تھوڑی سی لکڑیاں۔ ان کے اوپر کھجور کے پتے اور ان پتوں کی بنی ہوئی ادھوری چٹائی رکھی ہوئی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہی کچھ زرینہ کی کل کائنات ہے!

بچپن ہی سے زرینہ کا واسطہ دکھوں اور محرومیوں سے رہا ہے۔ زندگی میں خوشی کا

MashalBooks.org

ایک پل بھی اس کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کا باپ ناجو شیخ، ایک غریب مزدور تھا۔ البتہ اس کا والد اس قدر بدنصیب نہیں تھا۔ ناجو شیخ کے والد کا نام عمر شیخ تھا۔ وہ اس گاؤں سے تقریباً دو میل دور اسی یونین کے گاؤں کری پارہ کا رہنے والا تھا۔ عمر شیخ کی سات ایکڑ زمین ہوا کرتی تھی۔ وہ زمین اب زرینہ کے دو چچاؤں کے قبضے میں ہے اور وہ مزے سے اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔

ناجو شیخ اصل میں من موجی شخص تھا۔ وہ اپنی دھن میں مست رہتا۔ وہ خاندانی ذمے داریوں سے بے نیاز تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں اس نے آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔ اپنی موج میں ایک روز وہ گھر سے تقریباً پانچ میل دور مرزا پور کے گاؤں دھوتہ جا پہنچا۔ وہاں اس نے گھر والوں کو بتائے بغیر ایک لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ عمر شیخ تک یہ اطلاع پہنچی تو وہ غصے سے لال پیلا ہوا اور گستاخ مگر من موجی بیٹے کو عاق کر دیا۔ یوں ناجو وراثت سے محروم رہ گیا۔ باپ کی ساری زمین اور دوسری جائیداد بھائیوں کے ہاتھ لگ گئی۔

یہ ناجو شیخ کی تکلیف دہ زندگی کا آغاز تھا۔ اس کی مصیبتیں اور محرومیاں بڑھتی گئیں اور آخر کار انہوں نے ناجو شیخ کو نڈھال کر دیا۔ خود پر اس کو قابو نہ رہا۔ ایک روز اس نے بیوی کو طلاق دی اور پولاش ٹالی گاؤں کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک اور شادی کی اور محکمہ جنگلات کے محفوظ علاقے میں جھونپڑی ڈال کر رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہاں اس کی جڑیں بن گئیں۔ اس کی دوسری بیوی نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو جنم دیا۔ زرینہ وہی بیٹی ہے۔ وہ 1952ء کے لگ بھگ پیدا ہوئی تھی۔

بچپن ہی سے زرینہ سخت زندگی گزارتی رہی ہے۔ جن دنوں اس کی ہم عمر لڑکیاں گڑیوں سے دل بہلاتیں، ریت کے گھروندے بناتیں یا آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھیں، تو زرینہ کھیتوں میں بکریاں چرایا کرتی تھی۔ وہ دھان کا بھوسہ اتارنے میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور دوسرے کام کاج بھی کرتی۔ بدلے میں اس کو کھانا ملتا جو کبھی بھی اس کی ضرورت کے مطابق نہ ہوتا تھا۔ اچھے، صاف ستھرے کپڑے کبھی اس کو پہننے کے لئے نہ ملے۔ بچپن کی کوئی تمنا پوری نہ ہوئی۔ اس کے پاس تو دو چار عام سی بلوری چوڑیاں بھی نہ تھیں۔ ماضی کے ان ماہ و سال کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔

خیر، بچپن میں زرینہ کو صحت کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ البتہ چھ سال کی عمر میں اس

MashalBooks.org

پر جلد کی بیماری کا شدید حملہ ہوا تھا۔ اس کا پورا بدن اس قدر متاثر ہوا کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکتی تھی۔ مفلس باپ علاج کی خاطر اس کو مختلف جگہوں پر لے جاتا رہا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار کری پارہ کے حکیم، منٹوڈاکٹر نے اس کو بیماری سے نجات دلائی۔ باپ اس کو کندھے پر اٹھا کر ڈاکٹر کے گھر تک لے جایا کرتا تھا۔ تقریباً چار ماہ بعد وہ تندرست ہوئی۔ تاہم اس کو خوفناک بیماری کے نشان ابھی تک زرینہ کے بدن پر موجود ہیں۔

میں زرینہ سے ملنے گیا تو اس نے اپنی زندگی کی داستان سنائی۔ کہنے لگی کہ بچپن میں اس کی عیدیں گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی عیدوں جیسی نہ ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ اس کا باپ بے حد غریب تھا، اس لئے عید یا کسی اور تہوار پر بھی اس کے خاندان کو اچھا کھانا نصیب نہ ہوتا تھا۔ نئے کپڑوں کا تو خیر سوال ہی نہ تھا۔ کوئی نیک دل ہمسایہ اچھی شئے کھانے کو دے دیتا تو اور بات تھی۔ زرینہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ اس نے ایسی عیدیں بھی گزاری ہیں جب کھانے کو کچھ بھی نہ ملتا تھا۔ تاہم اکثر عیدوں پر ان لوگوں کو خیرات مل جایا کرتی تھی۔ یہ بدحالی اس کے والدین کے لئے مسلسل پریشانی کا باعث تھی۔ جب روٹی کے لالے پڑے ہوں تو پھر بیٹی کے ہاتھ کیونکر پیلے ہو سکتے تھے۔ بہرطور زرینہ جب سات آٹھ سال کی ہوئی، تو والدین نے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ دس برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی۔

یوں زرینہ کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ 1962ء میں دس سالہ زرینہ بائیس سالہ رستم خان سے بیاہی گئی تھی۔ رستم خان کا تعلق بیل ٹال گاؤں سے ہے۔ رستم کی شادی سے پہلے ہی اس کا باپ خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ اس کی ماں دربدر بھیک مانگا کرتی تھیں اور راتیں کسی چھپر میں گزارتی۔ اس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ شادی کے وقت رستم پولاس ٹالی نامی گاؤں میں بھکوشکدار کے گھر میں ملازم تھا۔ بھکوشک دار اس گاؤں کا سب سے امیر اور با اثر شخص تھا۔ وہ تقریباً نو ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ رستم کو وہ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ دیتا۔ کھانا اور رہائش بھی اسی کے ذمے تھی۔ اصل میں بھکوشک دار ہی نے ایک سال کی تنخواہ کے عوض زرینہ سے رستم کی شادی کروائی تھی۔ شادی کے سارے اخراجات بھکوشک دار نے برداشت کئے اور زرینہ کے باپ کو کوئی جہیز نہ دینا پڑا تھا۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بھکوشک دار کی حویلی میں رہنے لگے۔

ایک بڑے بھائی اور ماں کے سوا رستم خان کا اس دنیا میں کوئی رشتے دار نہ تھا۔ وہ اپنے مالک کے باڑے میں رہتا تھا جہاں اس نے اپنے لئے ایک جھونپڑی ڈال رکھی تھی۔ زرینہ کو اپنے شوہر کے بھائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کبھی کبھار ہی ان کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح ساس کے ساتھ بھی اس کا میل ملاپ بہت کم تھا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، وہ بوڑھی عورت بھیک مانگ کر گزارہ کرتی اور اپنے انداز میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار ہی زرینہ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ پھر زرینہ کی شادی کے تقریباً ایک سال بعد وہ مرگئی۔

کبھی کبھی زرینہ چند دنوں کے لئے میکے جایا کرتی تھی۔ یہ دس سالہ دلہن دل میں خوف اور آنکھوں میں سنہری سپنے لئے نئے گھر آئی تھی۔ لیکن چند ہی دنوں میں اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ مجھ سے وہ کہنے لگی ''باپ کے گھر میں میری کوئی تمنا پوری نہ ہوئی تھی، شوہر کے گھر میں بھی بس یہی کیفیت رہی''۔

میاں بیوی دونوں گویا بھکو شکدار کے زرخرید غلام تھے۔ رستم کھیتوں میں محنت کرتا اور مالک کے گھر کے کام کاج بھی اسی کے ذمے تھے۔ زرینہ مالک کے گھر میں جھاڑو دیتی، برتن مانجھتی اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ بدلے میں اس کو دو وقت کا کھانا مل جاتا۔ رستم خان بھی صبح سے شام تک مالک کی خدمت میں مصروف رہتا۔ اسی طرح شادی کے پہلے دو سال بیت گئے۔

اسی اثنا میں زرینہ کا باپ فوت ہو گیا۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی بچے تھے۔ یوں اس کی ماں کے لئے بہت ہی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جنگل میں کس طرح رہ سکتی تھی؟ چنانچہ اس نے داماد کو اپنے پاس بلا لیا۔ رستم کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور بیوی کو لے کر ساس کے ہاں منتقل ہو گیا۔ تاہم اس نے پہلے جیسا کام جاری رکھا۔ اب اس کو رمضان شکدار نے نوکر رکھ لیا تھا جو پولاش ٹالی میں رہتا تھا۔ تین وقت کے کھانے کے علاوہ تیس روپے ماہوار اس کی تنخواہ طے ہوئی۔ زرینہ بھی بے کار نہ رہی۔ وہ ماں کے ساتھ ہمسایوں کا دھان صاف کرنے کا کام کرنے لگی۔ یوں اس کے شوہر کا خرچ کم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے چھ ماں میں تقریباً سوا سو روپے بچا لئے۔ اس رقم سے انہوں نے محکمہ جنگلات سے زمین کا وہ ٹکڑا اپٹے پر لے لیا

جس پر وہ رہتے تھے۔

وہیں زرینہ نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو جنم دیا۔ سب سے بڑا بیٹا' رحیم خان' 1967ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد بیٹی مہرالنساخاتون 1970ء میں پیدا ہوئی جب کہ سب سے چھوٹے بیٹے نذرالاسلام خان کی پیدائش 1974ء میں ہوئی۔ تینوں بچوں کے حمل کے ایام میں زرینہ ایک خاص بیماری کا شکار رہی۔ حمل کے پانچویں مہینے سے اس کے سارے جسم میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ کسی دوا سے اس درد کا علاج نہ ہو سکا اس بیماری کے باوجود زرینہ گھر کا کام کاج کرتی رہتی۔ بچوں کے پیدائش سے پہلے یا بعد میں اس کو شاید ہی پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا۔ روٹی اس کے لئے زندگی بھر کا مسئلہ رہی۔ چنانچہ زرینہ نے بتایا کہ ''اچھ کھانے کا تو خیر ذکر ہی کیا' مجھے تو پیٹ بھر کر کھانا بھی کبھی کبھار نصیب ہوتا تھا۔ کبھی کبھی فاقوں تک نوبت پہنچتی تھی''۔

آخری حمل کے دنوں میں کھانے کا مسئلہ اور بھی سنگین ہو گیا۔ وہ 1974ء کے قحط کا سال تھا۔ اس خاندان کے مصائب بہت بڑھ گئے تھے۔ حکومت نے اس علاقے میں امدادی مراکز قائم کئے تھے' مگر دیہاتیوں نے ان کے بارے میں کئی افواہیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس لئے زرینہ اور اس کے خاندان نے ڈر کے مارے کسی سرکاری امدادی مرکز سے رجوع نہ کیا۔ دوسری طرف چاول خرید کر پیٹ بھرنا ان کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔ قحط کے سبب چاولوں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی اور وہ غریب لوگوں کی رسائی سے نکل چکی تھی۔ ان حالات سے زرینہ کا کنبہ آٹے کے دلیئے پر گزارا کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زرینہ کی چھاتیاں خشک ہو گئیں اور اس کے شیر خوار بچے کی صحت بگڑنے لگی۔ بچے کے لئے کوئی اور خوراک خریدنے کے وسائل نہ تھے۔ یوں 1974ء کا سال ماں اور بچے نے نیم فاقہ کشی کے عالم میں بسر کیا۔

بنگلہ دیش کے قیام کا سال 1971ء بھی اکثر دوسرے برسوں کی طرح افلاس اور محرومی کا سال تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ سے یہ خاندان زیادہ متاثر نہ ہوا تھا۔ گولیاں چلنے کی آواز ان کو اکثر سنائی دیتی تھی۔ نیا پارہ اور قصبے میں گھروں کے نذرآتش کئے جانے کی خبریں بھی وہ سنا کرتے تھے۔ ایک بار فوج کی آمد کے خطرے کے پیش نظر زرینہ نے دھان سے بھرا ہوا ایک برتن زمین میں دبا دیا تھا۔ تین روز بعد برتن نکالا گیا تو سارا دھان خراب

ہو چکا تھا۔

1980ء میں سیلاب نے آ گھیرا۔ زرینہ کا گھر پانی کی زد میں آ گیا اور ان لوگوں نے مجبوراً پڑوس کے گھر میں پناہ لی۔ اسی طور زرینہ کی مصیبتیں بڑھتی چلی گئیں۔ وہ پڑوسیوں کا دھان صاف کرنے کا کام کیا کرتی تھی جب کہ رستم خان دریائی گودی میں مزدوری کرتا تھا۔ زرینہ کو ایک من دھان صاف کرنے پر ایک سیر چاول ملا کرتے تھے جب کہ اس کا شوہر آٹھ دس روپے یومیہ اجرت حاصل کرتا تھا۔ مگر کام بلاناغہ نہ ہوتا تھا۔ زرینہ کو مہینے میں پندرہ بیس دن سے زیادہ کام نہ ملتا تھا اور بسا اوقات رستم خالی ہاتھ واپس آ جاتا تھا۔ رستم خان کی اوسط ماہوار آمدنی دو سو روپے کے لگ بھگ تھی۔ جب میں زرینہ سے ملنے گیا تو اس نے گزشتہ ماہ کی آمدنی اور خرچ کی تفصیل مجھے بتائی' جو حسب ذیل ہے۔

ماہانہ آمدنی

18 سیر چالوں کی فروخت سے آمدنی	108روپے
رستم خان کی آمدنی	200روپے
کل رقم	308روپے

ماہانہ اخراجات

60سیر چاول	360روپے
خوردنی تیل' نمک وغیرہ	50روپے
کل خرچ	410روپے

اب چونکہ اس خاندان کے اخراجات آمدنی سے زیادہ تھے' لہٰذا اس کو مہینے میں چند روز نیم فاقہ یا مکمل فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ خاص طور پر جن دنوں زرینہ کو کام نہیں ملتا تھا' تو ان لوگوں کی حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ فاقوں سے بچنے کے لئے زرینہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چنتی اور سیر آدھے سیر آٹے کے عوض ہمسایوں کے پاس فروخت کر دیتی۔ پھر وہ یہ آٹا پانی میں ابال کر دلیہ سا بناتی اور اپنے بھوکے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھاتی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زرینہ گاؤں کے ان بزرگوں کا ہمیشہ احترام کرتی جن کو معاشرے کا چوہدری سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ان لوگوں نے کبھی زرینہ کی مالی مدد نہ کی۔ البتہ وہ

MashalBooks.org

اکثر منہ سے ہمدردی جتایا کرتے تھے۔ پھر بھی زرینہ کو ان سے کوئی گلہ نہ تھا۔ مجھ سے وہ کہنے لگی کہ ''مصیبت کے وقت اپنے بہن بھائی بھی کام نہیں آتے تو پھر آپ گاؤں کے بزرگوں سے مدد کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟''

1975ء کی بات ہے کہ زرینہ کے شوہر نے لکڑی کا چھوٹے پیمانے کا کاروبار شروع کیا۔ اس سلسلے میں اس نے پولاش ٹالی کے رفیق شکدار سے سو روپے ماہانہ سود کے شرح پر ایک ہزار روپے ادھار لئے تھے۔ مگر اس کام سے سے زیادہ منافع نہ ہوا اور تین ماہ کا سود ادا کرنے کے بعد رستم بے چارے کو بارہ سو روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ مجبور ہو کر اس نے سرمائے میں سے آٹھ سو روپے رفیق شکدار کو ادا کر دیئے۔ باقی جو دو سو روپے رہ گئے' ان پر سود کے لئے رفیق شکدار نے اصرار نہ کیا۔ رستم نے بعد ازاں یہ رقم بھی واپس کر دی۔ زرینہ نے مجھے بتایا کہ اس قسم کی ہوشربا شرح پر سود کا کاروبار اب بھی اس کے گاؤں میں جاری ہے۔ ایک ہزار روپے کے قرض پر پچاس کے حساب سے سود ادا کرنا پڑتا ہے اور دس روپے مہینہ سود دو سو روپے کے قرض کا بنتا ہے۔ خیر' گرامین بنک کا کام شروع ہونے کے باعث یہ شرمناک کاروبار خاصی حد تک کم ہو چکا ہے۔

زرینہ کا شوہر بڑے تیز مزاج کا آدمی ہے۔ زرینہ کہتی ہے کہ وہ صرف نام کا خان نہیں بلکہ اس کا برتاؤ بھی پٹھانوں جیسا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ بیوی کو زدوکوب کرتا اور طلاق کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو رستم کی مار پیٹ سے زرینہ کا بدن سوج جاتا اور خون بہنے لگتا۔ پھر بھی بچوں کی خاطر وہ یہ سب کچھ خاموشی سے سہتی رہی اور خدا سے اچھے دنوں کی دعائیں مانگتی رہتی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی جدوجہد بھی جاری رکھی اور آخر کار اس کے خاندان کے دن بدل گئے ہیں۔

زرینہ کے خاندان نے پولاش ٹالی کے علاقہ میں محکمہ جنگلات سے 24 بیگھے زمین پٹے پر لی۔ پٹے پر زمین لینے سے اس کی مستقل ملکیت حاصل نہیں ہوتی' تاہم بہت سے غریب لوگ اس قسم کی زمین پر عارضی جھونپڑیاں بنا لیتے ہیں۔ محکمہ جنگلات کا محکمہ معمولی رقم کے بدلے غیر آباد جگہ ان لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ البتہ جب کبھی محکمے کو ضرورت پڑتی ہے تو وہ اپنی زمین واپس لے لیتا ہے۔ چنانچہ زرینہ اور اس کے شوہر نے محکمہ کے عبدالحق نامی ایک اہل کار کو 125 روپے دے کر چوبیس بیگھے کے ٹکڑے کا قبضہ حاصل کیا' جس پر وہ

MashalBooks.org

پہلے ہی سے رہ رہے تھے۔ وہاں وہ آٹھ سال تک رہے۔ اس زمین پر انہوں نے آم اور کٹھل کے پیڑ لگائے۔ بعدازاں انہوں نے ایک ہزار روپیہ لے کر یہ پیڑ اور زمین زرینہ کے بھائیوں کے سپرد کر دی۔

ایک ہزار روپے ہاتھ آئے تو زرینہ نے بیل ٹال گاؤں میں آٹھ سو روپے کی آٹھ بیگھہ زمین خرید لی اور باقی رقم وہاں ایک جھونپڑی ڈالنے پر خرچ کر دی۔ یہاں بھی اس نے جدوجہد جاری رکھی۔ آرزو اس کی یہ تھی کہ بچے فاقوں سے بچ جائیں اور ان کے چہروں پر خوشی کی کوئی چمک آ جائے۔ یہ اس کا آدرش تھا اور اسے حاصل کرنے کے لئے وہ تگ ودو میں لگی رہتی تھی۔ وہ سوچتی کہ کاش تھوڑی سی رقم اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اپنا کوئی کام شروع کر دے۔

آخر ایک روز خوش بختی نے اس کے دروازے پر دستک دے دی۔

ہاتھ بانگا کے مقام پر گرامین بنک کی ایک برانچ انہی دنوں قائم ہوئی۔ حلیم صاحب اس کے فیلڈ مینجر تھے۔ وہ علاقے کے غریب لوگوں کو بنک کے پراجیکٹ سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ زرینہ حلیم صاحب کی نظروں سے بچ کر ان کی باتیں سنا کرتی، مگر قریب جا کر ان سے گفتگو کرنے کا حوصلہ اس میں نہ تھا۔ پھر ایک روز اس نے حجاب اور خدشوں کو جھٹکا اور حلیم صاحب کے پاس چلی گئی۔ حلیم صاحب نے اس کو پراجیکٹ کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور اصول وضوابط بھی بتائے۔ بنک سے قرضہ لینے کی خاطر چونکہ پانچ عورتوں کا گروپ بنانا ضروری تھا۔ لہٰذا اس ملاقات کے بعد زرینہ نے گروپ سازی کا عمل شروع کر دیا۔ دسمبر 1979ء میں وہ گرامین بنک پراجیکٹ کی رجسٹرڈ ممبر بن گئی اور جنوری 1980ء میں اس کے گروپ کو چھ سو روپے کا اولین قرضہ مل گیا۔

گروپ بنانے میں زرینہ کو خاصی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ بیل ٹال میں اس وقت تک کوئی گروپ نہ بنا تھا۔ لوگ اس بارے میں بے خبر تھے اور بنک کے متعلق ان کے دل میں کئی خدشے اور وسوسے بھی تھے۔ زرینہ نے اپنے گروپ میں پہلے چمپا، بانو، شفیعہ، پوریچا اور سلیمہ کو شامل کیا تھا۔ لیکن سلیمہ اور پوریچا لوگوں کی باتوں میں آ کر سہم گئیں اور گروپ سے نکل گئیں۔ اس پر زرینہ نے کومالا خاتون اور حمیدہ بیگم کو ساتھ لے کر نیا گروپ بنایا۔ ان تمام عورتوں کو گرامین بنک کے طریقہ کار کے بارے میں سات روز تک تربیت دی

گئی۔ بعدازاں بنک نے ان کے گروپ کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا اور ان عورتوں کو رکن کے طور پر رجسٹر کر لیا۔

گروپ بنانے سے پہلے زرینہ نے اس موضوع پر اپنے شوہر' گاؤں کے بزرگوں اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں سے تین ہفتے تک مفصل تبادلہ خیال کیا تھا۔ ان میں سے کئی لوگوں کی رائے مخالفانہ تھی اور وہ بنک پراجیکٹ کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھتے تھے' لیکن زرینہ اپنے ارادے پر پکی رہی۔ وہ ساتھی عورتوں کا حوصلہ بھی بڑھاتی رہی۔ گروپ بنانے کے لئے وہ اور چمپا بانو سب سے زیادہ کوششیں کر رہی تھیں۔ چنانچہ جب گروپ بن گیا جو چمپا بانو اس کی صدر اور زرینہ سیکرٹری بنا دی گئیں۔ ان دونوں کو قرضہ بھی دوسروں سے پہلے ملا۔ بعد میں کوماں اور شفیعہ کو اور آخر میں حمیدہ خاتون کو قرضہ ملا۔

پہلی بار زرینہ نے صرف چھ سو روپے کے قرضے کی درخواست دی تھی۔ چند دنوں میں اس کو یہ رقم مل گئی۔ اس نے بیس روپے کا دھان صاف کرنے والی لکڑی کا پیڈل خریدا اور دھان سے بھوسہ اتار کر چاول بنانے کا کام زور شور سے شروع کر دیا۔ ہر بدھ کے روز اس کا شوہر ھاتو بانگا بازار سے چار من دھان لا دیتا۔ زرینہ اور اس کا بڑا بیٹا جنگل سے ایندھن اور بانس کی جڑیں اکٹھی کر کے لاتے اور پھر اپنا کام شروع کر دیتے۔ دھان صاف کرنے کے بعد چاول بازار میں فروخت کر دیئے جاتے۔ چاولوں کے بیوپاری چاول لینے کے لئے ان کے گھر بھی آنے لگے۔ جو چاول بچ جاتے' رستم خان ان کو آئندہ بدھ کے روز ھاتو بانگا جاتے ہوئے ساتھ لے جاتا اور وہیں بازار میں بیچ دیتا۔

اَن تھک محنت اور لگن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خاندان کی آمدنی پہلی بار اخراجات سے بڑھ گئی۔ زرینہ نے جو تفصیل بتائی' اس کے مطابق بنک سے قرضہ حاصل کرنے کے فوراً بعد اس خاندان کی ماہوار آمدنی اس قدر ہو گئی کہ بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ وہ اسی لگن سے کام کرتی رہی اور صرف ایک سال کے عرصے میں ہفتہ وار قسطوں کے ذریعے اس نے بنک کا سارا قرض واپس کر دیا۔ اب اس کو روز کی دال روٹی کی فکر نہ رہی تھی۔ اس کے بچے بھوکے نہ رہتے تھے۔ کچھ نہ کچھ ان کو کھانے کے لئے ملنے لگا تھا۔ ایک سال کی محنت کے نتیجے میں زرینہ نے قرض واپس کرنے کے علاوہ سب بچوں کے لئے کپڑے خریدے۔ پھر بھی اس کے پاس آٹھ سو روپے بچ گئے۔

MashalBooks.org

زرینہ نے اپنی تمام قسطیں باقاعدگی سے ادا کیں، تاہم بنک کے قواعد وضوابط کے بارے میں اس کے ذہن زیادہ واضح نہیں ہے۔ سات روزہ تربیت کے دوران جو کچھ اس کو بتایا گیا تھا، وہ اس کو بھول چکی ہے۔ تاہم یہ بات اس کو بخوبی یاد ہے کہ بنک سے سو روپے قرض لئے جائیں تو پانچ روپے وہاں جمع کروانے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ قسطیں باقاعدگی سے ادا کرنی چاہیں۔

زرینہ نے جب گروپ بنایا تھا تو پہلے پہل اس کا شوہر بہت پریشان رہا۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے لوگ اس کے دل میں کئی وہم پیدا کر رہے تھے۔ مگر جب زرینہ نے پہلا قرض واپس کر دیا تو اس کا سارا خوف جاتا رہا۔ میاں بیوی دونوں میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ رستم خان کو اب یقین ہو گیا کہ وہ دونوں اس بنک سے ملنے والا قرضہ آسانی سے واپس کر سکتے ہیں اور اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

ایک گائے خریدنے اور دھان سے چاول تیار کرنے کا بیوپار جاری رکھنے کی خاطر جنوری 1981ء میں زرینہ نے بنک سے دو ہزار روپے کا ایک اور قرضہ حاصل کر لیا۔ پچھلے منافع سے آٹھ سو روپے اس کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ لہٰذا اب اس کے پاس دو ہزار آٹھ سو روپے ہو گئے۔ اس رقم میں سے زرینہ نے 1525 روپے کی گائے خریدی۔ چار سو روپے کے خرچ سے اپنی جھونپڑی کے ساتھ ایک جھونپڑی ڈالی۔ دو سو روپے سے بچوں کے کپڑے خریدے اور باقی رقم سے دھان کا کام جاری رکھا۔

فرصت کے لمحوں میں زرینہ کھجور کے پتوں سے چٹائیاں بنایا کرتی ہے۔ مہینے میں وہ دو چٹائیاں تیار کر لیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا بھی بیکار وقت ضائع نہیں کرتا۔ وہ کھیت میں مزدوری کرتا ہے اور اجرت کے طور پر اس کو کھانا مل جاتا ہے۔ یوں زرینہ خوش ہے اور اب اس کی زندگی سکھ چین سے بیت رہی ہے۔

مجھے اس نے بتایا کہ ہر مہینے تھوڑی بہت رقم تمام ضروری اخراجات کے بعد بچ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک حالیہ مہینے کی بچت 129 روپے تھی۔ خیر، زرینہ نے گروپ فنڈ کی رقم کے بارے میں فی الحال کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ وہ کہتی ہے کہ ''اگر ہمارے پاس زیادہ رقم جمع ہو جائے تو ہم کوئی بڑا کام کر سکتی ہیں۔'' میں نے اس سے کہا کہ ''اگر اس دوران میں بنک نے اپنا پراجیکٹ ختم کر دیا تو پھر کیا ہو گا؟''

زرینہ نے فوراً جواب دیا۔''اگر ہم لوگ مناسب طور پر قرض لیں اور وقت پر اپنی قسطیں ادا کرتے رہیں اور کوئی دھوکہ بازی نہ کریں تو پھر یہ پراجیکٹ بند ہی کیوں ہوگا؟''

گرامین بینک نے جب کام شروع کیا تھا تو پہلے پہل لوگوں نے اس کے بارے میں بہت سی بے بنیاد افواہیں پھیلائی تھیں۔ بہت سے سادہ لوح دیہاتی ان افواہوں کے سبب بنک سے ڈرنے لگے تھے۔ چند لوگ تو اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ''یہ بنک غریبوں کو پھانسنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر تم اس بنک سے قرضہ لو گے تو وہ ہر سو روپے پر پانچ روپے پہلے ہی کاٹ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ سود بھی دینا پڑتا ہے۔ یہ تو ہے ہی غریبوں کو مارنے کا بہانہ۔''

خیر' ہم زرینہ کی کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ وہ اور اس کا خاندان سبزیاں بازار سے نہیں خریدتا۔ کدو' بینگن اور بھنڈی جیسی کئی سبزیاں اس نے اپنے صحن میں کاشت کر رکھی ہیں۔ یہی سبزیاں وہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ گزشتہ عید کے موقع پر زرینہ آدھا سیر گوشت خرید لائی تھی۔ کبھی کبھی وہ بازار سے مچھلی بھی لے آتی ہے۔ ویسے اس کا بڑا بیٹا نزدیکی تالاب سے چھوٹی مچھلیاں پکڑ لاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ کھانے پینے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ البتہ جو اشیاء بہت ضروری ہیں وہ بازار سے خرید لیتے ہیں۔

جھونپڑی کی دیوار میں نصب ایک تختے پر مجھے چند کتابیں نظر آئیں تو میں نے زرینہ سے پوچھا کہ ''ان کتابوں کو کون پڑھتا ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ وہ اور اس کا شوہر تو بالکل ان پڑھ ہیں۔ خود اس نے بنک کے سابق فیلڈ مینجر حلیم صاحب کی مدد سے صرف دستخط کرنا ہی سیکھے ہیں۔ لیکن وہ بچوں کو اپنی طرح جاہل نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ زندگی میں کوئی معزز مقام حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اس نے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کو سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ دونوں پہلی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ بڑے بیٹے رحیم کو اس بات کا دکھ ہے کہ وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے لگتا تھا کہ زرینہ سنہری مستقبل کے خوابوں میں کھو سی گئی ہے اور لمحہ موجود سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اسی کیفیت میں کہنے لگی ''خدارا' میرے بچوں کے لئے دعا کیجئے۔''

میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا گرامین بنک پراجیکٹ میں شمولیت سے زرینہ کی زندگی میں کوئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ کہنے لگی کہ ''پہلے تو حال یہ تھا کہ کئی کئی روز تک ہمیں کھانے کو کچھ نصیب نہ ہوتا تھا۔ کنیزوں کی طرح میں دوسروں کے گھروں میں مشقت کیا

کرتی تھی۔ جلانے کی لکڑیوں کا بھاری بوجھ اٹھا کر گاؤں گاؤں اس بھروسے پر پھرا کرتی تھی کہ کوئی چند ٹکوں کے عوض ان کو خرید لے گا۔ ہمارا کوئی گھر نہ تھا۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کوئی ہمیں منہ نہ لگاتا تھا۔ کوئی ہماری عزت نہ کرتا تھا۔'' مگر اب وہ پہلے سے حالات نہیں۔ مدد کے لئے زرینہ کو در بدر ٹھوکریں نہیں کھانا پڑتیں۔ نہ ہی دوسروں کی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتی ہے کہ ''بنک کے قرضے کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہم کو خوشیوں کی راہ پر ڈال دیا ہے۔''

ہم کمرے میں بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے بیٹے نے زرینہ کو آواز دی۔ وہ باہر گئی اور چند ہی لمحوں میں لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تر و تازہ کٹھل تھا۔ خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے مجھے بتایا کہ یہ پھل اس کے شوہر نے پانچ روپے میں خرید کر بھیجا ہے۔ بینک سے قرضہ لینے سے پہلے وہ لوگ ایسا کوئی پھل خریدنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ بڑے خلوص کے ساتھ زرینہ نے مجھے پھل چکھنے کو کہا۔ مگر مجھے ابھی کئی سوال پوچھنے تھے۔ لہٰذا میں نے اسی لمحے پوچھ لیا کہ ''تم اپنے حالات کو اور بھی اچھا بنانے کے لئے آئندہ کیا کچھ کرنے کا سوچ رہی ہو؟'' اس سوال پر زرینہ کے چہرے پر قدرے گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ کہنے لگی ''بہت سی امیدیں ہیں۔ بس اللہ ہمیں زندگی دے اور ہمت سے نوازے۔''

اس وقت زرینہ نے دو ہزار روپے کا جو قرضہ لے رکھا ہے' تو اس میں سے وہ 425 روپے واپس کر چکی ہے۔ وہ اوسطاً 67 روپے فی ہفتہ بچت کر رہی ہے۔ موجودہ قرضہ اتارنے کے بعد وہ تین چار ہزار روپے کا ایک اور قرضہ لینے کا ارادہ کر رہی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو بھی گروپ بنانے کا مشورہ دیا ہے۔ گروپ بنانے کے بعد وہ دو یا تین ہزار روپے کے قرض کے لئے درخواست دے گا۔ اس رقم سے وہ ایندھن کا بیوپار شروع کرنا چاہتا ہے۔ مشترکہ آمدنی سے سارے قرض اتارنے کے بعد زرینہ پختہ گھر بنانے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ اس کو اور بچوں کو محفوظ گھر مل جائے۔ وہ تھوڑی سی زمین بھی خریدنا چاہتی ہے۔

واپسی کے ارادے سے جب میں اٹھا تو زرینہ کا شوہر' رستم خان' گھر میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور بیوی سے کہنے لگا ''ہمارے معزز مہمان کو تھوڑا سا کٹھل دو نا۔''

بختاور کی کہانی

بھوا پر کے جنوب میں آدھے میل کے فاصلہ پر بڑی سڑک پر ایک کنکریٹ کا پل بنا ہوا ہے۔ پل کے جنوب میں سڑک کے دونوں کناروں پر چند دکانیں ہیں۔ ان دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی نہر بہتی ہے۔ اس پر بانسوں کا ایک شکستہ پلہ لٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پل کو پار کر کے مغرب کی طرف جو پہلا گھر آپ کو دکھائی دے گا' سمجھ جایئے کہ وہ بختاور بی بی کا گھر ہے۔ اس گاؤں کا نام بہوری ہے۔ یہ ٹنگائیل ضلع کے بھوا پور تھانہ میں واقع ہے۔

بختاور ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ لیکن اندر سے اس کا گھر صاف ستھرا ہے۔ جب ہم اس کے گھر کے پاس پہنچے تو بختاور ہمارے استقبال کو آئی۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور باوقار دکھائی دے رہی تھی۔ صرف تیرہ روز پہلے اس نے اپنے چھٹے بچے کو جنم دیا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے ہم کو اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے سے زندگی کی سختیوں کا عکس جھلک رہا تھا۔ مگر اس کے شائستہ آداب اور مسکراتا ہوا چہرہ خوش گوار تاثر دے رہا تھا۔ باتوں کے دوران ہم نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں۔ مرچیں خریدنے وہ قریبی بازار گیا ہے۔ اس کا شوہر مفلوج ہے۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑاتا ہے اور زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ بیچنے والی چیزیں منڈی تک لے جانے اور وہاں سے خریدی ہوئی چیزیں گھر تک لانے میں بیٹیاں اس کی مدد کرتی ہیں۔

6 جولائی کو تیسری بار میں بختاور کے گھر گئی۔ اس روز بھی اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔ مہمانداری کی خاطر بختاور ہمسایوں سے کرسی مانگنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے منع کر دیا اور ایک پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ بختاور کے کمرے کی چھت گیہوں اور پٹ سن کے ریشے سے بنی ہوئی تھی۔ جہاں میں بیٹھی تھی وہاں سے باہر کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ بختاور کے گھر کے شمالی رخ پر ایک ٹین کا اور دو گھاس پھونس کے گھر بنے ہوئے تھے۔ یہ اس کے سسر اور

MashalBooks.org

دیوروں کے گھر تھے۔ دوسری طرف ایک خالی پلاٹ تھا شاید وہاں کبھی کوئی گھر ہوتا ہوگا۔ اب اس کے صرف آثار باقی رہ گئے تھے۔

کمرے کے اندر کوئی فرنیچر نہ تھا۔ البتہ وہاں ایک پرانی چار پائی رکھی تھی۔ یہ چار پائی بختاور کے بھائیوں نے اس کی فرمائش پر اس وقت دی تھی جب اس کے شوہر پر بیماری کا حملہ ہوا تھا۔ چار پائی پر چند گندے جیکٹ تکیے اور لحاف پڑے ہوئے تھے۔ بختاور کا نوزائیدہ بچہ چار پائی کے ایک کونے میں سویا ہوا تھا۔ کمرے کے بائیں حصے میں بانس کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اس پر اناج رکھنے کی ایک بڑی سے ٹوکری، چاول سکھانے کا مٹی کا ایک بڑا سا برتن اور بانس کی ایک ٹوٹی ہوئی چھلنی رکھی تھی۔ فرش پر مٹی کی صراحی، تین ہانڈیاں، مٹی کے چند تھالیاں، چند ٹوتے ہوئے ٹین کے ڈبے، تابنے کا گلاس، ایک ٹوٹی ہوئی پیڑھی اور ایلومینیم کا ایک بڑا سا برتن رکھا تھا جو شاید دھان ابالنے کے کام آتا تھا۔ بختاور نے ہمیں بتایا کہ وہ لوگ کھانا، پینا، سونا سب کچھ اسی چھوٹے سے کمرے میں کرتے ہیں۔ یہی کمرہ اس کی کل کائنات تھا۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ بختاور کا شوہر آ گیا۔ وہ بکریوں کی خبر گیری کے لئے کھیتوں تک گیا ہوا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہوئے وہ بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ مجھے سلام کرنے کے لئے اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ سات سال پہلے اس کی یہ حالت نہ تھی۔ اب اگرچہ وہ جسمانی طور پر مفلوج ہو چکا تھا' لیکن ذہنی طور پر چاق و چوبند تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہی مجھے اس امر کا احساس ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کو اپنی بیوی سے گہری محبت ہے۔

بختاور کا اپنا گاؤں چابشاہ ہے جو بھواری سے ایک میل دور ہے۔ وہ اس گاؤں میں پیدا ہوئی تھی' لیکن اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں اس کو یقین سے معلوم نہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا دادا، اجمل شیخ ایک با اثر آدمی تھا۔ بختاور نے اس کو دیکھا نہیں تھا لیکن یہ جانتی تھی کہ وہ ایک امیر اور خوش حال کسان تھا۔ اس کے پاس نوکر چاکر، زمین، جائیداد سب کچھ تھا۔ بختاور کے دادا کو خوش باش اور محنتی آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس نے پانچ شادیاں کی تھیں۔ تین بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی جب کہ باقی دو بیویوں نے تین بیٹوں اور دو بیٹوں کو جنم دیا۔ بختاور کا باپ اور ایک چچا ایک بیوی سے تھے جب کہ باقی اولاد دوسری بیوی سے تھی۔

جب بختاور کا باپ، رفیق شیخ، اٹھارہ برس کا ہوا تو اس کا باپ فوت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی خاندان کے لئے کئی مصائب پیدا ہو گئے۔ ان کا گھرانا بڑا تھا، لیکن اس کی دیکھ بھال کے لئے کوئی جہاندیدہ آدمی موجود نہ تھا۔ خاندان کا ہر فرد کاہل اور ناکارہ تھا۔ جائیداد کی وجہ سے خاندان کے افراد فاقے سے محفوظ رہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مصیبتیں بڑھنے لگیں اور حالات زیادہ خراب ہوتے چلے گئے۔

رفیق شیخ بیس برس کا ہوا تو اس نے ڈھونڈ کر ایک خوبصورت عورت سے شادی کی جو بعد میں بختاور کی ماں بنی۔ بختاور نے بتایا کہ اس کے والدین آپس میں قریبی رشتہ دار تھے۔ رفیق شیخ نے عربی زبان پڑھ رکھی تھی۔ وہ مسجد میں خطبہ دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی زمین پر کاشت بھی کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کو پسند کرتے تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ سب لوگ اس کو رفیق بھائی پکارا کرتے تھے۔ شادی کو ابھی دو ماہ ہی گزرے تھے کہ رفیق شیخ اپنی سوتیلی ماں کی چالبازی کا شکار ہو گیا جس نے اس کے بھائیوں کو ساتھ ملا کر سازش کی تھی۔ رفیق شیخ کو ورثے میں گیارہ پکھی زمین ملی تھی (ایک پکھی تقریباً سولہ سو مربع گز کے برابر ہوتی ہے) وہ خود اپنے حصے کی زمین پر محنت کرتا تھا۔ اس زمین کی پیداوار پر اس کا خاندان اچھی بھلی زندگی بسر کرتا تھا۔

بختاور نے بچپن میں گھر پر اپنے باپ سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے تک وہ مدرسے بھی جاتی رہی جہاں اس نے قرآن پڑھنا سیکھا۔ اس زمانے میں بہت کم لڑکیاں قرآن پڑھ سکتی تھیں۔ بچپن میں وہ اپنی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ کچھ عرصے تک وہ سکول بھی جاتی رہی۔ لہٰذا اب وہ بنگالی زبان بھی پڑھ سکتی تھی، لیکن مشق نہ ہونے کے سبب وہ اس زبان میں لکھ نہیں سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے دستخط کر سکتی ہے۔ بختاور کو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم کے بہت کم مواقع دستیاب تھے۔ آج کی طرح اگر اس کے بچپن میں لڑکیوں کے لکھنے پڑھنے کے مواقع ہوتے تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتی۔ وہ اپنے زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کرتی۔ اپنی تین بہنوں میں سے صرف اس کو مدرسہ جانا نصیب ہوا تھا۔ باقی دو بہنوں کی پڑھائی کے لئے برائے نام کوشش ہوئی، وہ اَن پڑھ ہی رہیں۔ بختاور کے سب سے بڑے بھائی نے سکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور اب وہ خط لکھ پڑھ سکتا ہے۔ اس نے مدرسے

سے قرآن کی تعلیم بھی پائی تھی۔ باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ مسجد میں موذن بن گیا۔ باپ کی طرح وہ بھی نماز کے وقت خطبہ پڑھتا ہے۔ سب لوگ اس کو مولوی بھائی کہتے ہیں۔ بختاور کے چھوٹے بھائی نے سائنس گروپ میں میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔ وہ ضلع میمن سنگھ میں محکمہ زراعت میں ملازم رہا ہے۔

بختاور ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے اور ہر مصیبت سے محفوظ رکھتے تھے۔ وہ کسی شے کی تمنا کرتی تو اس کا باپ یا بھائی فوراً ہی اسے مہیا کر دیتا یا کم از کم مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ان ایام میں بختاور کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہتی تھی۔ وہ خود بھی اپنے ماں باپ کا بہت خیال رکھتی اور بہن بھائیوں سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ ماں بختاور سے کام لینا نہ چاہتی تھی۔ لیکن وہ خود ہی گھر کے کام کاج میں ماں اور بھابھی کا ہاتھ بٹاتی جس سے وہ بہت خوش ہوتیں۔ ان دونوں باپ کے ساتھ ساتھ بیٹے بھی کاشتکاری کر رہے تھے اور بڑے آرام سے ان کے دن گزر رہے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ رفیق شیخ بوڑھا ہوتا چلا گیا اور کھیتوں میں کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ اس طرح خاندان کی ساری ذمہ داریاں مولوی بھائی کے کندھے آ پڑیں۔

مولوی بھائی کے لئے ان ذمہ داریوں کو نبھانا آسان نہ تھا۔ کھانے والے بہت تھے اور محنت کرنے والے کم ہو گئے تھے۔ اس لئے مشکلات بڑھنے لگیں۔ دال روٹی چلانے کے لئے رفیق شیخ نے زمین بیچنی شروع کر دی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ 1962ء میں بڑا سیلاب آیا اور خوراک کی کمی ہوگئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح بختاور کے خاندان کے مصائب بھی بڑھ گئے۔ آٹے اور چاول کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ فصلیں برباد ہو گئیں اور بختاور کے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ان لوگوں نے بھی فاقوں کے ہاتھوں مرنے سے بچنے کے لئے زمین فروخت کر دی۔

ان ساری باتوں کے باوجود بختاور کے بچپن کی عیدیں یادگار ہوا کرتی تھی۔ اب ان دنوں کی یاد سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ بختاور نے مجھے بتایا کہ وہ ہمیشہ صحت مند اور مضبوط ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھار کے نزلہ زکام کے سوا زندگی میں کبھی اس پر کسی سخت بیماری کا حملہ نہ ہوا تھا۔

بختاور نے شادی کے بارے میں کبھی زیادہ سوچا نہ تھا لیکن ایک روز وہ اس بندھن

میں بندھ گئی۔ جب اس کی عمر چودہ برس ہوئی تو بھواری گاؤں کے صغیر علی کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہو گیا۔ یہ رشتہ صغیر علی کے باپ نے طے کیا تھا۔ اس نے بختاور کو دیکھا تو اس کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے بختاور کو مانگ لیا۔ بختاور کا باپ اب اس دنیا میں نہ تھا' لہٰذا اس کے بھائیوں نے بات پکی کی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ بختاور ان کی چھوٹی بہن ہے اور سارے گھر کی آنکھوں کا تارا ہے، لہٰذا اس کو زیورات اور اچھے اچھے کپڑے دیئے جائیں۔ دلہن کے حسن نے دولہا کے سارے خاندان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں، لہٰذا انہوں نے فوراً ہی یہ مطالبہ پورا کرنے کی حامی بھر لی۔ شادی کے موقع پر صغیر علی کے باپ نے بختاور کو سونے کانٹے اور چوڑیاں دیں۔ شادی کی ساڑھی بھی بہت مہنگی تھی۔ اس کے علاوہ روز مرہ کے استعمال کے لئے دو اور ساڑھیاں بھی دلہن کی نذر کی گئیں۔

نئی نویلی دلہن کے روپ میں بختاور بھواری چلی آئی۔ سسرال میں سب لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ بختاور نے سب کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ صحن میں جھاڑو دیتی' کھانا پکاتی اور سب کی خدمت کرتی۔ تب اس کا شوہر صغیر علی توانا اور صحت مند آدمی تھا۔ وہ سرخ مرچوں کا کاروبار کرتا تھا اور تھوڑی بہت رقم اس نے بچا رکھتی تھی۔ اس کا باپ خاندان کا سربراہ تھا اور وہی خاندانی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جب کہ صغیر علی کا چھوٹا بھائی کاشتکاری میں مدد دیا کرتا تھا۔ پھر بھی شادی کے بعد کے دن بختاور کے لئے مصیبت بن گئے۔

شادی کے چند روز بعد گاؤں میں گھوڑوں کی وبا پھیل گئی اور صغیر علی کے خاندان کے دو گھوڑے یکے بعد دیگرے اس وبا کی نذر ہو گئے۔ اس پر سب نے نئی دلہن پر انگلیاں اٹھانی شروع کر دیں اور اس کو گھوڑوں کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا، ہر کوئی اس کو منحوس اور بد روح قرار دینے لگا۔ لوگ اسے ہر شئے ہڑپ کر جانے والی بلا سمجھنے لگے جس نے گھر میں قدم رکھتے ہی دو گھوڑوں کی جان لے لی تھی۔ وہ کہتے، یہ لڑکی تو ہمیں تباہ کرنے آئی ہے۔ یہ چڑیل ہے۔ ہم اس کو یہاں مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کو یہاں سے نکلنا ہی ہو گا۔''
بختاور کو برا بھلا کہا جاتا اور اس کی توہین کی جاتی۔ رات دن اس پر لعن طعن کی جاتی۔ وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز ساس نے اس کی دال روٹی

MashalBooks.org

بھی بند کر دی۔ جب سارے لوگ کھانے سے فارغ ہوتے تو ساس برتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں لے جاتی تا کہ بختاور کے کھانے کے لئے کچھ نہ رہے۔ اصل میں یہ بھی اس کو گھر سے نکالنے کا ایک حربہ تھا۔ لیکن بختاور ڈٹی رہی۔ سسرالی عزیزوں سے جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے بختاور پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک وہ اس کے حسن وشباب کے بارے میں اپنی گندی زبانیں بھی کھولنے لگے۔

صغیر علی بے بسی کے عالم میں اپنی بیوی کی توہین برداشت کرتا رہا۔ باپ کے سامنے زبان کھولنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ لیکن اس نے بیوی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہ کی۔ اس کے ماں باپ بختاور کو طلاق دینے پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے یہ لالچ بھی دیا کہ اگر صغیر علی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو وہ اس کے لئے بختاور سے بھی زیادہ خوبصورت بیوی ڈھونڈ لائیں گے۔ اس مہم میں بعض کینہ پرور ہمسائے بھی شریک ہو گئے۔

ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ظلم بڑھتا جائے تو کمزور سے کمزور آدمی بھی ایک نہ ایک روز اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بختاور کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ جب اس کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی تمام حدیں پار کر گئی تو صغیر علی اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''اگر تم میرے گھر میں رہنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں اس عورت سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔'' صغیر علی نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے باپ نے اس سے تعلق قطع کر لیا اور باقی گھرانے سے الگ کر دیا۔ باپ اس کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ اس نے صغیر علی کو ایک انچ زمین دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ صغیر علی یہ صدمہ نہ سہہ سکے گا اور اس کے آگے جھک جائے گا۔ صغیر علی اور بختاور گھر سے نکال دیئے گئے۔ اس کے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ لیکن صغیر علی ڈٹا رہا۔ اس کے باڑے کے ایک حصے میں اپنے لئے چھونپڑی بنانے لگا۔ باپ نے روکنا چاہا' مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ تب سے وہ دونوں میاں بیوی اس چھونپڑی میں وہ رہے ہیں۔ روہانسی آواز میں بختاور نے کہا کہ ''جب سے میں نے اس گھر میں قدم رکھا ہے، میں دکھ درد کی آگ میں جل رہی ہوں۔ اس کے انگارے اب بھی سرد نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ خدا نے کبھی کسی اور شخص کو اس قدر کڑے امتحان میں نہیں ڈالا۔''

بختاور کا خاوند یہ باتیں سن رہا تھا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ''شادی

کے ساتھ ہی میرا مقدر بدل گیا تھا۔'' جب سے وہ سسرال آئی تھی، اس گھر کے کسی فرد نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تھا۔ ہر کوئی اس پر ستم آزمانے لگا تھا۔ ہر کوئی اسے جسمانی اور ذہنی اذیت دینے لگا تھا۔ ساس نے تو کئی بار اس کو مارا پیٹا بھی تھا۔ وہ ہر حال میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کی منت ساجت کرتی کہ وہ کبھی اس کو اپنے سے جدا نہ کرے۔ بختاور کا استدلال یہ تھا کہ ''انسان زندگی میں صرف ایک بار شادی کرتا ہے۔ صرف جانور ہی بار بار بیاہ رچاتے ہیں۔''

صغیر علی بختاور سے وفادار رہا۔ سچی بات یہ ہے کہ شادی کے دن سے اب تک کبھی اس نے اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا تھا۔ غربت کے باوجود وہ اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی طرح بختاور بھی اس کو خوش رکھنے کے سارے جتن کرتی تھی۔ اب بھی اس کا یہی وطیرہ ہے۔ بختاور نے مجھے بتایا کہ ''میں نے کبھی اپنے شوہر کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ وہ بھی ہر طرح سے میرا خیال رکھتا ہے۔''

سسرالی عزیز جب بختاور کے ساتھ شرمناک سلوک کرتے تھے تو چند ہمسایہ مردوں نے اس کے ساتھ ہمدردی جتلانا چاہی تھی۔ لیکن بختاور اس نمائشی جذبے کے پیچھے چھپے ہوئے ان کے ارادے بھانپ گئی تھی۔ لہٰذا اس نے کسی کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ مایوس ہو کر ان میں سے بعض لوگوں نے بھی اس کے کردار کے خلاف جھوٹے قصے پھیلانے شروع کر دیئے۔ وہ بے بس تھی۔ ان لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ خاموشی سے سب کچھ سہتی رہی۔ مگر اس کے ساتھ ہونے والے سلوک اور ہمسایوں کے پھیلائے ہوئے قصے آخر کار اس کے آبائی گاؤں تک بھی جا پہنچے۔ اس کے بھائیوں نے یہ سب کچھ سنا تو برداشت نہ ہوا اور ایک روز اس کو لینے کے لئے آ گئے۔ بختاور نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ کئی بار بختاور کو لینے کے لئے آتے رہے۔ مگر اس نے جانا تھا اور نہ گئی۔ بھائیوں نے مجبور ہو کر ماں کو بھیجا کہ وہ بختاور کو سمجھائے اور اپنے ساتھ واپس لے آئے۔ بختاور پھر بھی نہ مانی۔ بھائیوں کو اس کے مصائب پر بہت رنج ہوا۔ وہ کہتے کہ ''ہمیں ہرگز معلوم نہ تھا کہ اس کے سسرال والے اس قدر شیطان ہیں۔ کاش ہم جانتے تو کبھی اپنی بہن ان کے حوالے نہ کرتے۔ اس پر لگائی جانے والی جھوٹی تہمتیں سن کر تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔'' ان ساری باتوں کے باوجود بختاور ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کی سوئی بس اس بات پر اٹکی ہوئی تھی کہ چاہے جو بھی

ہو، میں اپنے شوہر سے جدا نہ ہوں گی۔ اس کے مسلسل انکار سے بھائی بھی چڑ گئے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ''بختاور ہمارا کہنا نہیں مانتی۔ وہ ہماری بہن ہی نہیں ہے۔ ہمارے لئے وہ مرگئی ہے۔''

بھائیوں کی بات سن کر بختاور کا جی بھر آیا۔ وہ رونے اور خدا سے مدد مانگنے لگی۔ بھائیوں کو ناراض کرنے کے بعد میکے سے کوئی تعلق باقی رہنے کی اسے امید نہ رہی۔ پہلے دکھ سکھ میں وہ اپنے گھر والوں کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اس کا شوہر بھی اپنے سسرال جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بختاور کو بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ بختاور کے گھر والے صغیر علی سے گلہ شکوہ نہ کرتے تھے اور اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ مگر جب سے بھائیوں نے بختاور سے منہ پھیر لیا تھا، اس نے اور اس کے خاوند نے کبھی چاپشاہ کا رخ نہ کیا تھا۔ تاہم بختاور کی ماں کبھی کبھی آیا کرتی تھی۔ خاص طور پر جب بختاور کسی بچے کو جنم دینے والی ہوتی تو اس کی ماں آ جایا کرتی تھی۔ جب میں تیسری بار بختاور کے گھر گئی تھی تو اس سے چند روز پہلے اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ اس موقع پر بھی اس کی ماں چند روز کے لئے آئی تھی۔ جس روز میں بختاور کے گھر گئی، اس صبح کو اس کی ماں اپنے نواسے نواسیوں کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔

اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے بختاور نے بتایا کہ جب سسرالی عزیز صغیر علی کو طلاق پر مجبور نہ کر سکے تو تنگ آ کر انہوں نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ یوں آخری سہارا بھی ختم ہو گیا۔ بختاور اور صغیر علی کے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ رہی اور نہ ہی زندگی کا کوئی ساز و سامان تھا۔ صغیر علی نے جب ایک کونے میں اپنے لئے جھونپڑی بنانے کا کام شروع کیا تھا تو اس کے گھر والوں نے اس کو گرانے کے منصوبے بھی شروع کر دیئے تھے۔ اس کا باپ اور بھائی کئی بار جھونپڑی کو گرانے کی نیت سے آئے تھے۔ مگر ہر بار بختاور چٹان کی طرح ان کے سامنے ڈٹ جاتی۔ ان لوگوں نے کئی بار اس کے سامان باہر پھینک دیا۔ بختاور کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انصاف کے لئے رو رو کر خدا کو پکارے۔ وہ باہر گرائی ہوئی چیزیں اکٹھی کرتی، ان کو اندر لاتی اور زمین پر گر کر رونے لگتی۔ پھر بھی جب کبھی اس کا شوہر زندگی کی سختیوں کے آگے حوصلہ ہارنے لگا تو وہ صبر شکر کر کے اس کی ڈھارس بندھاتی۔ گرد و پیش کے لوگوں میں سے کوئی ان کی مدد نہیں کرتا تھا۔ وہ تو بس تماشائی تھے۔ چپ رہتے

MashalBooks.org

اور تماشا دیکھا کرتے تھے۔ یہ بختاور کی شادی کے پانچ سال بعد کے واقعات ہیں۔ انہی دنوں اس کی پہلی بچی آمنہ پیدا ہوئی تھی۔

صغیر علی کو گھر سے نکالنے کے کچھ عرصہ بعد اس کے باپ نے دوسرے دو بیٹوں کو دو دو پکھی زمین دینے کی وصیت کردی۔ اس طرح صغیر علی کو اس کے حصے سے محروم کر دیا گیا۔ اس پر صغیر علی نے اپنا حصہ لینے کے لئے رشتہ داروں اور ہمسایوں سے مدد کی درخواست کی، اس نے یونین کونسل کے چیئر مین کو بھی اپنے باپ کی نا انصافی کے خلاف درخواست دی۔ آخر کار بہت سی کوششوں کے بعد باپ اس کو ایک پکھی زمین دینے پر رضا مند ہو گیا۔ مگر یہ کمتر قسم کی زمین تھی اور ویسے بھی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ خیر یہی زمین دکھ درد سے بھری ہوئی اس دنیا میں بختاور اور اس کے شوہر کا سہارا بن گئی۔ اب یہی ان کی جائیداد ہے۔

بختاور کے ہاں پہلا بچہ شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام انہوں نے آمنہ رکھا تھا اور اس کی پیدائش پر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ حمل کے دنوں میں بختاور خاصی خوف زدہ رہی تھی، مگر وہ دن بخوبی گزر گئے۔ اس بچی کی پیدائش کے چند روز بعد ہی دونوں میاں بیوی کو گھر سے نکالا گیا تھا اور انہوں نے صغیر علی کی بنائی ہوئی چھوٹی سی جھونپڑی میں پناہ لی تھی۔ آمنہ چھ سال کی ہوئی تو اسی جھونپڑی میں بختاور نے اپنے پہلے بیٹے کو جنم دیا۔ وہ بیمار سا پیدا ہوا تھا اور صرف چار روز تک اس دنیا میں سانس لینے کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بختاور کے لئے یہ بہت جانکاہ صدمہ تھا۔ وہ کئی دن روتی رہی۔ لیکن صغیر کے ماں باپ میں سے کوئی بھی اس کو دیکھنے نہ آیا۔ کسی نے ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ اس سانحہ کے تقریباً ڈھائی سال بعد ان کی ہاں بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے ملکہ رکھا۔ وہ صحت مند بچی تھی۔ تب بختاور کی اپنی صحت بھی اچھی خاصی تھی۔ ملکہ کے تین سال بعد لڑکے مجنوں میاں نے جنم لیا اور جب وہ دو سال کا تھا تو بختاور کے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رشیدہ رکھا گیا۔ چار برس تک رشیدہ عام بچوں کی طرح بڑھتی پولتی رہی۔ کبھی کبھار کے بخار یا ٹھنڈ کے سوا اس کو کوئی شکایت نہ تھی۔ پھر اچانک اس کو پیچش کا مرض ہوا۔ اس کو تھوڑی بہت دوا بھی دی گئی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بچی انتقال کر گئی۔ بختاور کو ایک اور گہرا گھاؤ لگا اور وہ خود کو بچی کی موت کی ذمہ دار سمجھنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر بچی کو علاج معالجہ کی بہتر سہولت مل جاتی تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔ یہ احساس اس کے لئے گہرے دکھ کا باعث بن گیا کہ وہ اپنی ننھی سی بچی کا

MashalBooks.org

مناسب علاج نہ کروا سکتی تھی۔ رشیدہ کی موت کے کچھ عرصہ بعد مجنون میاں ملیریا بخار کی زد میں آ گیا اور کئی دنوں تک اس کی گرفت میں رہا۔ اس بار ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا اور بچے کے علاج پر خاصی رقم صرف کی گئی۔ یوں اس کی جان بچ گئی۔ آہستہ آہستہ بختاور بھی رشیدہ کی موت کا غم بھولنے لگی۔ اس کی موت کے چار سال بعد بختاور کے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا۔ یہ اس کا چھوٹا بچہ ہے۔ اس کا نام سہراب علی رکھا گیا ہے۔ جب میں بختاور سے ملنے گئی تھی۔ تو اس وقت یہ بچہ صرف تیرہ دن کا تھا۔

چھ بچوں کو جنم دینے کے باوجود ابھی تک مضبوط اور صحت مند ہے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی رہی ہے۔ حمل کے دنوں میں وہ صرف چاول، نمک، پانی اور سبز مرچوں پر گزارہ کیا کرتی تھی۔ اکثر اوقات ان سے بھی محروم رہنا پڑتا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ اپنا دودھ پلایا کرتی تھی۔ مجنوں میاں کے سوا باقی تمام بچے اس کے دودھ پر ہی پلے تھے۔ مجنوں میاں کی بار البتہ اس کی چھاتیاں خشک ہوگئی تھیں اور مجبوراً اس کو گائے یا بکری کا دودھ دینا پڑا تھا۔ بچے جب ذرا بڑے ہوئے تو ان کو نمک کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھانے کو دیئے جاتے۔ آمنہ کے سوا بختاور اپنے کسی بچے کو اچھی خوراک مہیا نہ کر سکی تھی۔ اکثر اوقات ان لوگوں کو نیم فاقوں کا سامنا رہتا تھا۔ یہ صورت حال کئی کئی مہینے جاری رہتی تھی۔ صغیر علی پر فالج کے حملے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی۔ کھانے کے لئے گھر میں کچھ نہ رہا۔ یہاں تک کہ بچوں کو فاقے سے بچانے کے لئے بختاور ہمسایوں سے پچھ (وہ پانی جس میں چاول ابالے جاتے ہیں اور جو عام طور پر پھینک دیا جاتا ہے) کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی۔ شوہر کی بیماری کے تین برسوں میں گھر کی حالت بالکل بگڑ گئی۔ کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ بختاور نے ان اذیت ناک دنوں کو یاد کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ بچوں کے فاقہ زدہ چہرے دیکھ کر اس سے صبر نہ ہوتا تھا۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ بچے روٹی کے لئے روتے تو وہ گویا پاگل سی ہو جاتی۔ کبھی کبھی اپنی بے بسی اور لاچاری کے عالم میں وہ بچوں کو بڑی طرح پیٹنے لگتی۔ اور پھر جب تنہائی کے لمحے آتے تو ماتم کرتی' زار و قطار روتی۔ ان ایام کا ذکر کرتے ہوئے بختاور کی آواز ڈوبنے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا کہ ''ان دنوں کی ساری باتیں بتاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ دکھ درد کے اس اندھے کنویں سے نکلنے کے لئے میں نے جو کچھ ممکن تھا' کر ڈالا تھا۔''

صغیر علی کو باپ سے جو زمین کا ٹکڑا ورثے میں ملا تھا، اس پر کاشت کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ صغیر علی بیماری کے طویل زمانے میں گھر بار کی ساری ذمہ داری بختاور کے کندھوں پر آ پڑی تھی اس کے بچے چھوٹے تھے اور روزی کمانے کے قابل نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ باتوں سے یا آہیں بھرنے سے کام نہیں چلتا۔ بھوک اور مصیبتیں جب برداشت سے باہر ہونے لگیں تو بختاور نے طے کر لیا کہ اسے تنہائی میں سب کچھ سہنا ہے۔ اب وہ معاشرے کے بندھنوں کے اندر نہ رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنے شوہر کی جگہ نہ لی تو سارا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے رات کے اندھیروں میں اپنی زمین پر کام شروع کر دیا۔ بار بار کی التجاؤں سے اس نے اپنے ایک ہمسایہ کو مدد پر آمادہ کر لیا۔ اس نے بختاور کی زمین پر ہل چلا دیا۔ اپنے ہاتھوں سے وہ مٹی کے ڈھیلے توڑنے لگا۔ زمین کو سینچنے کے لئے وہ ہمسایوں کے ٹیوب ویل سے خود پانی لاتی۔ بیج کے لئے اس نے زمین تیار کی، دھان کی فصل اگائی اور فصل کی دیکھ بھال کرنے سے اس کی کٹائی اور تیاری تک کا سارا کام بختاور نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ اپنے بال بچوں کو بھوک کے ہاتھوں مرنے سے بچانے کے لئے شدید مشقت کے ان دنوں میں گاؤں کا کوئی فرد اس کی مدد کے لئے نہ آیا۔ البتہ بڑے بوڑھے آتے جاتے اس کو معاشرے کے آداب یاد دلاتے اور عزت دار عورتوں کے فرائض سے آگاہ کرتے رہتے۔ بختاور اپنے کام میں جتی رہی اور اس نے ان لوگوں کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ راتوں کو وہ زمین پر مشقت کرتی، دن میں دھان کا بھوسا اتارتی اور دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرتی۔ اس ساری محنت سے جو کچھ اس کے ہاتھ لگتا، اس سے وہ اپنے بیمار شوہر اور بچوں کا پیٹ پالتی۔ دکھ درد کے ان دنوں میں بختاور کے سسرالی عزیزوں نے کبھی اس کی خبر نہ لی۔ صغیر علی اپنے والدین سے الگ ہو چکا تھا اور چھ سات برس تک اپنے خاندان کا سارا بوجھ اس نے اٹھائے رکھا۔ سرخ مرچوں کا کاروبار اس نے جاری رکھا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنی زمین پر کاشت بھی خود ہی کرتا تھا۔ اس طرح بال بچوں کی کسی نہ کسی طور گزر بسر ہوتی رہی۔ ان دنوں بختاور صرف گھر کا کاج کرتی تھی۔ یوں اس کو تھوڑا بہت چین حاصل تھا۔ مگر شاید وہ بھی اس کے نصیب میں نہ تھا۔ اپنی بپتا سناتے ہوئے اس نے کہا ''خدا نے مجھے دکھ سہنے کے لئے ہی اس دنیا میں بھیجا تھا۔ اس لئے خوشی کا کوئی لمحہ کیونکر مجھے نصیب ہو سکتا تھا۔'' لگتا تھا کہ اس کا دل دکھ سے بھر آیا ہے، تھوڑی دیر وہ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی کہ اس وقت کے بعد

سے اس کی بدقسمتی مسلسل بڑھتی رہی ہے۔ پہلے اس کا شوہر اچانک بیمار ہوگیا۔ تین روز بعد بھوا پور سے رمضان نامی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا صغیر علی کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر بختاور کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے بچے بہت چھوٹے تھے اور محنت مزدوری نہ کر سکتے تھے۔ جب کہ خود اس کو سماجی بندھن بازار تک جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اسنے دوا لانے کے لئے اپنے دیور کی منتیں کیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کا سسر صغیر علی کو دیکھنے کے لئے ایک بار بھی نہ آیا۔ لاچار بختاور نے دوائیں لانے اور ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ہمسایوں کی منت کی۔ ڈاکٹر اور دوائی کے اخراجات کے لئے اس نے اپنی شادی کا زیور بیچ ڈالا۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ مجبور ہو کر بختاور نے آئندہ استعمال کے لئے رکھا ہوا دھان بھی فروخت کر دیا اور کچھ رقم اپنے بھائیوں سے مانگی۔ اس طرح جب اس کے پاس تھوڑے بہت پیسے اکٹھے ہو گئے تو بختاور نے صغیر علی کا علاج شروع کروایا، مگر اس کا بخار تین ماہ تک ختم نہ ہوا۔ پھر جب بخار ختم ہوا تو صغیر علی نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کی کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا۔ بس بستر کا ہی ہو رہا۔ کئی روز یونہی گزر گئے اور آخر کار وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔ تندرستی کے آثار پھر بھی نمایاں نہ ہوئے۔ اس کا وزن تیزی سے کم ہونے لگا اور اس کا جسم ہر وقت کانپنے لگا۔ تب سے اس کی یہی کیفیت ہے۔ جب وہ کھڑا ہوتا ہے، لڑکھڑانے لگتا ہے۔ توازن کھو دیتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ وہ دو کلو کا وزن بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی حالت دیکھ کر بختاور کڑھنے لگی۔ کبھی کبھی اس کا دل اس قدر پریشان ہو جاتا کہ وہ دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جانے کا سوچنے لگتی۔ اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اپنے شوہر کے مصائب کا باعث وہ خود ہے۔ اس کے سسرال والے اس کو منحوس کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ دوسری طرف سسرال والے اب بھی سارا الزام بختاور کے سر ہی تھوپتے تھے۔ گھوڑوں کی موت سے لے کر صغیر علی کی دردناک حالت تک کے تمام مصائب کی جڑ اس کو قرار دیتے تھے۔ قدرے سکون کے لمحوں میں البتہ بختاور سوچتی کہ آخر وہ دوسروں کے عذاب کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر بھی وہ لوگوں کے لعن طعن کو خاموشی سے برداشت کرتی رہی اور اس کی معذور شوہر نے زندگی کی جدوجہد جاری رکھی۔

بیتے ہوئے زمانوں کو یاد کرتے ہوئے بختاور نے ہمیں بتایا کہ گاؤں کے چوہدری اور دوسرے با اثر لوگ اس کو کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ گاؤں کی کسی تقریب میں اس کو

بلایا نہیں جاتا تھا۔ اس جیسے لوگوں کو تو بس غیر ضروری اور ناگوار ہی سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی ایک ایسا موقع آ گیا جب اچانک ایسے لوگوں کو اہمیت دی گئی۔ یہ انتخابات کا موقع تھا۔ تب چوہدری اکٹھے ہو کر ان لوگوں سے ووٹ مانگنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان کو ووٹ دے دیئے گئے۔ پھر جب انتخابات گزر گئے تو بختاور اور اس جیسے لوگوں کا وہی حال ہو گیا جو پہلے تھا۔ کسی نے پلٹ کر بھی ان کو نہ دیکھا۔ بختاور کا کہنا تھا کہ ''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں یہ کھیل دیکھ رہی ہوں اور اب تو میں اس کو اچھی طرح سمجھ بھی گئی ہوں انتخابات کے دن آتے ہیں تو یہ لوگ آتے ہیں اور ہم غریبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں۔ جب مطلب نکل جاتا ہے تو کبھی ہماری پرواہ نہیں کرتے۔

بختاور نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ زندگی کے نشیب و فراز میں اس کے کئی غریب ہمسایوں نے اس کی مدد کی تھی۔ اس کو اپنے دو بچوں کی تجہیز و تکفین یاد تھی۔ ان موقعوں پر سارے کام انہی لوگوں نے کئے تھے۔ اسی طرح صغیر علی کی بیماری کے ایام میں بعض غریب ہمسائے ڈاکٹر کو لانے اور دوا خرید کر لانے میں اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ لیکن گاؤں کے کسی امیر آدمی کو اس کے گھر آنے یا اس کے ساتھ کوئی ہمدردی دکھانے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ البتہ اس قسم کے امیر لوگ اس کے سسر کے گھر جایا کرتے تھے جس کے ان کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اس کے سسر کے گھر جب کوئی تقریب ہوتی تو وہ اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح امیر لوگ اس کے سسرالی عزیزوں کو اپنی تقریبات میں مدعو کیا کرتے تھے۔ اس پر بختاور کا تبصرہ یہ تھا کہ ''امیر امیروں کے یار ہوتے ہیں۔ غریبوں سے ان کا کیا ناطہ ہے۔''

دکھ درد کے اس زمانے میں بختاور کی بدقسمتی حد سے بڑھ گئی تھی۔ جو مدد کر سکتے تھے، انہوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ اس کو قرض دینے پر بھی تیار نہ تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اس پر اعتبار نہ تھا۔ ایک دو آدمی مدد پر تیار تھے، لیکن بختاور کو ان کی نیت پر شک تھا۔ چنانچہ وہ ان سے دور ہی رہی۔ کہنا تھا کہ '' ان امیر لوگوں کو جب بھی موقع ملتا ہے، یہ ہمیں ڈس لیتے ہیں۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔'' یوں بختاور کی زندگی کم و بیش فاقہ کشی میں گزر رہی تھی۔ کھانے کو جو کچھ اس کو اور اس کے خاندان کو ملتا تھا، اس کو خوراک کہنا ہی غلط ہے۔ آخر کار جب مصیبتیں حد سے باہر ہو گئیں اور اس میں برداشت کی ہمت نہ رہی تو بختاور نے اپنے بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ مگر وہ بھی برائے نام ہی مدد کر سکتے تھے۔ بختاور کو ان

MashalBooks.org

سے بار بار مانگنے پر شرم بھی آتی تھی۔ ایک بار اس نے ہمسایوں سے قرض کے طور پر بڑی رقم مانگ لی۔ مگر وہ اس قرض پر کوئی سود ادا کرنے کے قابل نہ تھی۔ ہمسایوں کے پیسے لوٹانے کے لئے وہ اپنی مرغیاں اور بکریاں بھی فروخت کرنے لگی۔ گرامین بینک سے قرض حاصل کرنے سے پہلے اس نے اپنی آخری بکری فروخت کر کے ہمسایوں کی رقم لوٹا دی۔

گزشتہ چند برسوں میں بختاور کے سسر کے گھر صغیر علی کی ایک بہن اور دو بھائیوں کی شادی ہوئی تھی۔ ان موقعوں پر وہاں بڑے جشن منائے گئے تھے۔ لیکن بختاور اور اس کے خاندان کو ان شادیوں میں بلایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ بس دور سے تماشا دیکھتے رہے۔ البتہ صغیر علی کو ان لوگوں نے شرکت کی دعوت دی تھی مگر اس نے اپنے بال بچوں کے بغیر وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بختاور جب ہم کو یہ قصہ سنا رہی تھی تو صغیر علی بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ کہنے لگا ''اس کو دعوت نہ کہیۓ۔ یہ تو ایک توہین تھی۔ میں اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کی شادی میں کیسے شریک ہوسکتا تھا؟ آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ اس طرح بھی کسی کو بلایا جاتا ہے! بختاور بتانے لگی کہ اس کی نند کی شادی پر برات کے ساتھ ۱۲۳ افراد آئے تھے۔ ان کے کھانے کے لئے ایک بکری ذبح کی گئی تھی۔ اس کا دولہا میٹرک پاس تھا اور بعد میں اس نے پی ٹی آئی کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لیکن شادی کے وقت تک اس کو ملازمت نہیں ملی تھی اور وہ اپنے گاؤں میں کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ شادی کے موقع پر دلہن کو زیور دیا جاتا ہے، مگر اس کی نند کو زیور کے بجائے ایک ہزار (بنگلہ دیشی) روپے دیئے گئے تھے۔ بعد میں جب صغیر علی کے ایک بھائی کی شادی ہوئی تو دولہا کو دلہن والوں نے پانچ ہزار روپے کی سلامی دی تھی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اس قدر بڑی رقم دینے کے لئے دلہن کے باپ کو اپنی زمین بیچنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ یہ قصہ سناتے ہوئے بختاور کے چہرے پر بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ مچھلی کو مچھلی کے تیل میں تل لیا جائے۔''

1974ء کے قحط کی یادیں بختاور کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئیں۔ اس کو وہ دن یاد ہیں اور یہ بات بھی نہیں بھولی کہ ان دنوں اس کا شوہر اچھا بھلا تھا اور آج کی طرح معذور نہ تھا۔ تاہم حالات واقعی ہولناک تھے۔ چیزوں کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ آٹے چاول کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ قحط کے اس سارے زمانے میں اس خاندان کو ایک بار بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ نیم فاقہ کشی کے دن تھے۔ کبھی کبھی

MashalBooks.org

وہ دن میں صرف ایک بار روٹی کھاتے۔ ایسے دن بھی آتے جب کچھ بھی کھانے کو نہ ملتا۔ ایک بار تو ان لوگوں کو مسلسل سات روز تک آٹا گھول کر پینا پڑا۔ بختاور کھیتوں سے جڑی بوٹیاں توڑ لاتی اور ان کو ابال کر یہ خاندان پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتا۔ ان ہولناک دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بختاور کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے کہا ''ہماری تو بات جانے دیجئے، کسی نہ کسی طور گزارہ کر لیتے تھے۔ لیکن بچوں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ میں ان کو کھانے کے لئے کچھ نہ دے سکتی تھی۔ نہ ہی ان کے لئے میرے پاس کپڑے تھے۔ وہ تو بس بھوکے ننگے ہی رہتے تھے۔''

چند لمحے بعد بختاور نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور کہنے لگی۔ بچوں کا ذکر جانے دیجئے۔ تن ڈھانپنے کے لئے میرے پاس بھی کیا تھا؟ بس ایک پھٹی پرانی ساڑھی تھی جو میں مہینوں سے پہنے رکھتی۔ مجھے اس قدر شرم آتی کہ لوگوں کے سامنے جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔'' بات جاری رکھتے ہوئے بختاور نے بتایا کہ یہ وہی سال تھا جب اس نے ہمسایوں سے قرض حاصل کیا تھا اور رقم کی واپسی کے لئے اس کو اپنی ہر شے بیچنی پڑی تھی۔

1980ء میں پھر سیلاب آ گیا۔ سارا گاؤں پانی سے ڈوب گیا۔ بختاور کی جھونپڑی کے سامنے میدان تھا اور وہ بھی پانی میں ڈوب گیا تھا۔ قریبی بازار میں بھی پانی ہی پانی تھا۔ دکانداروں نے بختاور کے گھر کے پاس پکی سڑک پر اپنی دکانیں لگا لی تھیں۔ سیلاب کے ان دنوں میں عام حالات کے مقابلے میں بختاور اور اس کے گھر والوں کے مصائب کئی گنا بڑھ گئے تھے۔ تاہم 1974ء جیسی صورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب انہوں نے گرامین بینک کی خدمات سے فائدہ اٹھانا سیکھ لیا تھا۔ پھر بھی سیلاب کے باعث چاول کی خرید وفروخت بہت مشکل ہو گئی تھی۔ تاہم دوسرے لوگوں کی مدد سے بختاور نے منڈی سے دھان خریدا، اس کو چھانا اور صاف کیا اور فروخت کرنے کے لئے ایک روز بازار لے گئی۔ سیلاب کے باعث چیزوں کی نقل وحرکت بہت دشوار ہو گئی تھی۔ اس لئے کاروبار عام طور پر ٹھپ تھے۔ لہٰذا بختاور کو اس کی محنت کا مناسب صلہ نہ مل سکا۔ چنانچہ اس نے بینک سے ملنے والے قرضے کا ایک حصہ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے پر صرف کر دیا۔

بختاور کو اپنے وطن بنگلہ دیش کی آزادی کے سال کے واقعات بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ یہ آزادی 1971ء میں ملی تھی۔ تاہم اس کو بنگلہ دیش کے قیام کے لئے ہونے والی

جنگ کے حقیقی اسباب کا زیادہ علم نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ اب بھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔

بختاور کی دوسری بیٹی اسی سال پیدا ہوئی تھی۔ ایک روز اس نے سنا کہ ملک میں جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اچانک ٹنگائیل کے علاقے سے بہاری آنے لگے۔ وہ بھوا پور بازار کی قریبی سڑک سے گزرتے بختاور کو ان کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور ان لوگوں نے پہلے ہی گھر چھوڑ دیا تھا۔ خیر، بہاری آ گئے اور انہوں نے لوگوں کو بہت تنگ کیا۔ ان کے جانے کے بعد بختاور اور اس کے گھر والے واپس آ گئے اور واقعہ کے بعد بہاری کئی بار آئے۔ پنجابی بھی آئے اور انہوں نے بھوا پور بازار کو نذر آتش کر دیا۔ ایسے تمام موقعوں پر بختاور، اس کا شوہر اور بچے گھر سے بھاگ جاتے اور گاؤں کے اندر محفوظ جگہوں پر پناہ لے لیتے۔ بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ کے نو مہینے اسی طور بسر ہوئے۔ بختاور نے ایک روز اپنی پناہ گاہ سے پاکستانی فوجیوں کو آتے دیکھا۔ کئی بار اس نے بنگلہ دیش کے قیام کے لئے لڑنے والوں کو بھی یونہی دیکھا تھا۔ اس کے بہت سے ہمسائے اس جدوجہد میں شامل ہو گئے تھے۔ جب اس نے آزادی پسندوں کو دیکھا تو ہمدردی اور شفقت کے جذبے سے اس کا دل بھر آیا۔ گاؤں کے تمام لوگ ان کی حمایت کرتے تھے اور ان کے لئے خوراک کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ بختاور نے ہمیں بتایا کہ اس کے گاؤں میں کوئی رضا کار نہ تھا۔ اس کو یہ بھی یاد تھا کہ اگرچہ جنگ کے دنوں میں اس کے خاندان کو کئی بار گھر سے بھاگنا پڑا تھا۔ لیکن بھوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدوجہد کے ان مہینوں میں لوگوں میں ایک دوسرے کے ساتھ سانجھ اور ہمدردی کے جذبے بیدار تھے۔

بختاور کو معلوم نہیں کہ آیا اس کے گردوپیش میں کوئی ساہوکار بھی تھا کہ نہیں۔ اس کی رائے تو بس یہ ہے کہ ''مالدار لوگ ہمارے جیسوں پر اعتبار نہیں کرتے۔'' لہٰذا کسی ساہوکار سے قرض لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ساہوکار قسم کے لوگوں سے کبھی اس کا سامنا بھی نہ ہوا تھا۔ چنانچہ بختاور کا کہنا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی جس کا کاروبار دوسرے لوگوں کو سود پر رقم دینا ہو۔ اس نے تو سن رکھا تھا کہ ماضی میں اس قسم کا کوئی نظام موجود ہوا کرتا تھا۔ اس نے اس قسم کے قصے بھی سن رکھے تھے کہ ایک روپیہ قرض دینے والے دس روپے وصول کیا کرتے تھے اور جب قرض دار رقم کی واپسی کا انتظام نہ کر سکتے تھے تو پھر ساہوکار ان کی

زمین اور جائیداد فروخت کر لیا کرتے تھے۔

گرامین بینک کے ساتھ رابطہ قائم ہونے سے پہلے بختاور کی حالت کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ہی تکلیف دہ حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ خاص طور پر اس کے شوہر کے اپاہج ہونے کے بعد اس کی حالت دردناک ہو گئی تھی۔

انہی دنوں گرامین بینک نے بھواپور میں اپنی شاخ کھولی۔ اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد بختاور کو عباس سے اس بنک کے بارے میں علم ہوا۔ عباس پکی سڑک کے مشرق میں نزدیک ہی رہتا تھا۔ بختاور کو اس بنک کے طریقہ کار کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ تھیں۔ پھر بھی اس کے دل میں امنگ سی پیدا ہونے لگی کہ وہ اس بنک سے رقم حاصل کر کے اپنے حالات بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ تاہم اس میں فیصلے کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ تذبذب کے عالم میں تھی اور دل میں کئی خوف اور وسوسے بھی پیدا ہوتے تھے۔ اصل میں اس کو یقین نہ آتا تھا کہ غریب لوگوں کی مدد کرنے والا کوئی ایسا ادارہ بھی ہو سکتا ہے۔

بعدازاں جب اس کو اچھی طرح علم ہو گیا کہ گرامین بینک اس جیسے نادار اور بے سہارا لوگوں کو امداد دیتا ہے تو پھر وہ اس کو بار بار یہ خیال آنے لگا کہ آیا وہ بھی بنک سے پیسے لے سکتی ہے؟ ہفتہ بھر وہ اس بارے میں سوچتی رہی۔ رات رات بھر وہ انہی خیالوں میں گم رہتی۔ آخر کار اس نے اپنے شوہر سے اس معاملے پر صاف صاف بات کی۔ اس نے بختاور کو حوصلہ دیا۔ شوہر کے سوا بختاور نے کسی اور سے اس معاملے پر کوئی مشورہ نہ کیا۔ شکوک وشبہات اس کو دوسروں سے بات کرنے سے روکتے تھے۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں دوسرے لوگ اس کو گمراہ نہ کر دیں۔ پھر بھی آخر میں اس نے اپنے بڑے بھائی سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ ساری بات سن کر وہ کہنے لگا۔ ''بی بی تم میں ہمت ہے تو قرضہ ضرور لے لو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہاری نیک نامی پر حرف نہ آئے۔ عزت وآبرو سے اپنا کام کرنا۔'' یوں بختاور نے گرامین بینک سے قرضہ حاصل کرنے کا تہیہ کر ہی لیا۔

اب دوسری باتیں بختاور کی توجہ کا مرکز بننے لگیں۔ بنک سے قرض لینے کے لئے اس کو ایک گروپ بنانے کی ضرورت تھی۔ اس دوران اس کے پڑوس میں ایک گروپ پہلے ہی بن گیا تھا۔ بختاور کو اس میں شامل نہ کیا گیا تھا۔ اصل میں وہ اس قدر غریب تھی کہ کوئی اس کو گروپ میں شامل کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا حالانکہ بختاور ان لوگوں سے مل کر گروپ میں شامل

MashalBooks.org

ہونے کی خواہش ظاہر کرتی رہی تھی۔ جب پوری طرح انکار ہو گیا تو بختاور کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ گھر آ کر وہ اپنی قسمت کو کوسنے اور زار و قطار رونے لگی۔ صغیر علی کا دل بھر آیا۔ اس نے اپنی بیوی کو دلاسہ دیا اور صبر کی تلقین کی۔ لیکن بختاور کو لگتا تھا کہ اس کے مقدر میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں۔ ساری عمر یونہی مایوسی کی تاریکیوں میں بھٹکتی رہے گی۔

گھنٹوں رونے کے بعد لگا تھا کہ بختاور کی قسمت کروٹ لینے لگی ہے۔ ہوا یوں کہ بنک سے قرضہ حاصل کرنے کے لئے جو گروپ بن رہا تھا، اس کا ایک رکن الگ ہو گیا۔ اس پر گروپ کے باقی چار ارکان بختاور کے گھر آئے اور اس کو آسیہ خاتون کے گھر لے گئے۔ وہاں بختاور نے گروپ میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن واپسی پر ایک نا معلوم جذبے نے اس کو مغلوب کر لیا اور وہ خوف سے کانپنے لگی۔ پہلے جب دوسروں نے اس کو گروپ میں لینے سے انکار کر دیا تھا تو وہ چیخی چلائی تھی اور خدا سے مدد کی التجا کی تھی۔ لیکن اب جب کہ دوسرے لوگ نا قابل توجیہہ خوف اس پر طاری ہو گیا تھا۔ اس کو لگا جیسے گروپ میں شامل ہونے کی حامی بھر کے اس نے کوئی غلطی کی ہو۔ دو تین دن وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا رہی۔ ایسے میں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہ تھا۔ وہ صرف شوہر پر بھروسہ کرتی تھی اور شوہر حسب معمول اس کی بھر پور حمایت کر رہا تھا۔ آخر کار بختاور نے تمام خوف اور وسوسوں کو جھٹکا۔ مقررہ دن وہ گروپ کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئی اور رکنیت کے فارم پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔

ابتداء میں گروپ کے قواعد وضوابط بختاور کو بڑے عجیب وغریب لگتے تھے۔ اس سے پہلے زندگی میں کبھی وہ کسی اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور نہ ہی کبھی دستخط کئے تھے۔ پہلی بار وہ ان مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ رقم حاصل کرنے کے لئے بنک کے دفتر بھی جا پہنچی۔ یوں سمجھئے کہ یہ اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کو احساس ہوا کہ وہ بھی دوسروں کی طرح انسان ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ قسطوں کی ادائیگی، ہفتہ وار بچت کے حساب کتاب، مرکز اجلاسوں میں شرکت اور علاقے سے باہر کے دورے کے لئے مرکزی سربراہ سے اجازت حاصل کرنے جیسے کام بختاور کو بہت اچھے لگے۔ اب اس کی رائے یہ بن گئی تھی کہ ''غریب لوگوں میں نظم وضبط نہیں ہے۔ ہم جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ اگر گروپ اور مرکز کے لئے قواعد وضوابط نہ بنائے جاتے تو پھر ہم ہاتھ

MashalBooks.org

آنے والی رقم کو یونہی خراب کر دیتے۔''

گروپ میں شامل ہونے کے چھبیس روز بعد گرامین بینک نے بختاور کو قرض کی رقم دے دی۔ بختاور نے مجھے بتایا کہ برہٹی یونین کے علاقے میں اس کا گروپ عورتوں کا پہلا گروپ تھا۔ اس کے علاوہ اس کا گروپ عورتوں کے ان پہلے گروپوں میں شامل تھا جس کو اس بنک سے امداد حاصل ہوتی تھی۔ سب سے پہلے بختاور اور آسیہ خاتون کو رقم ملی تھی۔ بختاور کو چھ سو بنگلہ دیشی روپے ملے تھے۔ رقم لینے کے لئے عورتیں مل کر بنک کی بھوا پور برانچ گئی تھیں۔ بختاور کو دھان کا بھوسا اتارنے اور سرخ مرچوں کا کاروبار کرنے کے لئے قرض درکار تھا۔ بینک سے ملنے والی رقم کے بارے میں وہ بہت محتاط تھی۔ اس کو یہ خدشہ رہتا تھا کہ اگر کاروبار میں نقصان ہو گیا اور یہ رقم لوٹا نہ سکی تو پھر کیا کروں گی۔ خیر چھ سو روپوں میں سے اس نے تیس روپے گروپ ٹیکس ادا کیا۔ یوں اس کے پاس 570 روپے رہ گئے تھے۔ اس رقم سے اس اپنا کاروبار شروع کیا اور منافع حاصل کرنے پر خاص توجہ دی۔ چند ہی دنوں میں اس کے سارے اندیشے دور ہو گئے۔ چنانچہ اور زیادہ رقم حاصل کرنے کے لئے وہ خود بنک مینجر کے پاس گئی۔ اس درخواست کے تین ماہ بعد بنک نے اس کو مزید چھ سو روپے دے دیئے۔ یوں اس کا کاروبار بڑھ گیا۔ بارہ سو روپے کی رقم سے اس کا دھان کا بھوسا اتارنے اور سرخ مرچیں فروخت کرنے کا کام پہلے سے زیادہ ہونے لگا۔ دوسری طرف جب سے بختاور گرامین بینک کے گروپ کی رکن بنی تھی۔ خاندان کے اندر اور باہر سے اس پر اور بھی زیادہ نکتہ چینی ہونے لگی تھی۔ سسرالی عزیزوں نے مصیبت کے زمانے میں کبھی اس کی خبر بھی نہ لی تھی۔ لیکن اب وہ بختاور کو طرح طرح کی باتوں سے ڈرانے لگے۔ اس کے سسر نے تنبیہ کی کہ ''جو رقم تم نے بنک سے لی ہے وہ کبھی واپس نہ کر سکو گی۔ اس طرح ہم سب کے لئے مصیبت بن جاؤ گی۔'' مگر بختاور نے اس قسم کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں مگن رہی۔ سسر چونکہ بختاور کو روک نہ سکتا تھا، اس لئے وہ اس کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ خاندانی عزت و آبرو کے سوال اٹھانے لگا، گویا بختاور نے بنک سے قرض لے کر بداخلاقی کا مظاہر کیا تھا۔

گرامین بنک گروپ میں بختاور کی شمولیت پر اس کے ہمسایوں کا ردعمل ملا جلا تھا۔ بعض تو ناک بھوں چڑھانے لگے تھے جب کہ دوسروں کا خیال تھا کہ اس نے درست قدم اٹھایا ہے۔ غریب لوگ بختاور کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن گاؤں کے چوہدری اس کی شدید

خلاف ہو گئے تھے۔ گاؤں کے ملا اور دوسرے مذہبی لوگوں کو بھی بختاور کا طرز عمل نا گوار گزرا تھا۔ ان کو اس بات کا غصہ آ رہا تھا کہ عورتیں اس قدر آسانی سے گروپ کی رکن بن سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ کام ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ یہ کافروں والی حرکتیں ہیں کہ عورتیں رقم حاصل کرنے بھوا پور جاتی ہیں، مردوں سے ملتی جلتی ہیں، معاملات طے کرتی ہیں اور اجلاس بھی کرتی ہیں۔ اس سے پردے کی بے حرمتی ہوتی ہے۔'' ان میں سے بعض یہاں تک کہنے لگے کہ ''یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اسی لئے بے راہ روی پھیل رہی ہے اور لوگ مذہب سے ہٹ گئے ہیں۔'' خود گرامین بنک کے بارے میں بھی گاؤں میں بہت سی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا کہ یہ بنک والے پہلے تو قرضہ دیں گے اور پھر قرض داروں کو سندربن کے جنگلوں میں لے جائیں گے۔ کسی نے گرہ لگائی کہ عورتوں کو قرضے اس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ ان کو شیروں کا لقمہ بنایا جائے۔ لوگ کہتے کہ بینک والوں کے ارادے ناپاک ہیں اور کوئی ڈراتا کہ جو قرض واپس نہ کر سکے گا اس کو جیل میں پھینک دیا جائے گا۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں والا معاملہ تھا اور بعض لوگ بڑھ چڑھ کر بنک کے بارے میں افواہیں پھیلا رہے تھے۔

ان باتوں سے بے نیاز ہو کر کام جاری رہا۔ گرامین بنک سے قرضے جاری ہوتے رہے۔ چنانچہ گاؤں کے چوہدری اس کی مخالفت کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ ایک روز وہ مل کر بنک مینجر سے ملنے گئے۔ انہوں نے مینجر کو تنبیہ کی کہ ان غریب عورتوں کو قرضہ نہ دیا جائے۔ ''اگر تم نے کو قرض دیا تو وہ تمہاری رقم کبھی واپس نہ کر سکیں گی۔ ہماری مرضی کے بغیر قرض دیا تو پھر رقم کی واپسی کے لئے ہمارے پاس نہ آنا۔'' سنا ہے کہ بینک مینجر نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور چوہدری مایوس ہو کر واپس ہو گئے۔

ان تمام رکاوٹوں کے سامنا کرتے ہوئے بختاور نے گروپ کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ وہ گروپ کے اجلاس میں شریک ہوتی، قرضے کی اقساط ادا کرتی اور ضرورت پڑنے پر بھوا پور جاتی رہی۔ پہلی بار عورتوں کو رقم دیتے ہوئے مینجر نے ان کو جتلا دیا تھا کہ یہ رقم کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے نہیں ہے۔ رقم اسی مقصد پر صرف ہونی چاہیئے جس مقصد کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ بختاور پر یہ لفظ بجلی بن کر گرے تھے۔ وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ اس کو یہ خیال آ رہا تھا کہ اس کا شوہر اپاہج ہے۔ وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ اس

نے سوچا ''اگر میں مناسب طور پر رقم واپس نہ کر سکی تو مینجر صاحب یہی سوچیں گے کہ ہم غریبوں کے ہاتھ رقم لگی تو ہم نے کھانے پینے میں اڑا دی ہے۔'' چنانچہ اس خیال کے پیش نظر بختاور اور بھی محتاط ہو گئی۔ وہ ایک ایک پیسہ سوچ سمجھ کر خرچ کرنے لگی، حالانکہ قرض حاصل کرنے والی بعض دوسری عورتیں اس قدر محتاط نہ تھیں۔

بختاور کو رقم جمعرات کو ملی تھی۔ ہفتے کے روز اس نے بازار سے 128 روپے من کے حساب سے چار من دھان خریدا۔ گھر لا کر اس نے دھان کو دھویا، سکھایا، بھوسا الگ کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک من دھان سے ساڑھے ستائیس سیر چاول حاصل ہوئے۔ یہ چاول اس نے 228 روپے من کے حساب سے فروخت کر دیئے۔ اس طرح بختاور کو ایک سو چار روپے منافع حاصل ہوا۔ یہ ایک بڑی رقم تھی چنانچہ اس قدر منافع حاصل ہونے سے بختاور کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ جہاں تک خرید و فروخت کے اخراجات کا تعلق ہے، وہ بہت کم تھے۔ منڈی سے دھان گھر تک لانے اور گھر سے چاول منڈی تک لے جانے کے کام میں بختاور کی بیٹیاں اس کی مدد کرتی تھیں۔ بختاور ان کو بسکٹ خریدنے کے لئے پچیس پیسے دے دیتی۔ تاہم دھان کو ابالنے اور صاف کرنے کا سارا کام وہ خود ہی کرتی تھی۔ تاہم 1980ء کے سیلاب کے موقع پر پانی اس کے صحن میں بھر گیا تھا اور بختاور کو دھان چھڑنے کا کام مشین کے ذریعے کروانا پڑا تھا۔ اس طرح اس کا منافع نسبتاً کم ہو گیا تھا۔ بختاور نے مجھے بتایا کہ اپنے کاروبار میں اس کو صرف ایک بار گھاٹا ہوا تھا۔ اس بار بھوسا الگ کرنے کے عمل میں چاول کے دانے ٹوٹ گئے تھے۔ لہٰذا وہ بہت کم قیمت پر فروخت ہوا تھا۔

چاول کے کاروبار کے علاوہ بختاور نے اپنے شوہر کو سرخ مرچوں کا کام بھی جاری رکھا ہے۔ شروع میں وہ دو تین روپے سیر کے حساب سے مرچیں اور چار روپے سیر کے حساب سے فروخت کیا کرتی تھی۔ کام کے دنوں میں وہ کم از کم دس سیر مرچیں روز بیچ لیتی تھی۔ گزشتہ موسم سے اس نے عبدل اور جبار نامی اپنے ہمسایوں کے ساتھ مل کر ڈھاکہ سے تربوز اور کھیرے خریدنے اور مقامی منڈی میں فروخت کرنے کا کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ خود یہ چیزیں خریدنے ڈھاکہ نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسا شخص ہے جو یہ کام کر سکے، لہٰذا عبدل اور جبار نے یہ کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ بختاور بس یہ کرتی ہے کہ وہ خرچ ہونے والی رقم میں سے اپنا حصہ ادا کر دیتی ہے۔ فروخت کے وقت اس کا شوہر یا بیٹیاں

منڈی میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کاروبار سے اس کو تیس چالیس روپے ہفتے کے حساب سے منافع مل جاتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر ڈھاکہ سے مال لانے میں کوئی عزیز اس کی مدد کرنے کے قابل ہوتا، تو منافع بڑھ بھی سکتا ہے۔

اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے بختاور نے مجھے بتایا کہ برسات کے موسم میں کاروبار عام طور پر مندہ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارشوں کے سبب دھان کو خشک کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بنک سے ملنے والے قرض سے اسے نے اپنے کاروبار میں رقم لگانے کے علاوہ چار چھوٹی بکریاں بھی خریدیں ہیں۔ اس کی دو بیٹیاں آمنہ او ملکہ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ وہ منڈی سے دھان اور مرچیں گھر لانے اور پھر چاول اور مرچوں کو فروخت کرنے کے غرض سے بازار تک لے جانے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔ بختاور کا کہنا ہے کہ اس کی دونوں چھوٹی چھوٹی بیٹیاں جواں مردوں کی طرح کام کرتی ہیں۔ اس کا شوہر بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ معذور ہونے کے باوجود وہ گاؤں کے پاس لگنے والے منڈی میں جاتا رہتا ہے۔ اس لئے بختاور بجا طور پر یہ کہتی ہے کہ بیٹیوں اور شوہر کی مدد کے بغیر کاروبار جاری رکھنا اس کے لئے بہت مشکل ہوتا۔

بنک کو رقم کی واپسی کی ہفتہ وار قسطوں کے بارے میں بختاور نے مجھے بتایا کہ اب تک اس کو اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ عام طور پر وہ اپنے منافع میں قسط ادا کر دیتی ہے۔ البتہ جب کبھی منافع میں سے کوئی رقم نہیں بچتی یا کاروبار مندا رہتا ہے تو وہ اصل رقم میں سے قسط ادا کر دیتی ہے۔ گروپ کی سرگرمیوں میں بھی وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ستوش کے مقام پر گرامین بنک کا حال ہی میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا تو وہ اس میں بھی شرکت کے لئے گئی تھی۔ گروپ کے اجلاس ہر ہفتے ہوتے ہیں اور بختاور ان میں باقاعدگی سے شریک ہوتی ہے۔ البتہ جب اس نے اپنے آخری بچے کو جنم دیا تھا تو دو ہفتوں تک گھر میں بند رہی تھی اور مرکزی اجلاس میں شریک نہ ہو سکی تھی۔ تاہم اس نے اپنی بڑی بیٹی کو قسط کی رقم دے کر وہاں بھیج دیا تھا۔

بختاور خوش مزاج عورت ہے اور اس کو باتیں کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مرکز یا گروپ میں وہ سب کے ساتھ خوش دلی سے پیش آتی ہے اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ دوسرے لوگ بھی اس کو پسند کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آتے ہیں۔

البتہ گزشتہ برس جب بختاور کو دوبارہ چھ سو روپے کی رقم ملنے والی تھی، تو اس کے گروپ کی ایک عورت سلیقہ بیگم نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وجہ سے کچھ عرصے کے لئے دونوں کے درمیان تعلقات کچھ خراب سے رہے تھے۔

پہلا قرضہ بختاور نے ہفتہ وار قسطوں کے ذریعے ادا کر دیا ہے۔ جب اس نے بنک کو ساری رقم لوٹا دی تو وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ اس کو یوں لگا جیسے اس نے سارا جہان فتح کر لیا ہو اور بہت بڑی آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزر گئی ہو۔ بنک مینجر بھی بہت خوش ہوا۔ بختاور اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

بختاور نے کاروبار سے کوئی بڑی رقم نہیں کمائی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کی ذاتی بچت اب بھی بہت تھوڑی ہے۔ اس کو امید ہے کہ آئندہ دس برسوں میں اس کے پاس کافی رقم ہو جائے گی۔ اس طرح وہ کوئی بڑا کاروبار کر سکے گی۔ اور کچھ نہیں تو وہ اپنے گھر کے پاس کوئی دکان کھول لے گی۔ صغیر علی اس دکان کو چلا سکے گا۔

کامیابی سے قرضہ واپس کرنے کے بعد بختاور کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس وقت تک گردوپیش پھیلنے والی افواہوں کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ کوئی افواہ باقی تھی بھی تو اب بختاور کو پرواہ نہ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دو ہزار روپے کا قرض کے لئے بنک کو درخواست دے دی۔ اتنی بڑی رقم کو اس کو اپنا چاول کا کاروبار جاری رکھنے کے علاوہ اپنی زمین کو پانی دینے کے لئے ٹیوب ویل خریدنے کی خاطر درکار تھی۔ ٹیوب ویل کی اس کو ایک عرصے سے خواہش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گاؤں میں جن لوگوں کے پاس ٹیوب ویل تھے وہ اکثر اوقات بختاور کو ان کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے۔ بختاور نے نئے قرضے کے لئے درخواست تو دے دی مگر مینجر نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ البتہ اس نے بختاور سے وعدہ کیا کہ وہ ٹیوب ویل رکھنے والے اس کے ہمسایوں سے بات کرے گا اور ان کو آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ ضرورت کے وقت بختاور کو ٹیوب ویل سے پانی حاصل کرنے کی اجازت دے دیں۔ جلد ہی وعدے کے مطابق مینجر صاحب نے متعلقہ لوگوں سے بات کی اور وہ مدد پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی زمین کے لئے پانی حاصل کرنے میں بختاور کو بھی کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

اس واقع کے بعد بنک نے بختاور کو ایک ہزار روپے کا قرض دے دیا۔ اس رقم سے اس نے دھان اور مرچوں کے علاوہ کھاد بھی خریدی۔ اس نے زمین کے لئے اچھا بیج

خریدا اور ایک شخص کو کھیتی باڑی کے کام میں مدد دینے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ اس سارے معاملے پر اس کے تین سو روپے خرچ ہوئے۔ اس ایک ہزار روپے کا قرض واپس کرنے کے بعد بختاور کا ارادہ ہے۔ کہ وہ گرامین بینک سے تیسری بار تین ہزار روپے کا قرض حاصل کرے گی۔ اس رقم کا کچھ حصہ وہ اپنے چاول کے کاروبار میں لگائے گی اور باقی رقم سے ایک گائے خریدے گی۔ جب وہ مجھے اپنے مستقبل کے ان منصوبوں کے بارے میں بتا رہی تھی تو اس کے چہرے کے تاثرات اور آواز میں اعتماد تھا۔

میں نے بختاور سے ایک سوال پوچھ لیا۔ ''اچھا بھئی ذرا یہ تو بتاؤ کہ گرامین بنک کو قائم رکھنے میں تم کیا کردار ادا کر سکتی ہو؟ سوال سنتے ہی بختاور کے چہرے کے تاثرات بدل گئے لگتا تھا کہ یہ سوال اس پر بجلی بن کر گرا ہے۔ پریشانی کے عالم میں وہ پوچھنے لگی کہ کیا یہ بنک بند ہونے والا ہے؟ اس کی آواز میں ایک شکستہ روح کی مایوسی بھری ہوئی تھی۔ خیر جب میں نے اس کو یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں، تو پھر وہ میرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے کہا '' ہمارے پاس اختیار ہی کیا ہے۔ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن اس بنک کو قائم رکھنے کی خاطر تم جو بھی کہو، میں خوشی سے کرنے پر تیار ہوں۔''

میں نے پہلے ہی اس امر کا ذکر کر دیا ہے کہ جب گرامین بنک سے پہلے پہل کام شروع کیا تو گاؤں کے لوگوں کا ردعمل ملا جلا تھا۔ کھاتے پیتے کسان، گاؤں کے چوہدری اور مولوی اس کے خلاف تھے اور اس پر بری طرح نکتہ چینی کرتے تھے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بنک کے خلاف طرح طرح کے بے بنیاد افواہیں پھیلانی شروع کر دیں اور عورتوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ عورتوں کے اس بنک کے ساتھ لین دین سے روکنے کے لئے مولویوں نے کئی فتوے دے ڈالے۔ وقت گزرنے کے بعد ان میں سے اکثر نکتہ چین خاموش ہو گئے ہیں، کیونکہ ان کو بنک کے مقاصد اور فوائد کا احساس ہو گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان ابتدائی نکتہ چینیوں میں سے کئی بنک کے حمایتی بن گئے ہیں۔ اب وہ کہنے لگے ہیں کہ ''حکومت واقعی اچھا کام کر رہی ہے۔'' خیر' اس سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کے جو لوگ ابھی تک بنک کے مخالف ہیں' ان میں بنک کے خلاف کھلے بندوں زبان کھولنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ وہ بنک کے خلاف اپنے جذبات خود تک محدود رکھتے ہیں ے۔ ان کو معلوم ہے کہ زبان کھولنے سے ان کو گرد و پیش کے تمام گروپ ممبرز کی مشترکہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بختاور کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں بعض اہم باتیں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ میرے سوالوں کے جواب میں بختاور نے بتایا کہ گزشتہ چار مہینوں سے اس کی خوراک میں گوشت شامل نہیں رہا۔ قبل ازیں بختاور اور اس کے گھر والوں نے ایک مرغ پکا کر کھایا تھا کیونکہ شوہر بیماری سے نڈھال ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کا اندیشہ تھا۔ گزشتہ چار مہینوں میں اس گھرانے سے تین چار بار مچھلی کھائی تھی۔ عام طور پر وہ لوگ صرف روٹی یا چاول یا لک نمک کے ساتھ کھاتے ہیں۔ چونکہ ان کے پاس زمین بہت تھوڑی ہے اس لئے جو چاول وہاں کاشت ہوتا ہے وہ دو تین ماہ کی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ چاول یا آٹا بازار سے خریدتے ہیں۔ اب وہ تین وقت پورا کھانا کھاتے ہیں۔

اس خاندان کو کم از کم ضرورت کے مطابق کپڑے بھی دستیاب ہونے لگے ہیں۔ قبل ازیں ان کے چھوٹے بچے ننگے ہی رہا کرتے تھے۔ بختاور کے پاس ایک ہی پھٹی پرانی ساڑھی ہوا کرتی تھی اور صغیر علی کے پاس ایک لنگی، ایک کرتا اور ایک چادر تھی۔ اب ان کے دو بیٹوں کے پاس نیکریں اور دو پرانی قمیصیں ہیں۔ بڑی بیٹی کے پاس ایک پورا لباس اور ایک جانگیا ہے۔ ان کے علاوہ بختاور کے پاس تین مرغیاں اور تین بکریاں بھی ہیں۔

گرامین بنک سے حاصل ہونے والی امداد کے سہارے بختاور اور اس کا خاندان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا ہے۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ اب وہ اس قدر منافع اپنے کاروبار سے ضرور حاصل کر لیتی ہے جس سے وہ اپنے خاندان کے روٹی کپڑے کا بندوبست کر سکے اور ساتھ ہی روزمرہ ضرورت کی دوسری چیزیں خرید سکے۔ اس نے اپنی جھونپڑی کی مرمت بھی کروالی ہے۔

ایک سو پانچ روپے خرچ کر کے بختاور نے اپنی جھونپڑی کے لئے چوبی دروازہ خریدا ہے۔ چاول اور دوسری چیزیں پکانے کے لئے اس نے دو برتن بھی حاصل کر لئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی قیمت 28 روپے اور دوسرے کی 26 روپے ہے۔ ساٹھ روپے خرچ کر کے اس نے حال ہی میں لڑکیوں کے لئے کپڑے اور بیٹوں کے جانگیے اور قمیصیں خریدی ہیں۔ اس کے علاوہ بختاور نے اپنے لئے 43 روپے کی سوتی ساڑھی اور صغیر علی کے لئے 25 روپے کی لنگی خریدی ہے۔ بیس روپے کے خرچ سے اس نے اپنی جھونپڑی پر گھاس پھوس کا نیا چھپر ڈلوایا ہے۔ اس کام کے لئے اس نے بیس روپے مزدوری بھی ادا کی ہے۔

گرامین بنک نے بختاور کے بچوں کے لئے تعلیمی مواقع بھی پیدا کئے ہیں۔ اپنی آمدنی سے اس نے بڑی بیٹی کے لئے تیس روپے اور بیٹے کے لئے ساٹھ روپے کی کتابیں خریدی ہیں۔ ان کے لئے بختاور نے پانچ روپے کی پنسلیں بھی خریدی ہیں اور سکول کو پانچ روپے امتحانی فیس کے طور پر ادا کئے ہیں۔

بختاور کے سامنے ایک منزل ہے۔ وہ غریب اور دکھ درد کی غیر انسانی زندگی سے نجات چاہتی ہے۔ وہ آنے والے وقتوں میں اپنے بچوں کا دامن خوشیوں سے بھرنا چاہتی ہے۔

MashalBooks.org

سکینہ کا نیا روپ

کھارک بنگلہ دیش کے ارسٹھ ہزار دیہات میں سے ایک ہے۔ تعلیم اور رہن سہن کے اعتبار سے آپ اس گاؤں کو بنگلہ دیش کے صدیوں سے جامد دیہی معاشرے کا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

یہ گاؤں بھوا پور صدر سے صرف تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پھر بھی کھارک بھوا پور تھانہ کے مرکز سے بالکل کٹا ہوا ہے۔ سڑک یا آمدورفت کا کوئی اور باقاعدہ وسیلہ موجود نہیں۔ اس گاؤں تک پہنچنے کے لئے کئی شکستہ بانسی پلوں اور دلدلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گاؤں میں داخل ہو کر کسی بات سے احساس نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے آخری برسوں سے گزر رہے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بیرونی دنیا سے کھارک کا کوئی ناطہ نہیں ہے۔

جولائی 1981ء کے مہینے میں کئی دن میں نے اس گاؤں میں گزارے۔ میرے وہاں جانے کا بڑا مقصد کھارک میں رہنے والی بیوہ عورت سکینہ سے ملنا تھا۔ چند سال پہلے اس کا شوہر فوت ہو گیا تھا اور وہ دکھ درد کی زندگی گزار رہی تھی۔ اب وہ گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھریلو استعمال کی چیزوں کی پھیری لگاتی ہے۔

سکینہ کے گھر تک پہنچنا آسان نہیں۔ وہاں تک جانے کے لئے کئی جگہوں پر کمر تک گہرے پانی سے گزرنا پڑتا ہے، جب کہ بعض جگہوں پر کشتی کے ذریعے ندی نالے پار کرنے پڑتے ہیں۔ میں تو یوں کہوں گا کہ سکینہ کا گھر ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے۔ پورا گاؤں چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا ہے اور گردوپیش کے دیہی علاقوں میں کٹا ہوا ہے۔ اس بدقسمت جزیرے پر چند ٹوٹے پھوٹے باڑے ہی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو تو شاید قدرے اچھی حالت میں ہوں لیکن باقی کے چار پانچ کو دیکھ کر ہی غربت کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ خیر سکینہ کا گھر ان دونوں قسموں میں شامل نہیں۔ وہ

سب سے الگ تھلگ ہے اس کی اپنی پہچان ہے۔ بانسوں کے جھنڈ کے پاس جو ایک بوسیدہ سا گھر دکھائی دے رہا تھا اس کو انسانی رہائش کے قابل سمجھنا زیادتی ہو گی۔ یہ مکان دیکھ کر مجھے بچپن میں پڑھا ہوا ایک شعر یاد آ گیا جو کچھ یوں تھا کہ

اس جھونپڑی کو مکان کہنا غلط ہے
وہ تو کسی پرندے کا گھونسلہ ہے

سکینہ کا گھر واقعی کسی پرندے کے گھونسلہ ہی ہے۔ چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا یہ گھر انسان کے آخری ٹھکانے یعنی اس کی قبر سے کچھ ہی زیادہ کشادہ ہے۔لکڑی کے چند چھوٹے ستونوں پر گھاس پھونس کا چھپر ڈال کر اس کو گھر کی شکل دی گئی ہے۔ تیز ہوا چلنے سے وہ اپنی جگہ سے مشکل سے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اس کی دو دیواریں سوکھی گھاس سے بنائی گئی ہیں اور چھوٹا سا دروازہ بھی اسی شے کا بنا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ گھاس پھونس سے اس قسم کی چیزیں بھی بن سکتی ہیں۔ اس کی باقی دو دیواریں گیہوں کے ڈنٹھلوں سے بنائی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈنٹھل کسی کی راہ نہیں روک سکتے۔ اس لئے گاؤں کے کتے بلیاں اس گھر میں منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ بارش میں سارا گھر گیلا ہو جاتا ہے خیر' سکینہ اپنے دو بچوں کے ساتھ کئی برسوں سے اس میں رہ رہی ہے۔طوفانوں اور بارشوں نے بارہا سکینہ کی اس پناہ گاہ کو روندا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ گھر چھوڑ کر ہمسایوں کے برآمدوں یا باورچی خانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے گزرے ہوئے شباب کے آثار ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لہٰذا جب وہ پناہ کی تلاش میں ہوتی ہے تو کئی شیطان صفت مرد اس کو ساتھ لے جانے کی پیش کش کرتے ہیں۔ وہ اس کی بے چارگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ مگر ہر بار سکینہ بڑے صبر اور جرات سے ان کی پیش قدمی کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان خطرات کو وہ اپنے سر پر سوار نہیں کرتی۔

جب میں پہلی بار ملنے گیا تو سکینہ گھر پر نہ تھی۔ ہمسایوں نے مجھے ایک نزدیکی بڑے گھر کی بیٹھک میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔ لیکن میں نے سکینہ کی خستہ حال جھونپڑی میں انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ اس پر وہ حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کو یہ بات عجیب سی لگی کہ میں ایک اچھی بھلی جگہ چھوڑ کر ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ سکینہ کے گھر میں دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ دو تین مٹی کے برتن، ایک ٹوٹا ہوا چمچہ، مٹی

کے تیل کا ایک دیا اور لکڑی کا ایک شمع دان اس کا کل سامان تھا۔ جھونپڑی میں ایک طرف ایک میلی کچیلی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر دو گندے لحاف اور ایک میلا چکنا تکیہ دھرا تھا۔ ان سے بُو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سکینہ آ گئی۔ وہ پانی سے گزر کر آئی تھی، اس لئے کمر تک اس کے کپڑے شرابور تھے۔ اس کی گیلی ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ مجھے دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔ مجھے اس کے دکھ کا احساس تھا۔ لہٰذا میں نے اس سے کہا کہ وہ جا کر کپڑے بدل لے۔ لیکن اس نے میری بات پر توجہ نہ دی۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس صرف ایک ہی ساڑھی ہے۔ لہٰذا بدلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ بات سن کر مجھے ندامت سی ہوئی کہ میں نے کیوں اس کو ساڑھی بدلنے کو کہا تھا۔ چند لمحوں بعد سکینہ جھونپڑی کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ لگتا تھا کہ اپنے گیلے کپڑوں، اپنی جھونپڑی کی حالت زار اور مہمان کو بٹھانے کے لئے مناسب جگہ نہ ہونے پر وہ شرم سے مری جا رہی ہے۔

یہ میں بتا چکا ہوں کہ سکینہ بیوہ ہے۔ اب یہ بھی بتاؤں کہ اس کی عمر تقریباً تیس سال ہے۔ اس کا دبلا پتلا جسم اس کے گمشدہ حسن و جمال کی چغلی کھاتا ہے۔ زندگی کی سختیوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہے اور اب وہ اپنی عمر کے مقابلے میں بڑی دکھائی دیتی ہے۔ سکینہ کی زندگی پر دکھ درد کے سیاہ بادل اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ خوشی کی کوئی کرن اس تک نہیں پہنچتی۔ بہت سال پہلے بچپن میں اپنے باپ کے گھر میں ہی اس نے غربت اور مصیبتوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تھی۔ اب جب کہ وہ درمیانی عمر تک پہنچ چکی ہے، اس کی تگ و دو جاری ہے۔ وہ درست ہی کہتی ہے کہ ''پہلے دن سے ہی بس رنج والم میں زندگی گزار رہی ہوں۔ خدا نے مجھے خوشیوں کی ایک گھڑی بھی عطا نہیں کی۔'' مصائب سکینہ کی زندگی کے ساتھی ہیں۔ وہ اب ان کی عادی ہو چکی ہے۔ اس لئے دکھوں سے اس کو خوف نہیں آتا اور نئی مصیبتیں اس کو پریشان نہیں کرتیں۔

سکینہ گھاتل تھانے کے گاؤں شنکر یہ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا دادا، عالم منشی، گاؤں کی مسجد کا خطیب تھا۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے، مگر وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس، باڑہ سمیت، سات آٹھ بیگہ زمین تھی، جہاں وہ خود کاشتکاری کرتا تھا۔ عالم منشی کے دس بچے تھے، لیکن آمدنی اس قدر کم تھی کہ گھر کا خرچ بھی نہ چلتا تھا۔ اس کے گھر پر محرومی کے

MashalBooks.org

گھرے سائے تھے۔سکینہ کا نانا، عبدالغفور، پٹہ بامی گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ خود بھی ایک غریب کسان تھا۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک بیوی سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جب کہ دوسری نے تین بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ یوں سکینہ کے چار ماموں ہیں۔ان میں سے ایک عرصے سے آسام میں رہتا ہے۔

سکینہ کے باپ کا نام نسیم الدین تھا۔ وہ آٹھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔نسیم الدین کو کسی سکول یا مدرسے میں پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اسی طرح اس کے کسی اور بھائی نے بھی تعلیم حاصل نہ تھی۔ اس کے خاندان کے پاس چونکہ زمین بہت کم تھی، اس لئے اتنے بڑے خاندان کی ضرورتیں پوری نہ ہوتی تھیں۔سکینہ کے دادا عالم منشی کی زندگی کے آخری دنوں میں اس کے خاندان کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔نتیجہ یہ تھا کہ عالم منشی کی وفات سے پہلے ہی گھر بار کو چلانے کی خاطر سا کی تقریباً آدمی اراضی فروخت کردی گئی تھی۔اس وقت تک یہ خاندان مل جل کر رہ رہا تھا، لیکن عالم منشی کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔آخر کار اس کے آٹھ بیٹوں نے جائیداد آپس میں تقسیم کر لی۔نسیم الدین کے حصے میں مکان اور تقریباً نصف بیگہ زمین آئی۔ وہ اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے رات دن کام کرنے لگا۔اس کو ہر وقت محنت مشقت کرتے دیکھ کر سکینہ کا دل کڑھنے لگا۔ وہ اپنے باپ کے دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔نسیم الدین کی رات دن کی محنت سے بھی ان کے حالات بہتر نہ ہو سکے۔ زندگی کے خاتمے تک وہ اسی طرح محنت کرتا رہا اور اس کے بال بچے غربت اور محرومی کے اندھیروں میں ڈوبے رہے۔

ظاہر ہے کہ سکینہ کے بچپن کی یادیں خوشگوار نہیں ہیں۔اس کے ساتھ ہمیشہ فالتو اور ناپسندیدہ بچے جیسا سلوک کیا گیا۔خوشی کا کوئی لمحہ اس کی زندگی میں نہیں آیا اور وہ مسرت کے میٹھے ذائقے سے محروم رہی ہے۔ ہردم اس کا دکھوں سے سامنا رہا ہے۔ باپ کے پیلے مردار چہرے اور ماں کی بدمزاجی نے اس کے بچپن کو بے کیف اور مایوس کن بنا دیا تھا۔

سکینہ کی تین بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ وہ والدین کا دوسرا بچہ تھی۔اس کو سکول جانا نصیب نہ ہوا تھا، تاہم ایک مدرسے میں وہ چند روز جاتی رہی تھی۔ مدرسے میں اس نے عربی حروف تہجی سیکھے تھے، مگر اس کے آگے نہ پڑھ سکی۔ البتہ اس کی بڑی بہن کو سکول اور مدرسہ دونوں جگہ جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں اس نے قرآن پڑھا تھا۔ جب کہ باقی دو بہنیں بھی

سکینہ کی طرح سکول یا مدرسہ کی تعلیم سے بالکل محروم رہی تھیں۔ اس کے اکلوتے بھائی کو سکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ لیکن جلد ان کا باپ فوت ہو گیا اور یوں بھائی کی تعلیم بھی ختم ہو گئی۔ بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فساد کے ایک سال بعد باپ مر گیا۔ اس زمانے میں ملک بھر میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت ہوئی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ سکینہ کے باپ کا ایک رات گھر واپس آتے ہوئے ایک بھوت سے سامنا ہو گیا تھا۔ سکینہ کا کہنا ہے کہ اس کا باپ خوف سے بدحواس ہو گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کو بخار نے آ لیا۔ وہ ایسا بستر پر پڑا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔

سکینہ کا باپ گھر کا واحد کفیل تھا۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود اس نے گھر بار کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ خاندان کا کوئی اور وسیلہ روزگار نہ تھا۔ لہٰذا نسیم الدین کی موت سے مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سکینہ کو یوں لگتا تھا کہ رنج و الم سے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ اپنا وقت کھیتوں میں گائے بکریاں چرانے اور ایندھن اکٹھا کرنے میں گزارتی تھی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اور کوئی کام نہ کرتا تھا۔ لیکن باپ کی موت کے بعد حالات بدل گئے۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ سکینہ کی ماں نے دوسرے لوگوں کے گھروں میں دھان بھوسا اتارنے کا کام شروع کر دیا۔ بھائی کو بھی ایک ہمسائے کے گھر میں نوکر رکھوا دیا گیا۔ سکینہ محنت مزدوری کے لئے اپنی ماں کے ساتھ جانے لگی۔ انہی دنوں سکینہ کی بڑی بہن کی شادی قریب ہی رہنے والے ایک فیکٹری کے مزدور سے کر دی گئی دولہا نارائن گنج میں کام کرتا تھا۔ یہ شادی بہت ہی سادہ طریقے سے سرانجام پائی۔ پھر بھی اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ماں نے اپنا آخری سہارا، یعنی چوڑیوں کی ایک جوڑی بیچ ڈالی۔ ماں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹیوں کو خوشی کی زندگی نصیب ہو مگر یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ اس کی بڑی بیٹی ازدواجی زندگی کبھی خوش گوار نہ رہی۔ بعدازاں اس کے شوہر نے نارائن گنج میں ایک اور شادی کر لی۔

بڑی بیٹی کی شادی کے بعد ماں نے سکینہ کی فکر شروع کر دی تھی۔ سکینہ بڑی بہن سے زیادہ چھوٹی نہ تھی۔ یوں کہیئے کہ وہ بہن سے زیادہ صحت مند تھی۔ چنانچہ ماں کو جلد از جلد اس کی شادی کرنے کا خیال رہنے لگا۔ اس نے ہمسایوں اور عزیزوں سے سکینہ کے لئے دولہا ڈھونڈنے کو کہا۔ سکینہ مگر اپنی دنیا میں مگن رہی۔ وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ شادی کا اس کو ابھی ہوش نہ تھا۔

MashalBooks.org

جب سکینہ بارہ برس کی ہوئی تو ایک روز ایک ہمسائی نے اس کی ماں کو بتایا کہ ایک لڑکا اس کی نظر میں ہے۔ ''وہ باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ تم چاہو تو اس کو داماد بنا سکتی ہو۔'' ماں اور وہ ہمسائی دیر تک اس معاملے پر گفتگو کرتی رہیں۔ شادی کے خیال سے سکینہ بہت اداس ہو گئی اور گھنٹوں چھپ کر روتی رہی۔ ہمسائی کے جانے کے بعد سکینہ کی ماں نے اپنے دیوروں سے اس مسئلے پر بات کی۔ سب سے چھوٹے کا خیال تھا کہ صبر سے کام لینا چاہئے اور لڑکے کو اچھی طرح دیکھ بھال لینا چاہئے۔ لیکن سکینہ کی ماں کے سر پر ذمہ داری سے نجات پانے کا بھوت سوار تھا۔ چنانچہ اس نے کسی کی نہ سنی اور لڑکے والوں سے بات کر کے فوراً شادی کی تاریخ طے کر دی۔ اس شادی کے اخراجات کے لئے ماں کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی خالی تھے۔ لڑکے والوں کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ وہ سکینہ کے لئے صرف ایک ساڑھی لے کر آئے۔

شادی کے بعد سکینہ نئی نویلی دلہن بن کر دل میں ہزاروں ارمان لئے کھارک چلی آئی تھی۔ اس کو پتہ چلا کہ اس کا شوہر افزا علی اکیلا ہی رہتا ہے۔ اس کے والدین کئی سال پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ سکینہ پر یہ راز بھی کھل گیا کہ اس کے شوہر کی زمینوں کے چرچے محض افسانے تھے۔ وہ کھیت مزدور تھا اور دوسروں کے کھیتوں پر کام کر کے اجرت حاصل کرتا تھا۔ سکینہ کو کھارک آنے کے دو دن بعد اس حقیقت کا پتہ چل گیا۔ اس پر وہ بے حد مایوس ہوئی۔ جو خواب اس نے دیکھے تھے، وہ سب چکنا چور ہو گئے۔ گھنٹوں وہ اکیلی بستر پر پڑی آنسو بہاتی رہی۔ آخر قسمت نے اس کو اتنا بڑا دھوکہ کیوں دیا تھا؟ رات بھر کروٹیں بدل کر خود سے یہ سوال پوچھتی رہی۔ کوئی اس کو جواب دینے والا نہ تھا۔ اس بیچاری کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ابھی اور آفتیں اس کے نصیب میں ہیں۔

ہمسایوں نے سکینہ کو بتایا کہ ایک زمانے میں افزا علی کے باپ کے پاس اچھی خاصی جائیداد ہوا کرتی تھی۔ دولت نے اس کو کاہل اور نمود و نمائش کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کرتا تھا' لیکن جب پیسہ خرچ کرنے کا موقع ہوتا تو دونوں ہاتھوں سے دولت لٹایا کرتا تھا۔ بازار میں آنے والی بڑی مچھلیاں اور دوسری مہنگی چیزیں اس کی کمزوری تھیں۔ پھر اس کا دسترخوان بھی بہت وسیع تھا۔ اکثر اوقات وہ دوستوں اور ہمسایوں کی شاندار دعوتیں کرتا اور ان پر خوب رقمیں خرچ کرتا۔ مگر یہ تماشا کب تک چل سکتا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اپنی شاہ

خرچی کو قائم رکھنے کے لئے افزاعلی کا باپ آہستہ آہستہ اپنی اراضی بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ اپنی عادتیں اس نے پھر بھی نہ بدلیں چنانچہ نوبت جلد ہی یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے اپنا گھر بھی بیچ ڈالا۔ اس کی حویلی ساتھ والے گھر میں رہنے والے مختار نامی ایک امیر کسان نے خرید لی۔ اس کے بعد افزاعلی کا باپ کچھ عرصے تک اپنے رشتے داروں کے ہاں دھکے کھاتا رہا۔ مختار کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے حویلی کے ایک کونے میں جھونپڑی بنانے کی اجازت دے دی۔ افزاعلی کے باپ نے زندگی کے آخری دن کسمپرسی کے عالم میں اسی جھونپڑی میں گزارے تھے۔ افزاعلی ان دونوں چھوٹا سا بچہ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اسی جھونپڑی میں رہنے لگا۔ مختار نے اس بات کا برا نہ مانا اور افزاعلی کو وہیں پڑا رہنے دیا۔ افزاعلی کے دن وہیں گزرتے رہے۔ شادی کے بعد وہ سکینہ کو اسی جھونپڑی میں لے آیا تھا۔

ازواجی زندگی کے آغاز میں ہی افزاعلی کے جھوٹے نازنخرے اور باپ کی شان و شوکت کے قصے سکینہ کے لئے تکلیف دہ بن گئے۔ وہ ان باتوں سے زچ ہو گئی۔

چند روز بعد ہی سکینہ کو اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ افزاعلی کی آمدنی سے گھر کی دال روٹی کا بندوبست بھی نہیں ہو سکتا۔ جس روز اس کو کام نہ ملتا، گھر میں چولہا گرم نہ ہوتا اور دونوں میاں بیوی کو فاقہ کرنا پڑتا۔ شادی کے پہلے مہینے میں ہی سکینہ ہمسایہ کے گھروں میں کام کاج ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئی۔ رنگین خوابوں کی اس قدر بھیانک تعبیر نے سکینہ کا دل توڑ دیا۔ وہ سوچنے لگی ''خدا نے مجھے دکھ جھیلنے کے لئے پیدا کیا ہے تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے چپ چاپ سب کچھ سہنا چاہئے۔ جو ہونا تھا، ہو گیا ہے اور تقدیر کے ساتھ کون لڑ سکتا ہے۔ یوں پریشان رہنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔'' اس نے کام ڈھونڈ لیا۔ لوگوں کے گھروں میں دھان صاف کرنے سے لے کر مویشیوں کی دیکھ بھال تک کا کام کرنے لگی۔ اس طرح جو تھوڑی بہت اجرت ملتی، اس سے گھر کا خرچ چلنے لگا۔ مگر ساری محنت مشقت کے باوجود خوشیاں سکینہ سے روٹھی رہیں۔ شوہر سے اس کو کوئی محبت اور چاہت نہ مل سکی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''سچی بات تو یہ ہے کہ اس شخص کے سینے میں پتھر کا دل ہے۔''

ایک تکلیف دہ واقعہ سکینہ کبھی نہیں بھولتی۔ ایک رات کسی مسئلہ پر شوہر کے ساتھ اس کی تکرار ہو گئی۔ دونوں غصے میں آ گئے۔ اسی عالم میں سکینہ نے اس کو طعنہ دیا کہ ''تم جھوٹے اور مکار ہو۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ تم نے سبز باغ دکھا کر میری ماں کو

شادی پر رضا مند کیا۔ میرے گھر والوں کو تمہاری حقیقت معلوم ہوتی تو کبھی مجھے تمہارے پلے نہ باندھتے۔'' ابھی اس نے بات ختم بھی نہ کی تھی کہ افزا علی طیش میں آ گیا اور ڈنڈا لے کر سکینہ کو پیٹنے لگا۔ مار مار کر اس نے سکینہ کا برا حال کر دیا۔ پھر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کا گلا گھوٹنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوگئی اور رات بھر درد سے کراہتی رہی۔ وہ خون میں لت پت تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور شدید زخمی تھی۔ تین دن تک وہ اسی بے بسی کے عالم میں بستر پر پڑی رہی۔ لیکن افزا علی نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی کوئی دوا لا کر دی۔

سکینہ ٹھیک ہوئی تو اس نے اپنی ماں کو کہلوا بھیجا۔ ماں نے سکینہ کو واپس لانے کے لئے اس کا چھوٹا بھائی بھیج دیا۔ میکے آنے پر سکینہ نے اپنی درد بھری داستان ماں کو سنائی۔ وہ رونے اور منتیں کرنے لگی کہ ''ماں مجھے اس گھر واپس نہ بھیجنا۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔'' تاہم ماں نے اس کو سمجھانا شروع کر دیا کہ ''عورت کی شادی ایک بار ہوتی ہے۔ تمہارے ساتھ وہی ہوا ہے جو قسمت میں لکھا تھا۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور اپنے شوہر کے ساتھ رہو۔ تم غریب ماں باپ کی بیٹی ہو۔ اس لئے زندگی میں دکھ ہی سمیٹنے ہیں۔'' سکینہ کو ماں کی باتوں سے اتفاق نہ تھا۔ مگر وہ اس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ قسمت کے آگے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ماں کے گھر میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

اس واقعہ کے بعد ماں اور دوسرے رشتے داروں سے سکینہ کا تعلق تو رہا، مگر اس کو معلوم تھا کہ اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں۔ پھر کبھی اس نے اپنے شوہر کی زندگی میں میکے کا رخ نہ کیا۔ افزا علی بھی وہاں کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ البتہ سکینہ کی ماں اور بھائی کبھی کبھی اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ افزا علی کی وفات کے بعد سکینہ اپنی ماں کے پاس آ گئی۔ شاید اس کو تسکین کی تلاش تھی۔ لیکن ان دنوں ماں کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ مصیبتوں اور محرومیوں نے عزیز ترین رشتوں کو بھی دھندلا دیا تھا۔ پھر بھی ماں اور بھائی نے اس کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی۔ اب بھی، جہاں تک ممکن ہو، وہ سکینہ کا خیال رکھتے ہیں۔

شادی کے بعد آٹھ برس تک سکینہ کی گود خالی رہی تھی۔ لوگ اس کو بانجھ کہنے لگے تھے۔ افزا علی کا خیال بھی یہی تھا اور وہ اس حوالے سے طنز کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا تھا۔ آخر کار شادی کے آٹھ برس بعد سکینہ نے ایک بیٹی کو جنم دے کر لوگوں کے منہ بند کر

دیئے۔ بیٹی کا نام اس نے اختری بیگم رکھا۔ بیٹی کی پیدائش پر رنج والم کے اتھاہ اندھیرے میں سکینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کو یوں لگا جیسے خدا آخرکار اس پر مہربان ہو گیا ہو۔

سات برس کی عمر میں اختری کو معدے کی بیماری نے آ لیا۔ اس کا سارا جسم پھول گیا اور چند روز بعد وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کی موت سے دو سال پہلے سکینہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس کا نام شاہ نور رکھا گیا۔ پیدائش سے ہی وہ بیمار رہتا ہے۔ آج کل بھی اس کو ہلکے بخار کی شکایت رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ خون بھی تھوکنے لگتا ہے۔ سکینہ نے مجھے بتایا کہ بد حالی کے سبب وہ بچے کا علاج نہیں کروا سکی۔ اس کو یہ بھی افسوس ہے کہ غربت کے سبب باپ کی زندگی میں بھی اس بچے کو کوئی دوائی میسر نہ آ سکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''جب شاہ نور خون تھوکتا ہے تو میرا دل دہل جاتا ہے ساری ہمت اور حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ بس سوچتی ہوں کہ کاش یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی میں مر جاتی۔ رندھی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے کہا کہ ''خدا کے لئے میرے بیٹے کے علاج کے لئے کچھ کیجئے۔ ساری دنیا میں اس یتیم بچے کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ وہ مر گیا تو پھر میرے جینے کا کیا فائدہ۔''

سکینہ کے سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ اس کی تسکین کی خاطر میں نے چند بے معنی سے الفاظ کہے تا کہ وہ خود کو سنبھال سکے۔

شاہ نور پانچ برس کا ہوا تو سکینہ نے اپنے آخری بچے کو جنم دیا۔ یہ ایک بچی ہے جس کا نام ڈالی رکھا گیا ہے۔ اختری کی طرح ڈالی بھی شروع ہی سے بیماریوں کا شکار رہی۔ پیدا ہوتے ہی وہ بیمار تھی اور اب بھی اس کی حالت اچھی نہ تھی۔ سکینہ کہنے لگی کہ وہ ان سب باتوں سے تنگ آ چکی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جائے۔

بچوں کو سکینہ اپنا دودھ پلاتی رہی تھی۔ لیکن مناسب خوراک نہ ملنے کی وجہ سے اس کی چھاتیاں اکثر خشک ہو جاتی تھیں۔ تب وہ بچوں کے ہمسایوں سے گائے یا بکری کا دودھ مانگنے پر مجبور ہو جاتی۔ بچے جب ذرا بڑے ہوئے تو سکینہ نے ان کو آٹے یا چاول سے بنا ہوا دلیا کھانے کی عادت ڈالی۔ اکثر اوقات یہی ان کے لئے خوراک ہوتی تھی۔ وہ کبھی اپنے بچوں کو مناسب خوراک نہ دے سکی۔ اس لئے وہ نیم فاقہ زدہ ہی رہے۔ عید کے تہوار پر جب گاؤں کے سب بچے نئے کپڑے پہن کر خوشی سے اچھلتے کودتے تھے، سکینہ کے بچے ننگ

دھڑ ننگے ہی رہتے۔ اسی طرح جب شاہ نور اور ڈالی کی عمر کے بچے مزیدار کھانوں سے لطف اٹھاتے تو ان کو بچی کھچی چیزوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ ان باتوں نے سکینہ کے دل پر گہرے زخم لگائے تھے۔

سکینہ پھر اپنی شادی کے دنوں کا ذکر کرنے لگی۔ جن دنوں وہ اپنے شوہر کی فریب کاری سے پہنچنے والے صدمے پر قابو پانے اور اس حقیقت کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اصل میں وہ ایک کھیت مزدور تھا۔ وہ نئے حالات سے سمجھوتہ کر رہی تھی اور گھر کا خرچ چلانے کے لئے ہمسایوں کے ہاں نوکری کی تلاش میں تھی کہ اس دوران اس کو ایک اور بڑے صدمے سے دو چار ہونا پڑا۔ اس صدمے نے سکینہ کو بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ افزا علی کھانسی اور دمے کا دائمی مریض ہے۔ وہ کہنے لگی کہ افزا علی کا سارا جسم ہی بیماریوں کا گڑھ تھا۔ دوسرے حقائق کی طرح اس بات کو بھی شادی کے موقع پر سکینہ کی ماں سے چھپایا گیا تھا۔ سکینہ کہنے لگی کہ اگر شادی سے پہلے اس کو ان باتوں کی خبر ہو جاتی تو وہ افزا علی کو قبول کرنے پر خودکشی کو ترجیح دیتی۔

شروع میں سکینہ کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے شوہر میں چند غیر فطری علامتیں محسوس کیں۔ اس نے سمجھا کہ شاید وہ نزلہ زکام جیسی عام بیماری میں مبتلا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ افزا علی کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ دمے کے مرض میں شدت پیدا ہوئی تو رات کے وقت افزا علی کے سانس لینے کی آواز یوں آتی جیسے کوئی دھونکنی پھونک رہا ہو۔ سکینہ اس قدر خوف زدہ ہوگئی کہ اس کو نیند ہی نہ آتی۔ دن رات وہ اپنے شوہر کی تیمارداری کرتی اور خدا سے اس کی صحت کے لئے دعائیں مانگتی، لیکن یہ دعائیں بے اثر رہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کے ایک سال بعد افزا علی بیماری کے ہاتھوں لاچار ہو کر اپاہج ہو گیا۔ وہ ایسا بستر پر پڑا کہ زندگی میں پھر اٹھ نہ سکا۔ سکینہ کے پاس تھا ہی کیا کہ وہ شوہر کا علاج کرواتی یا اس کے لئے کوئی دوا دارو لاتی۔ بے بسی کے عالم میں وہ سب کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگی۔ کئی ہمسایوں نے اپنی بساط کے مطابق اس کی مدد کی۔ ان کی مدد سے افزا علی کا کچھ عرصے تک علاج ہوتا رہا۔ سکینہ نے علاج کے لئے بھوا پور سے ایک ڈاکٹر کو بھی بلوایا۔ وہ اپنے سب رنج و الم بھول گئی اور فاقے رہ کر افزا علی کے علاج کے لئے پیسے بچانے لگی۔ دن رات اس نے شوہر کی دیکھ بھال کی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ تین سال تک بیمار رہنے

MashalBooks.org

کے بعد افزا علی مر گیا۔ سکینہ اب اس دکھ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ افزا علی کی وفات کے وقت وہ پانچ ماہ کی حاملہ تھی۔ ڈالی اس کے پیٹ میں تھی۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ افزا علی کے کفن دفن کے لئے بھی اس کو دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے۔

افزا علی کی موت نے سکینہ کو بالکل نڈھال کر دیا۔ چاروں طرف اس کو اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ ہمسائے اس کو دلاسہ دیتے اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتے۔ سکینہ مایوس نگاہوں سے ان کو دیکھتی۔ اس کو یہ ساری باتیں بے معنی لگتی تھیں۔ گھر میں بھوک ناچ رہی تھی اور اس کا اپنا جسم برسوں کی مشقت سے، اور شوہر کی موت کے صدمے سے جواب دینے لگا تھا۔ چنانچہ جلد ہی وہ بیمار پڑ گئی۔ جب شوہر زندہ تھا تو سکینہ اپنی محرومیوں کا اس کو ذمہ دار ٹھہرایا کرتی تھی۔ لیکن اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا، سکینہ کو محسوس ہوتا جیسے اس کا سہارا ختم ہو گیا ہے۔ رات رات بھر وہ آنسو بہاتی۔ اس کو وہ راتیں یاد آتیں جب شوہر سے مار کھانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ کر رویا کرتی تھی لیکن اس یاد سے شوہر کے لئے نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ اب اس کا دکھ درد پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں روتی اور اس بات کا خیال نہ کرتی کہ رونے کی آواز ہمسایوں تک پہنچ رہی ہو گی۔

خیر، سکینہ کے دکھ اور بے بسی نے اس کو زیادہ عرصے تک گھر میں بند نہ رکھا۔ اپنے خالی پیٹ اور روٹی کے لئے بچوں کے واویلے نے جلد ہی اس کو گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ شوہر کی موت کے پانچویں روز سکینہ مدد کے لئے ہمسایوں کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھی۔

ابتداء میں ہر کسی کو سکینہ پر رحم آتا تھا اور ہر کوئی اس کی مدد پر آمادہ تھا۔ کئی لوگ اس جواں عمری میں بیوہ ہو جانے پر اس کے ساتھ افسوس کرتے تھے۔ کئی ایسے بھی جنہوں نے اشاروں کنایوں میں اس کو کوئی اور پیغام دینا چاہا۔ یہاں تک کہ چند ایک نے اس کو شادی کا پیغام بھی بھجوایا دیا۔ لیکن سکینہ نہ مانی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنے بچوں کی خاطر اس نے خاموشی سے سب کچھ سہنے کا تہیہ کر لیا۔ اپنے خوشی کا کبھی اس کے دل میں خیال بھی نہ آیا۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں سکینہ کے بچوں کی صورتیں اس کا سہارا بن گئیں۔

MashalBooks.org

یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ دکھ کے دنوں میں سکینہ کے بارے میں گاؤں کے بزرگوں کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ انہوں نے اس بے بس اور بے سہارا لڑکی کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اس خوبصورت لڑکی پر ترس بھی آتا تھا۔ ان بزرگوں کی مدد کے بغیر وہ گاؤں کے بدکردار لوگوں سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ یہ بزرگ سکینہ کو مالی امداد دینے کے قابل نہ تھے، مگر ان کا سہارا ہی بہت تھا۔ علاوہ ازیں وہ سکینہ کو کم از کم اچھے مشورے تو دے سکتے تھے۔ پھر یہ ہوتا کہ ان لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے کبھی کبھی سکینہ کو کھانے پینے کے لئے کچھ مل جاتا۔ وہ ان کو اپنا خیر خواہ سمجھتی اور ان کے مشورے توجہ سے سنتی تھی۔

باتوں کے دوران سکینہ نے مجھے بتایا کہ جب اس نے گرامین بنک سے قرض لے کر اپنا کاروبار شروع کیا تو اس کے پاس رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے اپنا سامان ہمسایوں کے ہاں رکھا ہوا تھا اور خود دوسروں کے گھر میں رہا کرتی تھی۔ بعد میں جب اس نے اپنی جھونپڑی ڈالی تو بھی سامان ادھر اُدھر ہی رکھنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اپنی جھونپڑی محفوظ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمسایوں کی مدد کے بغیر اس کا بچنا محال تھا۔

کبھی کبھی سکینہ کو خیال آتا ہے کہ چونکہ وہ غریب اور نادار ہے' لہٰذا وہ دوسروں کے حکم کی غلام ہے۔ ہر کوئی اس پر رعب جھاڑتا ہے' کیونکہ کوئی اس کا عزیز ہے اور نہ ہی کوئی والی وارث۔ بسا اوقات اس وجہ سے سکینہ کے لئے شدید مشکلات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک کی بات مانتی ہے تو دوسرا ناراض ہو جاتا ہے۔ یہ ناگوار صورت حال تو میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ جب دوسری بار میں اس سے ملنے گیا اور اس کی جھونپڑی میں بیٹھ کر باتیں کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا ہمسایہ باتیں بنانے لگتا تھا۔ تاہم گاؤں کا ایک بزرگ اس کا ہاتھ پکڑ کر پرے لے گیا۔ جب میں واپس جا رہا تھا تو وہی بزرگ مجھے راستے میں ملا اور معذرت کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ ''جناب اس شخص نے جو باتیں کی تھیں' ان کا برا نہ مانیے گا۔ وہ بے وقوف سکینہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔

زندہ رہنے کے لئے سکینہ کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ ہمسایوں کے گھروں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالے۔ اس نے ان گھروں میں مختلف کام اپنے ذمے لے لئے۔ وہ وہاں دھان صاف کرتی اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی۔ یوں اس کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روزی ملنے لگی۔ اچھی خوراک تو خیر اس کی قسمت میں

نہ تھی۔ پھر بھی گزارہ ہو جاتا تھا۔ دھان کی فصل کٹنے کے موسم کے سوا گاؤں میں مشکل ہی سے کوئی کام ملتا تھا۔ چنانچہ ان ایام میں سکینہ کے خاندان کو غربت اور فاقے برداشت کرنا پڑتے تھے۔ جب حالات برداشت سے باہر ہو جاتے تو وہ شرم وحیا سے دامن چھڑا کر بھیک مانگنے نکل جاتی۔ لیکن اس طرح بھی کچھ زیادہ ہاتھ نہ لگتا تھا اور اکثر اوقات سکینہ اور اس کے بچوں کو کھانے کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ برسات کے دنوں میں اس کے مصائب کی کوئی حد نہ رہتی۔ اکثر دیہاتیوں کے لئے یہ پرے دن ہوتے ہیں ان کا اپنا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسروں کو خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں سکینہ کے خاندان کو کئی کئی دن بھوکے رہنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ جنگلی جڑی بوٹیاں ابال کر بچوں کو کھانے کے لئے دے دیتی۔ لیکن ہر روز یہ بھی ممکن نہ ہوتا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد تین بار سکینہ پر اسہال کے مرض کا حملہ ہوا۔ تینوں بار وہ مرتے مرتے بچی۔ اس کے لئے علاج کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ البتہ ہمسائے اس کو بچی کچی دوائی دے دیتے۔ وہی اس کے لئے کافی ہوتی اور وہ کسی نہ کسی طور بچ جاتی۔

سکینہ کی زندگی کے تلخ ترین دن1974 ء کے قحط سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں افزاعلی ویسے تو زندہ تھا' لیکن دمے سے نڈھال ہو کر بستر پر پڑا رہتا تھا۔ وہ چلنے پھرنے اور کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کی لاچاری کے باعث سارا خاندان فاقہ کشی کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن قحط کے دنوں میں کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتیں اچانک آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ یوں اس خاندان کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی۔ قحط چاروں طرف پھیل چکا تھا اور لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں مشکل ہی سے دستیاب ہوتی تھیں۔ لہٰذا وہ لوگ بھی جو پہلے سے اس خاندان کی مدد کر دیا کرتے تھے، اب مدد کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس خاندان کے لئے کوئی سہارا نہ رہا تھا۔

کوئی خیرات دینے والا نہ تھا۔ چاروں طرف بھوک اور افلاس کے اندھیرے چھا گئے تھے۔ اناج کی قیمتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ سکینہ خریدنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اب کوئی اس کو چاولوں کا پانی بھی خیرات میں دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ کیلے اور کئی دوسرے درختوں کی جڑیں ابال کر اپنے خاندان کو خوراک کے طور پر دینے لگی۔ حکومت نے قحط زدہ لوگوں میں تھوڑا بہت آٹا اور مکئی وغیرہ تقسیم کرنے کا پروگرام شروع کیا تھا۔ سکینہ کے لئے یہ خوراک کا واحد

ذریعہ رہ گیا تھا۔مگر سرکاری خیرات کی مقدار اس قدر کم تھی کہ خاندان کے پاس پہننے کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔ وہ ایک بوری جسم پر لپیٹ لیتی۔مگر اس سے آدھا جسم ننگا رہ جاتا تھا۔

اس بات کو کئی سال گزر گئے ہیں۔لیکن سکینہ جب مجھے یہ سنا رہی تھی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ دکھ کے ان دنوں میں البتہ اس کو ایسا کوئی احساس نہ ہوتا تھا۔ مجھے اس نے بتایا کہ ''جب میں نے دیکھا کہ ہم لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں تو پھر میں نے شرم و حیا کے خیال کو ذہن سے نکال دیا۔'' خیر ان ساری مصیبتوں کے باوجود یہ خاندان کسی نہ کسی طور بچ نکلا۔ البتہ ان مصیبتوں نے افزا علی اور سات سالہ اختری کی موت کے عمل کو تیز کر دیا۔سکینہ خود بھی ہیضے کی زد میں آ گئی۔ ہمسائے اس کی جھونپڑی میں قدم رکھنے سے ڈرنے لگے۔کسی کو سکینہ یا اس کے خاندان کے زندہ رہ جانے کی امید نہ رہی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کی بیٹی اختری اللہ کو پیاری ہو گئی۔سکینہ آہ بھر کر کہتی ہے کہ ''دکھ درد کے ان دنوں کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔''

گذشتہ برس کے سیلاب میں سکینہ کا گھر پانی کی زد میں آ گیا تھا۔ یہی نہیں پورا گاؤں بلکہ یوں کہئے کہ پورا ملک ہی سیلاب میں ڈوب گیا تھا۔سکینہ نے ایک ہمسائے کے باورچی خانے میں پناہ لی تھی۔لیکن روٹی کا مسئلہ حل نہ ہوتا تھا۔محنت مزدوری کا کوئی موقع بھی نہ مل رہا تھا۔سیلاب کے باعث سکینہ بھیک مانگنے بھی نہ جا سکتی تھی۔ یوں بے بسی کے عالم میں سکینہ اور اس کے دنوں بچوں کو فاقے کرنے پڑے۔ بچوں کو اس کی عادت ہو گئی تھی۔ اس لئے عموماً وہ ماں کو زیادہ تنگ نہ کرتے تھے لیکن بچے آخر بچے تھے۔ جب بھوک برداشت نہ ہوتی تو وہ رونے لگتے۔سکینہ سے ان کا رونا دیکھا نہ جاتا تھا۔اس کا دل چاہتا کہ وہ پانی میں ڈوب کے جان دے دے۔لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش اس کی راہ روک لیتی۔اس سال یہ برسات کے پورے موسم میں اس کو سرکار کی طرف سے صرف تیس سیر آٹا مل سکا۔ یہ اس کا واحد سہارا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ 1974ء کے قحط کے مصیبتوں نے اس کو پچھلے سال کے سیلاب کی بلائیں برداشت کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔

سکینہ کو 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے لئے ہونے والی خونریز خانہ جنگی میں بھی خوب اچھی طرح یاد ہے۔ پورا مشرقی بنگال اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔قبل ازیں اڑتی سی خبر سکینہ تک پہنچی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔لوگوں کی زبان پر یہ بات تھی کہ ''اوپر والے شیخ

صاحب کو بادشاہ بننے کی اجازت نہیں دے رہے۔'' اس کے خیال میں خانہ جنگی کی یہی وجہ تھی۔ اس زمانے میں گاؤں کا ہر فرد خوف زدہ تھا۔ اور بہت سے لوگ مختلف مقامات کی طرف بھاگ گئے تھے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے لئے لڑنے والوں کے ایک جتھے نے سکینہ کے ہمسایہ میں ایک گھر کیمپ بنا لیا تھا۔ گاؤں والوں کے ساتھ وہ بھی انہیں پسند کیا کرتی تھی۔ سکینہ ہمیشہ سوچتی کہ ان لڑکوں کی مائیں کس قدر پریشان ہوں گی۔ وہ ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی۔ سکینہ کا کہنا ہے کہ گاؤں میں متحدہ پاکستان کا کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے گاؤں میں کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ البتہ ایک بار چند بہاری سراج گنج جاتے ہوئے اپنی تین بندوقوں کے ساتھ اس طرف آ نکلے تھے۔ انہوں نے گاؤں والوں کو ڈرایا دھمکایا اور اپنے لئے بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ ایک چالاک دیہاتی ان کو اپنے گھر لے گیا اور ان سے کہا کہ وہ آرام کریں۔ تھوڑی دیر میں ان کے لئے کھانا تیار ہو جائے گا۔ اسی دوران میں اس نے سازش کر کے ان بہاریوں کو پکڑوا دیا۔ بعد ازاں قادر صدیقی نامی مشہور حریت پسند گاؤں میں آیا اور ان قیدیوں کو ساتھ لے گیا۔ اس کے سوا سکینہ کے گاؤں میں کوئی اور قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ تاہم سکینہ نے اپنے گھر سے دور چاپشاہ میں لڑائی کے آثار دیکھے تھے۔ اس لڑائی میں حریت پسندوں نے پاکستان کا ایک جہاز غرق کر دیا تھا۔

جنگ کے دنوں میں خوراک کوئی بڑا مسئلہ نہ بنی تھی۔ تب سکینہ کا شوہر زندہ تھا اور محنت مزدوری بھی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر ہمسائے بھی مدد کرنے پر آمادہ تھے۔ سکینہ کہتی ہے کہ ان دنوں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے۔ جب کسی کو کوئی مشکل پیش آتی تو دوسرے اس کی مدد کیا کرتے تھے۔

کسی ساہوکار کے ساتھ سکینہ کا کبھی زندگی میں واسطہ نہ پڑا۔ اصل میں اس قدر غریب تھی کہ اس قسم کے لوگ اس کو قرضہ دینے کے قابل ہی نہ سمجھتے تھے۔ خیر اس نے یہ ضرور سن رکھا تھا کہ بعض لوگ سود پر دوسروں کو روپے دینے کا کاروبار کرتے ہیں۔ سکینہ نے سود پر رقم حاصل کرنے والے ایک دو لوگوں سے بات بھی کی تھی۔ یہ لوگ قرض کے ہر سو روپے پر دس روپے ماہوار کی قسط ادا کر رہے تھے۔ اگر وہ قرض کے طور پر ایک من دھان حاصل کرتے تو تین ماہ میں ان کو دو من دھان واپس کرنا ہوتا تھا۔ اس قسم کے ساہوکاروں کے جنگل میں پھنس کر غریب لوگ بہت خوار ہوتے تھے۔ اس گاؤں کے ایک شخص کا یہ حال

ہوا تھا کہ اس نے اپنی ساری زمین بیچ کر قرض لوٹایا تھا۔ یہ واقعہ آٹھ سال پرانا ہے۔ سکینہ نے مجھے بتایا کہ اس کے گاؤں میں سود پر رقم دینے کا کاروبار کرنے والا کوئی شخص نہیں۔ چنانچہ لوگ دوسرے دیہات اور خاص طور پر کوبرا نامی گاؤ میں رہنے والے سودخوروں سے قرض لیا کرتے تھے۔ سکینہ کے خیال میں اس کے علاقے میں اب اس قسم کا کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ اصل میں گرامین بنک کی وجہ سے یہ کاروبار بند ہوگیا ہے۔ اب تمام غریب لوگ ضرورت پڑنے پر کسی سودخور کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے بلکہ بنک کا رخ کرتے ہیں۔ خیر' بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سکینہ کی اطلاع درست نہ تھی۔ گاؤں کے مختلف لوگوں سے جب میں نے روپے کا کاروبار کے بارے میں گفتگو کی تو انہوں نے بتایا کہ نکلہ اور کوبرا جیسے دیہات میں یہ کاروبار جاری تھا۔ چنانچہ اب بھی گاؤں کے چھوٹے اور درمیانے درجے کے کسان بوائی کے موسم میں سود پر رقم حاصل کرتے ہیں۔ یہ رقم سود کے ساتھ کٹائی کے دنوں میں واپس کی جاتی ہے۔ ادائیگی نقد اور جنس دنوں میں صورتوں میں ہوسکتی ہے۔ ان لوگوں کی باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔

خیر' جہاں تک سکینہ کا تعلق ہے' مالی اور سماجی دنوں اعتبار سے اس کی حالت بہت ہی افسوسناک تھی۔ وہ غیر انسانی زندگی گزار رہی تھی اور اس کے زیادہ تر دن بھیک مانگنے پر گزرے تھے۔ گاؤں میں خیرات بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ چنانچہ بیچاری کو ان گھروں کے بار بار پھیرے لگانے پڑتے تھے۔ عید کا فطرانہ عام طور پر غریبوں کو دیا جاتا ہے۔ مگر سکینہ کو فطرانہ لینے کے لئے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ کم از کم سات بار وہ مختلف گھروں کے چکر لگاتی' پھر کہیں جا کر فطرانہ کی حق دار ٹھہرتی۔ کئی بار لوگ اس کو جھاڑ دیتے۔ برا بھلا کہنے سے بھی بعض اوقات گریز نہ کرتے۔ اس قسم کی باتوں سے سکینہ کو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ انسان ہی نہیں رہی۔ غربت نے اس کو جانور بنا دیا۔ چنانچہ وہ مجھے بتانے لگی کہ ''لوگ گایوں بکریوں کی بھی قدر کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ درجہ بھی نہیں دیتے۔ کاش میں گائے ہوتی تو یہ لوگ مجھے اس طرح نہ دھتکارتے۔ میرا کچھ خیال رکھتے۔ میری کوئی قدر ہوتی۔''

سکینہ کی اندھیری دنیا میں گرامین بنک امید کی کرن بن کر نمودار ہوا۔ یہ خبر سن کر اس کو بہت خوشی ہوئی کہ یہ بنک غریب بے زمین عورتوں کو قرضے جاری کر رہا ہے۔ برہتی یونین میں واقع اس بنک کے شاخ نے بے زمین لوگوں کو قرضے دینے کا اعلان کیا تو رحیمہ

نے یہ اطلاع سکینہ کو پہنچائی۔ رحیمہ نے یہ خبر اپنے ایک ہمسائے جمیل الدین سے سنی تھی۔ خود جمیل الدین نے یہ اطلاع اس بنک کے دفتر سے براہ راست حاصل کی تھی۔ رحیمہ آج کل سنٹرل چیئرمین ہے۔ اس نے سکینہ کو بتایا تھا کہ ''تم اس قدر مصیبت کی زندگی گزارتی رہی ہو۔ گرامین بنک سے قرض کیوں نہیں لے لیتیں۔

اس وسیلے کی خبر پا کر سکینہ کو جہاں بہت خوشی ہوئی' وہیں اس کے دل میں کئی وسوسے بھی پیدا ہوئے۔ اپنے ابتدائی وسوسوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ تکلیف دہ جدوجہد کے طویل برسوں سے اس نے یہ جانا تھا کہ کوئی شخص بے زمین غریبوں پر اعتماد نہیں کرتا۔ ان غریبوں کو قرض دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ رقم لوٹانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس کے ذہن میں یہ بھی سوال بار بار اٹھ رہا تھا کہ ''قرض کے طور پر نقد رقم دینا تو دور کی بات ہے۔ یہ لوگ مجھ پر مٹھی بھر چاول کا اعتبار بھی نہیں کر سکتے۔'' ذہن میں اس قسم کے شکوک و شبہات لئے سکینہ نے کئی لوگوں سے مشورہ کیا۔ اس نے اس مسئلہ پر اپنے ہمسایوں سے گاؤں کے لوگوں سے' یہاں تک کہ اپنے باپ سے بھی بات کی۔ ان میں سے بعض نے اس کو بنک سے قرض لینے سے منع کیا اور بعض نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ گاؤں کے خوشحال کسانوں نے سکینہ کو اس قسم کے معاملات سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اس مصیبت سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔ کیا خبر کہ کس مصیبت میں پھنس جاؤ۔ اس سے تو اچھا ہے کہ ہمارے گھر کام کرتی رہو۔'' ''قرضہ لو۔ اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچاؤ۔ کوئی مشکل پیدا ہوئی تو بعد میں دیکھا جائے گا۔''

ان باتوں سے بھی سکینہ کی ہمت نہ بڑھی۔ چنانچہ اپنے عزیزوں کی رائے لینے کی خاطر وہ شنگوریا گئی۔ اس کی ماں اور بہن تو بنک سے قرض لینے کی بات سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ انہوں نے سکینہ کو ڈرایا کہ ''اگر تم رقم لے کر واپس نہ کر سکیں تو وہ تمہیں باندھ کر لے جائیں گے۔'' غنیمت یہ ہوئی کہ سکینہ کے بھائی نے اس کو حوصلہ دیا۔ اس نے کہا ''پہلے تم سارا معاملہ اچھی طرح سمجھ لو۔ پھر اگر تم خود کو اس کے اہل پاؤ تو کسی کی سنے بغیر آگے بڑھو۔ قرضہ لے لو۔''

بھائی اور چند ہمسایوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کے باوجود سکینہ کے شبہات دور نہ ہوئے۔ کئی دن تک وہ یہ سوچتی رہی کہ قرضہ مل بھی گیا تو اس کا کیا کرے گی کبھی اس کو

خیال آتا کہ ''میں رقم حاصل کرتی ہوں۔ شاید اس سے میری مصیبتیں تھوڑی بہت کم ہو جائیں۔لیکن فوراً ہی اس کو خیال آتا کہ ''اگر میں بنک کی رقم واپس نہ کر سکی تو پھر کیا ہو گا۔''

گروپ میں شمولیت سے پہلے سکینہ اس قدر تذبذب کے عالم میں رہی کہ دو تین راتیں جاگ کر گزر گئیں۔ جب وہ کوئی حتمی فیصلہ نہ کر پائی تو اس نے آنکھیں بند کیں اور طے کر لیا کہ وہ رقم حاصل کرے گی۔ ظاہر ہے کہ قرض حاصل کرنے والے گروپ میں شامل ہونے کے فیصلہ سے سکینہ کے تمام مسئلے حل نہ ہو سکتے تھے۔ علاوہ ازیں گروپ میں سکینہ کی شمولیت آسان بھی نہ تھی۔ گروپ کے دوسرے ارکان کے دل میں اس کے بارے میں کئی شکوک وشبہات تھے۔ اس کی جھونپڑی سب سے الگ تھلگ علاقے میں تھی۔ ارکان یہ بھی سمجھتے تھے کہ سکینہ رقم لے کر آسانی سے واپس نہ کر سکے گی۔ لہٰذا انہوں نے سکینہ کو ساتھ ملانے پر اعتراض شروع کر دیئے۔

اسی اثنا میں دو گروپ بنانے کے منصوبے کو حتمی شکل دے دی گئی تھی۔ تاہم دونوں گروپوں نے سکینہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔سکینہ کو اس بات پر بہت دکھ ہوا۔ تاہم وہ رحیمہ سمیت گروپ کے تمام ارکان سے ملی اور ان سے گروپ میں شامل ہونے کے لئے درخواست کی۔ یہاں تک کہ وہ بنک کی ایک ملازمہ صاحبہ سے بھی ملی اور اپنی دکھ بھری کہانی اس کو سنائی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی قسطیں بلا تاخیر ادا کرتی رہے گی۔ صاحبہ نے سکینہ کے مسئلے پر دوسرے لوگوں سے بات کی۔ آخر کار اس کو نئے گروپوں کی تشکیل کے دوران کھارک نکلہ محلّہ سمتی کے اول گروپ میں شامل کر دیا گیا۔ اس کامیابی پر وہ بے حد خوش تھی۔ اس کو لگتا جیسے کہ اس نے کوئی بڑی مہم سر کر لی ہو۔ اس خوشی کے ساتھ ساتھ بنک کے قواعد وضوابط پر عمل کرنے کی تگ و دو میں اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ کسی عجیب وغریب دنیا میں آ گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس کو دوسروں کے ساتھ مل کر ہفتہ وار اجلاسوں میں شرکت کا تجربہ حاصل ہو رہا تھا۔سکینہ کے لئے قلم ہاتھ میں لے کر اپنا نام لکھنا بھی مشکل کام تھا۔لیکن گروپ کی رکنیت ملنے کے بعد اس کو ساری باتیں خوش گوار لگنے لگی تھی۔ جوش وخروش کے ساتھ اس نے اپنے دستخط کرنا سیکھے۔ اب اس کا یہ پرانا وہم دور ہونے لگا تھا کہ اس کا وجود بے معنی ہے۔ اس کو معاشرے میں اپنی قدر کا احساس ہونے لگا۔ یوں اس کی خود اعتمادی بڑھنے لگی اور وہ زندگی کے سفر میں حوصلے کے ساتھ قدم رکھنے لگی۔سکینہ کی زندگی اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ

بہت کچھ بدل گئی۔ اس نے بنک کے تمام قواعد وضوابط زبانی یاد کر رکھے ہیں اور اس کا کہنا ہے وہ ان تمام قاعدوں اور ضابطوں کو پسند کرتی ہے۔

گروپ کی تشکیل کے ایک ماہ بعد، مارچ کے مہینے میں بنک سے قرضے کے لئے پہلی درخواست دی گئی۔ سب سے پہلے سکینہ اور فیروزہ کا نام نکل آیا۔ چنانچہ سکینہ اپنے گروپ کے تمام دوسرے ارکان کو ساتھ لے کر بھوا پور میں گرامین بنک کے دفتر گئی اور قرض کی رقم حاصل کی۔ یہ رقم آٹھ سو بنگلہ دیشی روپے تھی اصل میں اس کو گائے خریدنے کا مشورہ دیا گیا تھا، اس علاقے میں مویشیوں کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ منیجر نے اس کو سمجھایا کہ اگر اس نے گائے خریدی اور وہ وبا کی نذر ہوگئی تو اس طرح سکینہ کے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ منیجر نے اس کو کوئی اور کام کرنے کا مشورہ دیا۔ سکینہ نے تجویز پیش کی کہ وہ کپڑے فروخت کرنے کا کام کر سکتی ہے۔ منیجر نے اس کام کے لئے سکینہ کی مدد کی اور اس کو آٹھ سو روپے کے قرض کے لئے درخواست دینے کو کہا۔ سکینہ نے ایسا ہی کیا اور اس کو آٹھ سو روپے مل گئے۔ اس رقم پر اس کو چالیس روپے گروپ ٹیکس ادا کرنے پڑے۔ یوں نیا کام شروع کرنے کے لئے اس کے پاس 760 روپے رہ گئے تھے۔ اب قصہ یہ تھا کہ سکینہ کی گروپ میں شمولیت پر اس کے ہمسائے ملے جلے ردعمل کا اظہار کر رہے تھے۔ گردوپیش کے اکثر لوگ اس پر نکتہ چینی کر رہے تھے اور ڈرا رہے تھے۔ تاہم اس کی حمایت کرنے والے بھی موجود تھے۔ بعض ہمسایوں کا کہنا تھا کہ حکومت نے سیلاب کے موقع پر غریبوں کی امداد کے لئے جو رقم دی تھی گرامین بنک اسی رقم سے قائم کیا گیا ہے۔ لہٰذا تم بنک سے ملنے والی رقم استعمال کر لو۔ یہ رقم واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے چند بزرگوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ ''مصیبت کے دنوں میں اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے۔'' اس قسم کی باتوں کے سبب سکینہ کبھی کبھی پریشان ہوتی۔ اس کے دل میں وسوسے اٹھتے رہے اور وہ سوچتی رہی کہ آیا بنک سے قرض لے کر اس نے ٹھیک کام کیا ہے یا نہیں۔

آخر کار جب سکینہ کو رقم ملی تو وہ دو متضاد جذبوں کی شکار ہو گئی۔ ایک طرف تو وہ بے انتہا خوش تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم اس کے ہاتھ آئی تھی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ یہ رقم اس نے اپنی کوششوں سے حاصل کی تھی۔ اس نے امید اور مسرت کے

مستقبل کے دروازے سکینہ پر کھول دیئے تھے۔ دوسری طرف یہی رقم اس کے دل میں کئی قسم کے خوف اور وسوے پیدا کر رہی تھی۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ فرض کرو کہ یہ رقم گم جائے تو پھر کیا ہوگا؟ میں کہاں سے اتنی رقم حاصل کرسکوں گی؟ اگر میں یہ رقم لوٹا نہ سکی تو پھر کیا ہوگا؟ ان وسوسوں سے سکینہ کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ رحیمہ پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ چونکی اور پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے۔ تم بیمار تو نہیں ہو؟ اس پر سکینہ نے خاموشی سے رقم رحیمہ کے ہاتھوں میں تھما دی اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مہربانی کر کے رقم تم اپنے پاس رکھو'' چنانچہ رحیمہ ہی یہ رقم بھواپور سے کھارک لائی اور پندرہ دن رقم اسی کے پاس رہی۔ سکینہ اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ اس نے کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ رحیمہ سے بھی اس نے درخواست کی کہ وہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ یہ رقم رکھ سکتی۔ لہٰذا اس کو دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ رقم کہیں چوری نہ ہو جائے۔

اس دوران میں سکینہ چیزیں خریدنے کا بندوبست کرتی رہی۔ دو ہفتے بعد رحیمہ اور دور کے ایک رشتہ دار شفیق کی مدد سے اس نے دوسو روپے کی پرانے کپڑے خریدے ان میں قمیضیں، فراک، نیکریں اور سویٹر وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاقوں میں سکینہ نے دو من کھیشری، مسور، ایک من موشری مسور اور پندرہ سیر شکر قندی خریدی۔ ان پر اس کے 509 روپے خرچ ہوئے۔ اس طرح سکینہ نے مجموعی طور پر 709 روپے کی اشیاء خریدیں ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے دس روپے خرچ کئے اور یوں اس کے پاس 41 روپے رہ گئے۔

بعدازاں سکینہ یہ اشیاء فروخت کرنے کے لئے گلی گلی پھیری لگانے لگی۔ جہاں تک شکر قندیاں تھیں وہ ان کو ابال کر بیچنے لگی۔ یہ چیزیں نقد رقم پر ہی فروخت ہوتی تھیں۔ اس لئے سکینہ ان کے بدلے دھان، چاول اور گندم بھی حاصل کرنے لگی۔ دیہاتی لوگ اجناس کے بدلے چیزیں خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں اور نقدی کی صورت میں رقم ادا کرنے سے عموماً گریز کرتے ہیں۔ پہلے روز جب وہ ان اشیاء سے بھری ہوئی ٹوکری سر پر اٹھا کر بیچنے کے لئے نکلی تو اس کو شرم محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس جذبے پر قابو پا لیا۔ اب وہ یہ کام باقاعدگی سے کرتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ پہلے روز پھیری سے واپسی پر اس نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس پچاس روپے نقد تھے۔ اس کے علاوہ پانچ سیر گندم، اور تین سیر مسور تھے۔ یوں اس کے کاروبار کا پہلا دن بہت اچھا رہا تھا۔ تاہم سارے دن کی

مشقت سے وہ کسی قدر نڈھال ہوگئی تھی۔

اپنے کاروبار کی تفصیل بتاتے ہوئے سکینہ نے کہا کہ وہ روزانہ دس روپے فی سیر کے حساب سے چار سیر بھنے ہوئے چنے فروخت کرتی ہے۔ اس طرح اس کو بارہ روپے روز کا منافع مل جاتا ہے۔ شکر قندیوں کی مانگ البتہ زیادہ ہے اور وہ ہر روز تقریباً پندرہ سیر فروخت کر لیتی ہے۔ کسی قدر تاسف کے ساتھ اس نے مجھے بتایا کہ ''سچی بات یہ ہے کہ کوئی میرے لئے کام کرنے والا نہیں۔ میرا بیٹا منڈی سے یہ اشیاء لا دیا کرتا تھا۔ مگر اب وہ بیمار ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ چاروں طرف بارش کا پانی کھڑا ہے اور میں بیٹے کو اس پانی میں باہر بھیجنے سے ڈرتی ہوں۔'' اس طرح سکینہ اصل میں مجھے یہ بتلانا چاہتی تھی کہ اپنے کاروبار میں اس کو زیادہ مشکل یہ درپیش ہے کہ کوئی اس کو چیزیں خرید کر لا کر دینے والا نہیں۔ وہ خود منڈی نہیں جا سکتی اور نہ ہی کوئی ایسا فرد ہے جس پر وہ اعتماد کر سکے اور وہ باقاعدگی سے اس کا یہ کام کر دیا کرے۔ میرا خیال ہے کہ اگر سکینہ کو یہ مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو اس کا کاروبار بہتر ہو سکتا تھا۔ اس مسئلے کے سبب کبھی کبھی ایک دو دن کے لئے اس کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ بہر حال وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے، اس میں اس کے بیٹے شاہ نور، بھائی اور ہمسایہ بچو منڈل کے تعاون کو بڑا دخل ہے۔ سکینہ کا بھائی اکثر آتا رہتا ہے اور چیزیں خرید کر لا دیتا ہے۔

کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع سے سکینہ اپنے خاندان کے روٹی کپڑے کا بندوبست کرتی ہے۔ جب میں نے کاروبار کے بارے میں اس سے پوچھا تو کہنے لگی ''آج تک مجھے گھاٹا نہیں ہوا۔ فائدہ ہی ہوتا ہے اور میں اسی کاروبار سے اپنے تمام اخراجات پورے کرتی ہوں۔''

سکینہ کو روزانہ ڈیڑھ سیر چاول درکار ہوتے ہیں۔ ہر روز وہ تقریباً ایک روپیہ تیل اور لون مرچ پر خرچ کرتی ہے۔ یہ چیزیں وہ ہفتہ وار ضرورت کے مطابق بازار سے لیتی ہے۔ اس نے کبھی سبزی نہیں خریدی۔ اس کے بجائے وہ گردونواح میں وافر مقدار میں ملنے والی کوچو نامی بوٹی استعمال کرتی ہے۔ کوچو وہ روز ہی پکاتی ہے۔ اس سلسلے میں سکینہ نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ '' کچھ عرصہ پہلے تک میں دوسرے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی اور بھیک مانگ کر گزارہ کرتی تھی۔ لیکن اب یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اپنے کاروبار کی وجہ سے میں اپنا اور اپنے بچوں کا گزارہ کر سکتی ہوں۔

بنک سے ملنے والے قرض کی واپسی کے بارے میں سکینہ نے مجھے بتایا کہ کہ وہ قرض کی قسطیں اپنے منافع سے ادا کرتی ہے۔اس معاملے میں وہ خاصی محتاط رہی ہے۔لیکن حالیہ شدید بارشوں اور سیلاب کے باعث اس کا کاروبار تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ گاؤں کے چاروں طرف پانی ہے اور اس کے پاس کوئی کشتی نہیں۔اس لئے وہ باہر نہیں جاسکتی۔ وہ کہنے لگی ''برسات کے دن ہمارے لئے بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ ہماری مصیبتیں اور دکھ بڑھا دیتے ہیں۔ پھر بھی میرے پاس کوئی چھوٹی سی کشتی ہوتی تو میں اپنا کام چلا سکتی تھی۔'' چنانچہ کاروبار مندہ ہونے کے باعث سکینہ نے گذشتہ ہفتے کی قسط اپنی اصل رقم میں سے ادا کی تھی۔

سکینہ نے ابھی اپنا پہلا قرض ادا نہیں کیا۔اس کی پوری رقم واپس کرنے کے بعد وہ مزید قرض کے لئے درخواست دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اب اس بارے میں اس کے تمام شکوک وشبہات دم توڑ چکے ہیں اور وہ کئی نئے جرات مندانہ منصوبے بنا رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آئندہ وہ زیادہ رقم کے لئے درخواست دے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ ''اس بار میں ایک ہزار روپے مانگوں گی اور اس رقم سے ایک گائے خریدوں گی۔''

گرامین بنک کے قرضے کی بدولت سکینہ گھریلو استعمال کی چند چیزیں خرید سکی ہے۔اس وقت دوسری اشیاء کے علاوہ اس کے پاس دو من کھشیری مسور اور ڈیڑھ من دھان بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس نے ایک ہمسائے کے گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس چار چوزے بھی تھے۔لیکن گاؤں میں وبا پھیلنے سے وہ چاروں مر گئے تھے وہ بار بار اس بات پر افسوس کر رہی تھی۔ جہاں تک کپڑوں کا تعلق ہے اس کے پاس ایک ساڑھی ہے اور بچوں کے پاس دو جانگھیے ہیں۔ یہ کپڑے اس نے ایک سال کے عرصے میں اپنے منافع سے نوئے روپے میں خریدے تھے۔ اس نے اپنی جھونپڑی کی مرمت بھی کروائی ہے۔ لہٰذا اب وہ بہتر حال میں ہے جب کہ چند دن پہلے کھنڈر رہی ہوئی تھی۔ سکینہ کے پاس مرمت کے لئے پیسے نہ تھے۔لیکن کاروبار سے منافع آتے ہی اس نے ایک مزدور کی خدمات حاصل کیں۔ مرمت پر کل 125 روپے خرچ ہوئے۔ گذشتہ جون میں وہ اور اس کے بچے بیمار ہوئے تو اس نے بیس روپے دوائی پر خرچ کر دیئے۔ اسی طرح پانچ روپے کی اس نے بیٹے کے لئے کتابیں خریدیں۔ اس نے آس لگا رکھی ہے کہ جلدی اس کا بیٹا پڑھنا لکھنا سیکھ لے گا اور ایک روز معزز فرد بن جائے گا۔

MashalBooks.org

سکینہ کی حالت اب پہلے جتنی خراب نہیں۔ اس کے دن کچھ نہ کچھ بدل گئے ہیں اور وہ خاصی محفوظ ہے۔ پھر بھی وہ خرچ کے معاملے میں بہت محتاط ہے اور اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ اخراجات اس کے آمدنی سے بڑھ نہ جائیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں بھی وہ احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتی۔ بچے کوئی اچھی چیز کھانے کی ضد کریں تو ان کو آئندہ پر ٹال دیتی ہے۔ وہ ان کو سمجھاتی ہے۔بس چند روز صبر کرو پھر جو کہو گے میں کھانے کو دوں گی۔"

میں جب سکینہ سے ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ گذشتہ ایک ہفتے سے اس نے مچھلی گوشت یا دودھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ چند روز پہلے اس نے بچوں کی ضد سے مجبور ہو کر پانچ روپے کا پھل خریدا تھا۔مگر یہ پھل ادھار لیا گیا تھا اور سکینہ نے ابھی قیمت ادا نہیں کی تھی۔ دودھ اس نے خود ایک سال سے نہیں پیا تھا۔ اور مچھلی تین ماہ سے اس کی تھالی میں نہ آئی تھی۔ مارچ اپریل کے دنوں میں شاہ نور شکار کھیلنے گیا تھا اور چند مچھلیاں پکڑ لایا تھا۔تب اس خاندان نے مچھلی سے لطف اٹھایا تھا۔ اب رمضان شروع ہو چکا تھا وہ روزے رکھتی تھی مگر افطاری کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتی تھی۔ اس کے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بس وہ سحری اور افطار کے وقت کھانا کھا لیتی تھی۔

جب میں نے سکینہ سے اجازت لی اور اس کی جھونپڑی سے باہر نکلا تو بارش تھم چکی تھی۔ سورج بادلوں میں سے جھانک رہا تھا اور گاؤں پر اس کی روپہلی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بیوہ سکینہ کی زندگی پر چھائی ہوئی دکھ کی کالی رات ختم ہو رہی ہے اور خوشیوں کی کھڑکیاں اس کے لئے کھلنا شروع ہو گئی ہیں راہ چلتے چلتے بار بار میرے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ "سکینہ اب کبھی بھیک نہیں مانگے گی۔"

تقدیر کی ماری مایا رانی

ہمارے ملک میں بہت سے لوگ موجودہ غیر انسانی سماجی اور معاشی نظام کے بوجھ تلے آہستہ آہستہ دم توڑ رہے ہیں۔ آج ہم مایا رانی جس خاتون کا قصہ آپ کو سنائیں گے، وہ ان بدنصیب لوگوں میں سے ایک ہے۔ یہ عمر رسیدہ عورت ضلع ٹنگائیل کی سلیم پور یونین میں رہتی ہے۔ دکھ درد کی ماری اس دنیا میں مایا رانی کو مصیبتیں ورثے میں ملی ہیں۔ بچپن میں ہی ماں باپ نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ ایک چچا نے اس کی پرورش کی۔ مایا پیدا ہوئی تو ان کے سپنے ٹوٹ گئے۔ باپ نے اسی روز ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بے اولاد ماموں کو ترس آ گیا اور بچی کا بوجھ اس نے خود اٹھانے کا وعدہ کر لیا۔ اس طرح دو سال کی عمر کے بعد مایا کی پرورش اس کے ماموں کے گھر میں ہوئی۔ دنیا میں سانس لیتے ہی رنج والم اور محرومیاں مایا رانی کا مقدر بن گئیں۔ یہاں تک کہ ان کے بوجھ سے اس بے چاری کو اپنے آپ پر بھی قابو نہیں رہا۔

جب میں پہلی بار مایا رانی سے ملنے گیا تو آم کے درخت کے پیچھے سے ایک بوڑھی عورت آتی دکھائی دی۔ وہی مایا رانی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور آنے کا سبب بھی بتایا۔ وہ میرے لئے ساتھ والے گھر سے ایک سٹول مانگ لائی اور خود پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ شاید اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور اس میں تھوڑی بہت جاذبیت بھی تھی۔ لیکن زندگی کے بوجھ نے اس کو کچل رکھا تھا۔ شاید اس کا چہرہ کبھی خوبصورت رہا ہوگا' لیکن اب وہ محرومی اور رنج کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ اس نے سادہ سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور پان چبا رہی تھی۔ وہ خوش گوار لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غالباً اس نے پہلے کبھی کسی کو اپنی دکھ بھری داستان نہ سنائی ہو گی۔ کہنے لگی کہ ''برسوں سے میں کبھی اپنے گھر میں نہیں سو سکی۔ میرے پاس تھوڑی بہت زمین تھی، لیکن گھر نہ تھا۔ یہ گھر مجھے گرامین بنک سے ملنے والی رقم

MashalBooks.org

کے منافع سے نصیب ہوا ہے۔''

اس چھوٹے سے گھروندے کے چاروں طرف جنگلی جڑی بوٹیاں اگی ہوئی تھیں اور وہ تین پھلدار درخت بھی تھے۔ مغرب کی طرف دہرے ٹین کی چھت کا گھر تھا۔ یہ مایا رانی کی بیٹی کا گھر تھا جس میں وہ اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مایا کا داماد بڑھئی ہے اور کسی نہ کسی طور روزی کما لیتا ہے۔ جنوب میں ایک اور جھونپڑی ہے جس میں مایا کا اکلوتا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ کہنے کو مایا کا بیٹا اور بیٹی پاس ہی رہتے ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی مایا کو پوچھا بھی نہیں۔ وہ بس اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ کبھی انہوں نے مایا کو اپنے ساتھ کھانے کو نہیں کہا۔ حالانکہ مایا نے اپنی زندگی کے بہترین سال ان کی پرورش کی نذر کر دیئے تھے۔ مایا کی اپنی جھونپڑی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ سات فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی اس جھونپڑی کو مکان کہنا واقعی زیادتی کی بات ہے۔ جس باڑے میں یہ گھر واقع ہیں، اس کے گرد و پیش ہندو رہتے ہیں۔ تاپوش مجمدار کا گھر مشرق کی طرف واقع ہے اور اب بھی اس پر ماضی کی خوشحالی کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ مایا مجمدار کے دفتری کمرے کے برآمدے میں رہا کرتی تھی۔ اس کے کھانے پینے کے برتن ابھی تک وہیں تھے۔

اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے مایا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے شکایت کے لہجے میں کہا ''مجھے امید تھی کہ لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی اور وہ اپنے سسرال چلی جائیں گی۔ لیکن بیٹا میرے پاس رہے گا اور بڑھاپے میں میری دیکھ بھال کرے گا۔ لیکن وہ تو مجھے بھول ہی گیا ہے۔ کبھی اس نے میری خبر تک نہیں لی۔ میں نے اس کو بڑی محنت کر کے پالا تھا۔ میں نے مہاجنوں سے قرض لیا اور سود در سود ادا کیا۔ اپنی چیزوں کا بھاری بوجھ سر پر اٹھا کر بیچنے کے لئے گاؤں گاؤں پھرتی رہی۔ اتنی مشکلوں سے اس کی شادی کی۔ لیکن مجھے کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ شادی کے ایک سال کے اندر ہی بیٹے اور بہو نے مجھے روٹی یا کوئی اور چیز دینی بند کر دی۔'' خود کو سنبھالنے کے لئے مایا نے قدرے توقف کیا۔ پھر کہنے لگی ''خیر' میں بیٹے کو الزام کیوں دوں۔ اس کا کیا قصور ہے۔ وہ خود کنگال ہے۔ ترکھان کا کام کرتا ہے مگر اتنی روزی نہیں ملتی کہ اپنے خاندان کو پال سکے۔'' یہی کیفیت مایا کی بیٹی کی ہے۔ اس کا شوہر بمشکل اتنا کماتا ہے کہ وہ تین بچوں اور بیوی کا پیٹ بھر سکے۔ وہ دستی مزدور ہے۔ اس لئے اس یک آمدنی بڑھ نہیں سکتی۔ دوسری طرف مہنگائی بڑھتی جاتی ہے اور چیزیں پہنچ سے

باہر ہوتی جاتی ہیں۔

مایا کی جھونپڑی کے اندرونی منظر سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کوئی انسان رہتا ہے۔اگلی اور پچھلی دیواریں مٹی کی بنی ہوئی تھیں جب کہ باقی دو دیواریں ابھی نامکمل تھیں۔ مایا نے ان کو کیلے کے پتوں اور جھاڑیوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار میں دروازے کے لئے کھلی جگہ چھوڑی گئی تھی۔ دروازہ نہ مل سکا۔ تو اس نے ایک ٹاٹ وہاں لٹکا دیا تھا۔ جب میں نے جھونپڑی کے اندر نگاہ ڈالی تو سب سے پہلے چولہا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ مٹی کی صراحی رکھی تھی۔ مٹی کی ایک تھالی اور گلاس بھی دکھائی دیا۔ دو تین اور بھی روزمرہ کے استعمال کے برتن وہاں رکھے تھے۔ پچھلی دیوار پر ایک بوسیدہ ساڑھی لٹک رہی تھی۔ اس دیوار کے ساتھ مٹی کے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مایا یہ برتن بیچتی ہے۔ دوسری طرف بوری کے ساتھ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی پڑی تھی جب کہ بانس کی الماری میں ایک بوسیدہ تکیہ اور غلاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پاس ٹہنیوں کی بنی ہوئی ٹوکری تھی جس میں برتن رکھ کر مایا پھیری لگاتی تھی۔

مایا نے اپنا قصہ جاری رکھا۔ اس نے بتایا کہ ''میرے ماں باپ ان پڑھ تھے۔ انہوں نے ہمارا زائچہ بھی نہ بنوایا تھا۔ تاہم میں نے سن رکھا ہے کہ میں تقریباً پچاس برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ مایا کا باپ ہیرا داس ستر ادھر بڑھئی کا کام کر کے روزی کماتا تھا۔ اس کی کل جائیداد ایک بیگھہ زمین تھی جو اس کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس کی ماں کا تعلق نزدیکی گاؤں بھاگل سے تھا۔ مایا کا ماموں روپ کمار ستر ادھر بھی بڑھئی تھا۔ مایا نے اپنے دادی دادا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بھائی دیب ناتھ اور بہن سورج رانی کی پرورش میں اس کے باپ کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ وہ ایک اور بچی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ اس لئے مایا رانی کی پرورش اس کے ماموں نے اپنے ذمے لے لی۔ ماموں کا نام نورو ستر ادھر تھا اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ مایا کے بھائی نے بڑھئی کا خاندانی پیشہ اپنا لیا اور بہن سورج رانی کی شادی ہو گئی۔ لیکن اب سورج رانی کا ذہنی توازن درست نہیں رہا اور وہ دیوانگی کے عالم میں گاؤں میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ بھائی کا البتہ کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بھارت چلا گیا تھا۔ ماموں نورو کو مایا سے بہت پیار تھا۔ ترکھان کے کام کے علاوہ وہ پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر کام کر کے بھی تھوڑے بہت پیسے کما لیتا تھا۔ اس کا خاندان مختصر تھا اور

MashalBooks.org

اخراجات کم تھے۔ اس لئے اس کی اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔ وہ مایا کو پڑھانا چاہتا تھا۔ مگر تعلیم اس کے نصیب میں نہ تھی۔ چھ برس کی عمر میں اس نے سکول جانا شروع ہی کیا تھا کہ کالے تاپ نے اس کو آ لیا۔ لمبے عرصے تک وہ بستر پر پڑی رہی۔

قرب و جوار میں کوئی اچھا ڈاکٹر نہ تھا۔ اس لئے ماموں نورو مایا کو کندھوں پر اٹھا کر تین چار میل دور ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرتا تھا۔ چھ مہینے بعد وہ تندرست ہو گئی' مگر ایک اور مصیبت انتظار میں تھی۔ انہی دنوں گاؤں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ آئندہ برس سے حکومت تمام شادیوں پر دس سال کے لئے پابندی لگا رہی ہے۔ اس پر مایا کا ماموں بہت پریشان ہوا اور اس نے مایا کے لئے دولہا تلاش کرنا شروع کر دیا۔

مایا سات سال کی ہوئی تو گوڈر گیتی نامی گاؤں کے ستر ادھر خاندان سے رشتہ آیا۔ کچھ عرصے تک دونوں خاندانوں میں بات چلتی رہی اور آخر کار شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ مایا بالکل بے خبر تھی۔ اس کو کچھ پتہ نہ تھا کہ شادی کیا ہوتی ہے۔ وہ بس یہ سمجھتی تھی کہ ایک نہ ایک روز سب کی شادی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی شادی بھی ہونی ہے۔ یہ بات اس کے چھوٹے سے ذہن میں نہ آئی کہ شادی کے بعد وہ کسی اور کے گھر چلی جائے گی اور پھر وہی اس کا گھر ٹھہرے گا۔ خیر' اس کی شادی ہو گئی۔ ڈھول پیٹے گئے اور رسمیں ادا ہوئیں۔ پھر رواج کے مطابق مایا کو سسرال لے جایا گیا۔ دولہا والوں کی طرف سے اکاون روپے کی سلامی دی جانی تھی' مگر مایا کے ماموں نے اس کو قبول نہ کیا۔

ان باتوں کے دوران مایا نے مجھے بتایا کہ ان دنوں چاول دو تین آنے کا سیر ملتا تھا اور دودھ ایک آنے سیر تھا۔

مایا کا سسر کوئی خوش حال آدمی نہ تھا۔ اس کے پاس کوئی زرعی زمین نہ تھی اور وہ بڑھئی کا کام کر کے روزی کماتا تھا۔ اس کی واحد جائیداد اور زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس پر وہ رہتا تھا۔ یہ ایک کمرے کا مختصر گھر تھا۔ بیٹے کی شادی کے بعد جب بہو گھر آئی تو اس نے ایک اور کمرہ تیار کروا دیا۔

شادی کے وقت مایا کے شوہر کی عمر تقریباً بائیس سال تھی۔ پہلے تین چار سال مایا اپنے سسرال سے زیادہ ماموں نورو کے گھر میں رہتی رہی۔ اس کی ماں ابھی زندہ تھی۔ مگر وہ بچپن ہی سے ماں کی محبت سے محروم کر دی گئی تھی۔ دوسری طرف جب وہ سسرال پہنچی تو معلوم

MashalBooks.org

ہوا کہ اس کی ساس بھی نہیں ہے۔ اس کی ساس بہت سال پہلے زچگی کے دوران مر گئی تھی۔ اس کے سسرال میں صرف تین افراد تھے یعنی ایک اس کا خاوند مویز ستر ادھر، نند تارا داشی اور سسر سارے ستر ادھر۔ مایا نے اس گھر کی ذمہ داری شادی کے کئی برس اور سنبھالی۔ اس خاندان کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی' مگر مایا نے محدود وسائل میں گھر بار کا بندوبست کرنا رفتہ رفتہ سیکھ لیا۔ گھر کا کام زیادہ نہ تھا لہٰذا وہ جلد ہی فارغ ہو جاتی تھی۔ سسر بہت بوڑھا تھا زیادہ کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ موزی باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ یوں باپ بیٹے کی کمائی چار افراد کے کنبے کے لئے کافی ہو جاتی تھی۔ مایا کی تارا سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ سارا وقت ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ پھر جب تارا کی شادی کا وقت آیا تو مایا نے سارا کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ اس کو کوئی جہیز نہ دیا گیا اور شادی کی رسم بھی بہت سادہ انداز میں ادا کی گئی۔

تارا داشی کی رخصتی کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ اس چھوٹے سے خاندان کی مالی حالت قدرے بہتر ہو جاتی۔ مگر اس کے الٹ ہوا اور آمدنی کم ہونے لگی۔ سسر تارے اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ کمزوری کے باعث وہ بہت کم کام کرنے کے قابل رہ گیا تھا۔ روزی کمانے والا اب مویز ہی تھا۔ خیر' گھر میں صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ اس لئے ان کی ضرورتیں کم تھیں۔ کسی نہ کسی طور کام چلتا رہا۔ مگر جب مایا اچھے دنوں کی امید کر رہی تھی تو 1943ء کا خوفناک قحط ٹوٹ پڑا۔

شادی کے تقریباً آٹھ سال بعد مایا نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام چندرا رکھا گیا۔ انہی دنوں لکشمی پور کی پہاڑیوں سے ایک شخص آیا اور اس نے مایا کے شوہر اور سسر کو پہاڑیوں پر بہت معاوضے پر کام کرنے کی ترغیب دی۔ مویز وہاں جانا نہیں چاہتا تھا' مگر آخر کار دوسروں کے اصرار پر وہ نیم دلی سے رضا مند ہو گیا۔

یوں دونوں روزی کمانے والے گھر سے دور چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مایا کو دو ماہ کا راشن ڈال دیا اور وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس کو رقم بھیجیں گے۔ مویز کی پھوپھی ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔ لہٰذا جب مایا اکیلی رہ گئی تو وہ رات کو اس گھر چلی جاتی اور وہیں رہتی۔ اس کو بچی کی بہت فکر تھی۔ وہ بیمار ہو جاتی تو گھر میں کوئی ڈاکٹر حکیم کو لانے والا بھی نہ تھا۔ یوں مایا کے دن پریشانی اور تنہائی میں گزرنے لگے۔ اسی طرح دو ماہ گزر گئے۔ مگر شوہر اور سسر کی طرف سے کوئی رقم آئی اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی اطلاع ملی۔ بچے کچھ

آٹے دال سے مایا نے ایک ماہ اور کاٹ لیا۔ مگر ان لوگوں کی کوئی خبر نہ آئی۔ وہ سراپا انتظار بن گئی۔ دن گزرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ پانچ ماہ گزر گئے اور کوئی اطلاع نہ آئی۔ گاؤں والوں نے مختلف باتیں بنانی شروع کر دیں۔ کوئی کہتا کہ وہ چیچک سے مر گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ دونوں دھوکہ دے کر بھاگ گئے ہیں۔ اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ انہی دنوں قحط شدید ہو رہا تھا۔ غریب لوگوں کی مصیبتوں کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ چاول اور دھان بازاروں سے غائب ہو گئے تھے۔ ضروری اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ اور مایا کے پاس تو پہلے بھی کچھ نہ تھا۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ بھی نہ تھا۔ وہ محنت مزدوری کرنے پر تیار تھی۔ لیکن کون اس کو گھر میں ملازمہ رکھ کر اس کو روٹی دیتا! مجبور ہو کر اس نے گھر کی بعض چیزیں اونے پونے فروخت کر ڈالیں اور یوں زندہ رہنے کا سامان کیا۔

مایا کے زخموں پر گویا نمک چھڑکنے کے لئے لوگوں نے طرح طرح کے توہین آمیز طعنے دینے شروع کر دیئے۔ وہ کہتے "تم میکے چلی جاؤ۔ تمہارا میاں اور شوہر اب نہ آئیں گے۔" کوئی کہتا "ابھی وقت ہے فائدہ اٹھاؤ۔ میری مانو تو شادی کر لو۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر پچھتاؤ گی۔" بعض کم بختوں نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر مایا کسی کے فریب میں نہ آئی۔ اپنی بچی کو لئے وہ انتظار کرتی رہی۔ اس کو اپنے شوہر پر اعتبار تھا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ لوٹ آئے گا۔ مگر حالات بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ایک تو وہ خود فاقوں پر مجبور تھی اور دوسرے بچی بھی تھی جس کو کھلانا پلانا ضروری تھا۔ وہ دوسروں کی خدمت کرنے پر تیار تھی مگر کوئی اس کو ملازم رکھنے پر آمادہ نہ تھا۔ لوگ خود روٹی کو ترس رہے تھے۔ وہ اس بے چاری کو کیا دیتے۔ مایوسی اور دکھ کے عالم میں وہ ہر دروازہ کھٹکھٹاتی اور یوں اس کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا۔ جو ہاتھ آتا وہ اپنی بیٹی کو کھلا دیتی۔ خود اس کا فاقوں سے برا حال ہو رہا تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ بورڈ کی عمارت کے سامنے خوراک کا ایک مرکز قائم ہوا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی لیکن بدقسمتی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ بچی کو اٹھائے وہ گھنٹوں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑی رہتی۔ مگر ایک آدھ روٹی سے زیادہ کچھ نہ ملتا۔ اس کے سارے دن ہی ایک جیسے تھے۔ ان میں کسی امید کا وعدہ نہ تھا۔ یونہی آٹھ ماہ گزر گئے تو ایک روز اچانک اس کو ایک خط ملا۔ خط میں لکھا تھا "ہم نے کچھ رقم بھیجی ہے۔ اب ہم

جلد ہی واپس آ رہے ہیں۔'' اس وقت تک بھوک اور محرومیوں نے مایا اور اس کی بیٹی کی صورتیں بگاڑ رکھی تھیں۔ بچی مشکل سے زندہ تھی۔ ماں بیٹی دونوں دیکھنے میں زندہ لاش نظر آتی تھیں۔ اس خط سے اس کو کچھ سہارا ہوا اور چند روز بعد مویز واقعی لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ باپ کی لاش تھی۔

سسر کی موت کے بارے میں مایا نے مجھے بس یہ بتایا کہ وہ ایک درخت کاٹ رہا تھا کہ اس کے تنے میں سے زہر کی دھار نکلی جس سے وہ بوڑھا آدمی بیمار ہو گیا۔ بخار کے باوجود وہ چند دنوں تک مزدوری کرتا رہا۔ لیکن جب بخار زیادہ تیز ہو گیا تو باپ بیٹا دونوں نے کام بند کر دیا اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں باپ پر چیچک کا حملہ ہوا۔ انہوں نے گھر تک پہنچنے کے لئے کشتی کرایہ پر لی۔ مگر بوڑھا تارے منزل تک نہ پہنچ سکا۔ راستے ہی میں اس نے دم توڑ دیا۔

قبل ازیں باپ بیٹا دونوں معاہدے کے مطابق پہاڑیوں پر کام کرتے رہے تھے۔ مگر ٹھیکدار نے ان کو دھوکہ دیا۔ وہ ان کو نہ تو پورا معاوضہ دیتا تھا اور نہ ہی وقت پر رقم ادا کرتا تھا۔ وہ ان کو واپس بھی نہ جانے دیتا تھا۔ اس طرح وہ اس کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔

مویز شروع ہی سے دمے کا مریض تھا۔ جب وہ باپ کا جسد خاکی لے کر گھر آیا تو اس کی حالت بگڑنے لگی۔ باپ کی آخری رسومات بھی ادا کرنا تھیں اور اس کی جیب خالی تھی۔ چنانچہ اس نے اخراجات پورے کرنے کی خاطر باڑے کی زمین کا ایک حصہ فروخت کر دیا۔ یوں رسوم ادا ہو گئیں۔ مگر مویز کی جسمانی اور ذہنی تکالیف بڑھ گئیں۔

مزید چار سال اس طرح گزر گئے۔ مایا نے ایک اور بیٹی کو جنم دیا جس کا نام انہوں نے ارمی ستر ادھر رکھا اب اس خاندان کے افراد کی تعداد چار ہو گئی تھی۔ حمل کے دنوں میں مایا سخت بیمار اور کمزور ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لئے اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ تب اس کی عمر 35 سال تھی۔ اس کی ساس زچگی کے دوران مری تھی اور مایا کو وہم ہو گیا تھا کہ اس کا انجام بھی مختلف نہ ہو گا۔

مویز ان دنوں پچاس سال سے زیادہ عمر کا ہو گیا تھا۔ دمہ اور دوسری بیماریوں کی وجہ سے وہ بہت لاغر ہو گیا تھا۔ سانس کی تکلیف کے باعث وہ عموماً بستر پر پڑا رہتا۔ اس کی بڑی بیٹی چندرا کو اسہال نے نڈھال کر رکھا تھا اور وہ دوائی کے بغیر پورا مہینہ بیمار رہی اور آخر

کار مر گئی۔

چندرا کی موت سے مایا کو گہرا صدمہ پہنچا۔ وہ ایک بار پھر امید سے تھی۔ برسوں سے مناسب خوراک میسر نہ آنے کی وجہ سے وہ بہت لاغر ہو چکی تھی۔ ان ساری مصیبتوں کے زمانے میں اس نے ایک اور بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام لتا ستر ادھر رکھا گیا۔

خاندان کے افراد کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے اخراجات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور قرض کا بوجھ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ آمدنی کا کوئی پائیدار وسیلہ نہ تھا۔ ان حالات میں مویز نے مجبور ہو کر باقی زمین بھی فروخت کر ڈالی۔ آبائی گھر بھی اسی زمین پر تھا۔ لہٰذا وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جھونپڑی مسمار کی اور پھر اسی سامان سے ساتھ والی اپنی پھوپھی کی زمین پر ایک جھونپڑی بنا لی۔ اس کی پھوپھی بے اولاد تھی۔ لہٰذا ان لوگوں کی قربت سے وہ خاصی خوش ہوئی۔ مویز نے زمین کی فروخت سے ملنے والی رقم دے کر قرض چکا دیا۔ کچھ رقم اس نے اپنے علاج معالجے پر خرچ کی۔ تھوڑے عرصے بعد مویز کی پھوپھی بڑھاپے کے سبب مر گئی۔ تاہم اس بزرگ خاتون نے مرنے سے پہلے اچھا کام یہ کیا کہ زمین کا جو چھوٹا سا ٹکڑا اس کے ملکیت تھا' وہ مویز کے نام کر گئی۔

لتا پانچ سال کی ہوئی تو مایا نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اس لڑکے کا نام لال موہن رکھا گیا۔ اس وقت تک مویز کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ دمے کے مرض نے اس کو لاچار کر دیا تھا اور وہ بیشتر وقت بستر پر پڑا رہتا۔ البتہ کبھی کبھار گھر پر کوئی کام کرنے کو مل جاتا تو وہ تھوڑا بہت کام کر لیتا تھا۔ اس قسم کی آمدنی سے گھر کا خرچ چل رہا تھا لیکن خاندان کی حالت بہت ہی خراب ہو چکی تھی۔ دوسری طرف لڑکی شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی۔ آخر کار بڑی مشکلوں سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کے چند روز بعد لتا کے لئے بھی رشتہ آ گیا' مگر اس کو جہیز دینے کے لئے مایا کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ اس بار انہوں نے پھوپھی سے ملنے والی زمین فروخت کر دی اور جو رقم ہاتھ لگی' اس سے لتا کی شادی کر دی۔ اسی دوران مایا نے ایک اور بچی شپرا کو جنم دیا۔

اس خاندان کے پاس رہنے کے لئے اب ایک انچ زمین بھی نہ رہی تھی۔ چنانچہ مجبور ہو کر انہوں نے ہمسائے میں ایک ویران مکان کو ٹھکانہ بنا لیا۔ اس گھر کا مالک گھر کے سوا باقی سب کچھ بیچ کر بھارت چلا گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا اور مایا نے مجھے بتایا کہ

بعدازاں انہوں نے کسی نہ کسی طور پر مکان اپنے نام منتقل کروالیا تھا۔

چند برس یونہی گزر گئے۔ مویز بالکل ہی معذور ہو گیا تھا جب کہ سب سے چھوٹی بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا اور نہ ہی مویز کے علاج معالجے کا کوئی وسیلہ تھا۔ ان حالات میں مایا ہمسایوں کے ہاں کام کرنے لگی۔ اس طرح جو کچھ ملتا' اس سے خاندان کا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔

حالات سے تنگ آئی ہوئی مایا کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ایک ہمسائے سے دس روپے ادھار لئے۔ اس رقم سے مایا نے کمہار سے مٹی کے برتن خریدے اور ان کو بیچنے کے لئے گاؤں میں پھیری لگانے لگی۔ یہ مایا رانی کے کاروبار کا آغاز تھا۔

کچھ عرصے بعد بنگلہ دیش کے قیام کے لئے 1971ء کی جنگ شروع ہوگئی اور مایا کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ مایا اور اس کے گھر والے اس زمانے میں بہت سہمے ہوئے تھے۔ وہ ہندو تھے جب کہ الشمّس اور البدر کے لوگ ہندوؤں کو خاص طور پر نشانہ بنا رہے تھے۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ بھی نہ رہا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر ان لوگوں نے اپنی ساری چیزیں بیچیں اور فرار ہو گئے۔ بنگلہ دیش قائم ہو گیا۔ تو یہ لوگ بھی اپنے گاؤں لوٹ آئے اور ایک جھونپڑی میں رہنے لگے جس میں کبھی باورچی خانہ ہوا کرتا تھا۔ مایا ایک بار پھر گھروں میں کام کرنے لگی۔ اس کا بیٹا موہن لال بھی اب تھوڑا بہت کام کرنے لگا تھا۔ مکان کی فروخت سے مایا کے پاس تھوڑے بہت پیسے بچے ہوئے تھے۔ اس رقم کو وہ بہت سنبھال کر رکھتی تھی اور اب اس کو خرچ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ چنانچہ ان پیسوں سے شپرا کے بیاہ کا بندوبست کیا گیا۔ مصیبتیں آپ جانتے ہیں کہ اکیلی نہیں آیا کرتیں۔ چنانچہ ایک طرف قحط میں شدت پیدا ہو رہی تھی اور دوسری طرف مویز کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ وہ گھر کے سامنے درختوں کے نیچے بیٹھ جاتا اور راہگیروں پر چیختا۔ ''تم کون ہو! مجھے کچھ پیسے دے کر جاؤ۔'' اس وقت تک مایا نے مٹی کے برتن بیچنے کا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ مگر اس سے بہت کم روزی نکلتی تھی۔ قحط نے لوگوں کو نڈھال کر دیا تھا اور ان کی قوت خرید ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ مایا نے یہ کام چھوڑ دیا اور دوبارہ گھروں میں کام کرنے لگی۔ اس کا بیٹا بڑھئی کا کام سیکھ رہا تھا۔ دکھ اور مصیبت کے دو سال اور گزر گئے اور پھر مویز ستر ادھر کا انتقال ہو گیا۔

شوہر کی وفات کے بعد مایا نے اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے ساہوکار سے

قرض حاصل کیا۔ سود کی شرح واقعی ہوش اڑانے والی تھی۔ چنانچہ مایا کو ماہانہ دس فیصد سود ادا کرنا پڑتا تھا اور اگر کسی وجہ سے وہ ماہانہ سود ادا نہ کر پائے تو اس کو مزید دو فیصد ماہانہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز مایا نے بڑی خوشیوں اور امیدوں سے اپنے بیٹے موہن کا بیاہ رچایا۔ مگر اس کے دکھ کسی طور کم نہ ہونے والے تھے۔ چنانچہ شادی کے ایک سال کے اندر ہی بیٹے اور بہو نے مایا کو گھر سے دھکا دے دیا۔ وہ مایا کو روٹی کپڑا بھی نہ دیا کرتے تھے اور اب انہوں نے پناہ گاہ چھین لی۔ مایا کے لئے یہ بڑی مصیبت کی گھڑی تھی۔ ساری عمر وہ آس لگائے ہوئے تھی کہ اس کی بیٹیاں بیاہی جائیں گی اور اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی لیکن بیٹا اس کے پاس رہے گا اور بڑھاپے میں اس کا سہارا بنے گا۔ ایک یہ جھٹکے میں یہ ساری امیدیں اور سارے خواب الٹ پلٹ گئے۔ اس نے اپنا کاروبار ایک بار پھر شروع کرنے کا سوچا۔ مگر اس کے لئے رقم کہاں تھی؟ اب وہ اتنی بوڑھی ہو چکی تھی کہ ساہوکار بھی اس پر اعتماد نہ کرتے تھے۔

مصیبت کے ان دنوں میں گرامین بنک نے مایا کا ہاتھ تھاما اور اس کو تھوڑی بہت مدد فراہم کی۔ مایا نے اس بنک کا ذکر اپنے گاؤں کی ایک لڑکی حنا رانی سے سنا تھا۔

بعد ازاں مایا نے چند عورتیں اکٹھی کیں اور انہوں نے مل کر بنک کے فلیڈ مینجر سے ملاقات کی۔ پھر اس نے پانچ عورتوں کا گروپ بنایا۔ ان سب کو سات دن کی تربیت دی گئی۔ تربیت کے خاتمہ پر مایا کو گروپ کی سربراہ منتخب کر لیا گیا۔

اس گروپ کی دو ارکان' اترارانی اور سمپرن بی بی کو روپے کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کو قرض مہیا کیا گیا۔ اس کے دو ماہ بعد 25 جون 1980ء کو مایا رانی کو بھی اس کے حصے کا قرض مل گیا۔ اس کو پانچ سو روپے ملے۔ مایا نے اس رقم سے فوراً اپنا پرانا کاروبار شروع کر دیا۔ اس نے کمہار سے چار سو روپے کا سامان خریدا لیکن سامان کمہار کے پاس ہی رہنے دیا۔ اس سے تھوڑی تھوڑی چیزیں لا کر وہ فروخت کرتی رہی۔ اس کے علاوہ مایا نے 75 روپے کی ٹہنیوں کی بنی ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری بھی خریدی۔

مایا اپنا سامان گاؤں گاؤں لے جا کر بیچنے لگی۔ وہ دھان' مسور' گندم اور دوسری قسم کے اناج کے بدلے بھی اپنی چیزیں فروخت کرتی۔ پہلے قرض کی رقم سے اس نے جو کاروبار

MashalBooks.org

شروع کیا تھا۔ اس سے منافع حاصل ہونے لگا اور اس منافع کے باعث وہ1980ء کے سیلاب کے مصائب آسانی سے برداشت کرنے کے قابل ہوگئی۔ سیلاب کے بعد اس نے یہی کام دوبارہ شروع کر دیا۔ ہر ہفتے وہ دس روپے کی قرض کی قسط واپس کرنے لگی یہ رقم وہ منافع سے ادا کررہی تھی۔

پانچ سو روپے کے پہلے قرضے سے حاصل ہونے والی آمدنی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مایا نے بتایا کہ وہ ہر ہفتے چار پانچ دن مٹی کے برتن فروخت کرنے کے لئے پھیری لگاتی تھی۔ اناج کے علاوہ وہ برتنوں کے بدلے گاہکوں سے کرم خوردہ دھان بھی قبول کر لیتی تھی۔ پھر وہ اس کو بڑی احتیاط سے صاف کرتی اور دھان کے دانوں کو80روپے فی من کے حساب سے فروخت کر دیتی۔ اس طرح محنت ومشقت کر کے مایا نے اپنا پہلا قرضہ چالیس ہفتوں میں مکمل طور پر اتار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے قرضے کی رقم ایک سال کے بجائے دس ماہ میں واپس کر دی۔ برتنوں کے بدلے ملنے والا اناج منڈی میں ہر ماہ 240روپے میں بک جاتا تھا۔ یوں وہ دس ماہ میں2400روپے کما سکی۔ تاہم وہ اس مجموعی رقم میں سے دو ماہ کی آمدنی مہیا کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ سال میں دو ماہ اس کا کاروبار ٹھپ رہا تھا۔

مایا نے اپنے پہلے قرضے کی آخری قسط22جون1981ءکو ادا کر دی۔ اس کے بعد3جولائی1981ءکو اس کو دوسرا قرضہ مل گیا۔

روزمرہ کے تمام اخراجات پورے کرنے کے علاوہ مایا نے پہلے قرضے کی رقم سے دو سو روپے بچا کر اپنے لئے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی اور گھاس پھوس کی جھونپڑی ہے۔ لیکن اس طرح مایا کو سر چھپانے کی ایسی جگہ مل گئی جس کو وہ اپنا کہہ سکتی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک ہمسائے کے برآمدے میں رہا کرتی تھی۔

گرامین بنک سے قرضہ حاصل کرنے کے لئے مایا جب اپنا گروپ بنا رہی تھی تو اس کے دل میں بہت سے وسوسے پیدا ہورہے تھے ہمسائے بھی طرح طرح کی باتیں بناتے تھے۔ وہ کہتے ”تمہیں کون رقم دے گا“ مگر مایا نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ لگن سے کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کئی رکاوٹیں پار کر کے اس نے بنک سے قرضہ حاصل کر ہی لیا۔

میں نے مایا سے خوراک کے بارے میں پوچھا تو وہ بتانے لگی کہ پھیری سے واپس

آنے پر شام کے وقت وہ اپنا کھانا پکاتی ہے۔ وہ صرف رات اور صبح کو کھانا کھاتی ہے۔ بازار سے وہ صرف تیل، مرچیں، نمک اور اس قسم دو چار چیزیں ہی خریدتی ہے۔ کبھی کبھار وہ ایک دو روپے کی مچھلی بھی خرید لیتی ہے۔ سبزیاں وغیرہ وہ گردونواح سے حاصل کر لیتی ہے۔ اپنے گزشتہ ہفتے کی خوراک کے بارے میں مایا نے مجھے بتایا کہ ایک دن پہلے اس نے دو روپے کی مچھلی خریدی تھی۔ کبھی کبھی وہ چٹنی سے روٹی کھا لیتی ہے۔ مایا کے روز و شب اسی انداز میں گزر رہے ہیں۔

MashalBooks.org

پھول جان کی زندگی

پھول جان قسمت کی ماری ہے۔قسمت نے اس پر پے در پے وار کئے ہیں۔مگر اس نے اپنی شناخت ضائع نہیں ہونے دی۔ اپنی بدقسمت ماں کی طرح پھول جان بھی اس دنیا میں دکھ سہنے کے لئے آئی تھی۔ پھول جان نے اپنی ماں کے دکھوں اور نانی کی ہیضے سے موت کے قصے سن رکھے تھے۔ پھول جان کی ماں کا ایک بڑا بھائی اور ایک بہن تھی۔ جب ہندوستان تقسیم ہوا تو اس کا نانا اپنے خاندان کو لے کر اس وقت کے مشرقی پاکستان میں اپنے آبائی وطن باکوتالہ کی طرف لوٹ آیا۔اس سے پہلے وہ آسام (بھارت) میں بندرسا کی کے مقام پر رہتا تھا۔آبائی وطن میں تقریباً ایک سال گزارنے کے بعد وہ خاندان کے دوافراد کے ساتھ بندرسا کی چلا گیا۔اس زمانے میں پھول کی ماں چھوٹی سی بچی تھی۔ لٰہذا بندرسا کی جاتے وقت باپ نے اس کو اپنی ساس کی تحویل میں دے دیا۔ دونوں خاندانوں میں خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رہا۔لیکن جب ایوب خان نے اقتدادسنبھالا تو اس نے پاکستان اور بھارت کے درمیان ڈاک کا سلسلہ کم وبیش منقطع کر دیا۔ یوں خط و کتابت بہت مشکل ہو گئی۔ دونوں خاندانوں کو ایک دوسرے کے خطوط کبھی کبھار ہی ملنے لگے اور ان میں پہلے جیسی باقاعدگی نہ رہی۔ اس دوران پھول جان کا نانا فوت ہو گیا۔اور اس کی ماں کی پرورش اس کی نانی نے کی۔ جب وہ جوان ہوئی تو نانی نے اس کی شادی کر دی۔

پھول جان کے باپ، خلیل میاں' کی عمر تقریباً چھبیس سال ہے اور پھول جان اپنے چھ بہنوں اور تین بھائیوں میں سے سب سے بڑی ہے۔ وہ 1957ء کے لگ بھگ فیروز پور کے علاقہ میں سلیم پور بازار کے قریب واقع سلیم پور گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ خلیل میاں اور اس کا باپ حاتم میاں درزی کا کام کر کے روزی کمایا کرتے تھے۔خلیل میاں نے یہ

کام اپنے باپ سے سیکھا اور جب تک حاتم میاں کام کرنے کے قابل رہا' دونوں باپ بیٹا ایک ہی دکان میں کام چلاتے رہے۔

پھول جان کے باپ کا موجودہ گھر تین مرلے کا ہے۔اس کے دادا حاتم میاں کے پاس چھ مرلے جگہ تھی جس میں سے تین مرلے اس نے بیچ ڈالی اور باقی بیٹے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔

ان دنوں سلیم پور بازار میں صرف حاتم میاں کی درزی کی دکان ہوا کرتی تھی اور وہ اس پورے علاقے میں واحد درزی تھا۔ جب اس کا بیٹا خلیل میاں جوان ہوا تو دکان میں تھوڑی سی توسیع کی گئی۔ حاتم میاں کے ساتھ اب اس کا بیٹا اور ایک ملازم بھی کام کرنے لگے تھے۔اس طرح حاتم میاں کو خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ان لوگوں کے پاس کوئی زرعی اراضی نہ تھی اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ٹیلرنگ کے کام پر ان کی اچھی خاصی گزر ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہمسایوں کا خیال تھا کہ اگر یہ لوگ چاہیں تو زرعی زمین بھی آسانی سے خرید سکتے ہیں۔خیر حاتم میاں کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔اچھے کھانوں پر وہ دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ جو کچھ کماتا اس کا بڑا حصہ کھانے پینے پر صرف کر دیتا۔اس طرح اس نے کچھ زیادہ بچا کر نہ رکھا تھا۔خلیل میاں اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ کو دیکھ کر اس کی عادتیں بھی بگڑنے لگیں۔ وہ اپنی اور باپ کی کمائی اللوں تللوں میں اڑانے لگا۔ باپ نے اس کے یہ لچھن دیکھے تو وشنو پور گاؤں میں اس کی شادی کر دی۔

شادی کے پہلے سال ہی میں اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔مگر خلیل میاں کے چلن نہ بدلے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خلیل میاں منشیات اور شراب کا عادی ہو گیا تھا اور اس کے دن بری صحبتوں میں گزرنے لگے تھے۔ باپ کو اس پر سخت پریشانی تھی۔ اس نے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔خلیل میاں کی شریک حیات بھی اس سے مایوس ہو گئی اور اس کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔تھوڑے عرصے بعد خلیل میاں نے اس کو طلاق دے دی اور پھول جان کی ماں حسینہ سے بیاہ کر لیا۔ اس واقعہ کے بعد خلیل میاں کی شخصیت میں اچھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور وہ دکان میں تھوڑا بہت کام بھی کرنے لگا۔ باپ اور بیٹے کی مشترکہ آمدنی سے گھر کا خرچ چلنے لگا۔ باپ کو امید تھی کہ خلیل اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے گا۔ وہ اپنے طور طریقے بدلے گا اور پھر سے

محنت کرنے لگے گا۔ لیکن اس کی فطرت کے ناگوار پہلو برقرار رہے یوں باپ اور بیٹے میں کشیدگی بڑھ چکی تھی۔ آخر کار انہوں نے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور طویل عرصے تک ایک دوسرے سے دور رہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے حاتم میاں کی نظر کمزور ہونے لگی تھی اور وہ کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ بیچنا شروع کر دیا۔ جب وہ بالکل ہی معذور ہوگیا تو 1976ء کے اوائل میں وہ دوبارہ بیٹے کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ اس کی موت سے چھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ دوسری طرف خلیل کی ماں اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی۔ باپ کی وفات پر اس کی سلائی مشین خلیل کے حصے میں آئی جو بعد میں اس نے پھول جان کو دے دی۔

چھ سال کی عمر میں پھول جان پر چیچک کا حملہ ہوا۔ اس کو ابھی تک یاد ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے اس کو تقریباً تین ہفتے بستر پر لیٹنا پڑا تھا۔ گھر میں پہلا بچہ ہونے کے باعث اس پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ خلیل میاں نے اپنی پہلی بیوی سے پیدا ہونے والے پہلے بچے کو باپ کی محبت سے محروم رکھا تھا۔ اب شاید وہ اس کمی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پھول جان کو وہ بہت پیار کرتا تھا۔ پھول جان نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ بچپن میں اس کو اپنے ہاتھوں سے نہلاتا تھا اور خاص طور پر اس کے لئے بنائے ہوئے فراک پہناتا تھا۔ یوں وہ باپ کی محبت اور شفقت کے سائے میں پھل پھول رہی تھی۔ نو برس کی عمر میں اس نے سلیم پور پرائمری سکول میں داخلہ لے لیا۔ چھوٹے موٹے کاموں کے سوا گھر میں اس کے کرنے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔ خلیل میاں کی یہ لاڈلی بیٹی اس کی دکان پر بھی جایا کرتی تھی اور اس کی سلائی مشین سے کھیلا کرتی تھی۔ اپنی گڑیوں کے کپڑے سینا بھی اس کو بہت پسند تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے اس کو سینے پرونے کے کام سے واقفیت پیدا ہوگئی۔

پھول جان کے سکول کے زمانے میں اس کی ماں نے تین اور بچوں کو جنم دیا۔ مگر ان میں سے سکول جانا صرف پھول جان کو نصیب ہوا۔ اس کا کوئی اور بھائی بہن سکول تک نہ پہنچ سکا۔ ان دنوں باپ اور دادا کی مشترک آمدنی سے زندگی آسانی سے گزر رہی تھی۔ ان کے پاس دو سلائی مشین تھیں۔ دادا حاتم میاں کپڑوں کی کٹائی کیا کرتا تھا۔ جب کہ خلیل میاں اور ایک ملازم مل کر کپڑے سیا کرتے تھے۔ سلائی کا تھوڑا بہت کام پھول جان بھی کرنے لگی تھی۔

پھول جان نے صرف بنگلہ زبان کا سبق لیا۔ قرآن مجید پڑھنا اس نے نہ سیکھا۔

اس کے والدین ناخواندہ تھے۔ یہاں تک کہ وہ قرآن مجید بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ پھول جان کا کہنا ہے کہ ''ہمارے خاندان میں سوائے دادا میاں کے اور کوئی قرآن نہیں پڑھ سکتا۔'' جب اس سے پوچھا گیا کہ اچھی بھلی آمدنی کے باوجود اس کے بھائیوں نے تعلیم کیوں نہ حاصل کی' تو اس کا جواب یہ تھا کہ چونکہ پورا خاندان ہی اَن پڑھ تھا' لہٰذا تعلیم کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ دی۔ تعلیم کے بجائے ان کو درزی کا ہنر سیکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

پھول جان چوتھی جماعت تک پہنچی تھی کہ اس کی شادی کے منصوبے بننے لگے۔ اس کی ایک کزن سراج گنج سب ڈویژن کے مہیش پور گاؤں میں ہمایوں نامی ایک شخص سے بیاہی ہوئی تھی۔ ہمایوں نے پھول جان کے ایک رشتہ تجویز کیا اور ایک روز وہ ہونے والے دولہا اور اس کے باپ کو لے کر بھی آ گیا تا کہ وہ ہونے والی دلہن کو دیکھ لیں۔ باپ بیٹے کو پھول جان پسند آ گئی۔ چنانچہ سلیم پور بازار کے قاضی کے دفتر میں نکاح کی رسم ادا کر دی گئی۔ دولہا کے باپ نے نکاح سے فارغ ہو کر بیٹے کو ہمایوں کے پاس چھوڑا اور شادی کے لئے قریبی رشتہ داروں کو لینے چلا گیا۔ اس طرح چودہ برس کی عمر میں' نومبر 1961ء کے آواخر میں' پھول جان کی شادی پبنہ ضلع کے سراج گنج سب ڈویژن کے گاؤں مہیش پور کے تفضّل حسین سے ہو گئی۔

شادی میں تین ہزار روپے حق مہر قرار پایا تھا۔ پھول جان کے باپ نے دولہا کو کچھ نہ دیا البتہ بیٹی کو اس نے ایک عمدہ ساڑھی' دو بلاؤز اور دو پیٹی کوٹ دیئے۔ پھول جان کی ماں اس کو اپنے سونے کے کانٹے دینے کے ارادے باندھ رہی تھی۔ لیکن پھر اس نے ارادہ بدل لیا۔ دوسری طرف پھول جان کے سسرال نے اس کو سونے کا ایک چھلا دیا۔ جس کا وزن صرف دو رتی تھا۔ یہ چیز بھی انہوں نے محض رواج سے مجبور ہو کر دی تھی۔ پھول جان کے باپ نے بیٹی کے لئے ایک سلائی مشین کی فرمائش کی تھی۔ مگر وہ بھی پوری نہ ہوئی۔

پھول جان کا شوہر تفضّل حسین میاں ایک چھوٹا کاروباری آدمی تھا۔ وہ سوت اور دھاگے کا کاروبار کرتا تھا اور فارغ اوقات میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اس کے والد کلیم میاں کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ تفضّل حسین بھائیوں میں سے سب سے بڑا تھا۔ تفضّل حسین کی شادی سے پہلے اس کی دونوں بہنیں بیاہی گئی تھیں۔

پھول جان کا سسرال کسان خاندان تھا۔ ان کے گھر میں ایک ہل بھی تھا۔ تاہم

MashalBooks.org

پھول جان کو اس بات کی کوئی خبر نہ تھی کہ ان لوگوں کے پاس کتنی زمین ہے۔ بہرحال وہ کوئی خوشحال لوگ نہ تھے۔ ان کے باڑے میں ٹین کی چھت والا ایک مکان تھا جس کی دیواریں پٹ سن کی ڈنڈیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گھاس پھوس کی دو جھونپڑیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک کے دو حصے کر کے گائے کا شیڈ اور باورچی خانہ بنایا گیا تھا۔ خاندان کا بزرگ کلیم میاں ٹین کی چھت والے مکان میں رہتا تھا جب کہ تفضّل حسین اور اس کی شریک حیات کو دوسری جھونپڑی رہنے کو ملی تھی۔

اس خاندان کی اپنی زمین سے حاصل ہونے والی اجناس محض چھ ماہ کے لئے ہی کافی ہوا کرتی تھی۔ سال کے باقی عرصے کے لئے وہ اناج بازار سے خریدا کرتے تھے۔ پھول جان کی ساس گھر کی مالکن تھی اور پھول جان چونکہ گھر میں واحد بہو تھی' لہٰذا پورے خاندان کے کھانے پینے کا بندوبست اسی کے ذمے تھا۔ کھیتی باڑی کی اس کو کچھ خبر نہ تھی اور وہ اس سلسلے میں پوری طرح ہاتھ نہ بٹا سکتی تھی۔ مگر یہ بھی مناسب نہ تھا کہ جب اس کی ساس فصل کی کٹائی کا کام کر رہی ہو تو وہ خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ چنانچہ اس پریشانی سے بچنے کے لئے پھول جان سال کا آدھے سے زیادہ حصہ میکے میں گزارتی تھی۔

سسرال میں رہتے ہوئے پھول جان کھیتی باڑی میں مدد دینے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ ساس کو معلوم تھا کہ پھول جان کو یہ کام نہیں آتا اور وہ اس میں دشواری محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ وہ پھول جان کو اکثر اوقات گھر کے کام کاج کے لئے بھیج دیا کرتی تھی۔ ساس اور سسر دونوں اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ نندوں اور دیوروں سے بھی پھول جان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

شادی کے چند روز بعد شوہر سے البتہ پھول جان کی ان بن شروع ہوگئی۔ اس کی بڑی وجہ بیلا نامی ہمسایوں کی ایک لڑکی تھی جس سے تفضّل میاں پیار کرتا تھا۔ پہلے ایک نند نے پھول جان کو یہ بری خبر سنائی۔ اس کا میاں کاروبار کے سلسلے میں کچھ دونوں کے لئے مختلف مقامات کو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کو پورا ہفتہ گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں پھول جان اپنی ساس کے کمرے میں نند بنوتن کے ساتھ سویا کرتی تھی۔ بنوتن کی شادی بچپن ہی میں ایک نادار گھرانے میں ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ تر اپنے والدین کے ہاں ہی رہا کرتی تھی۔ وہ پھول جان کی ہم عمر تھی اور دونوں میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ چنانچہ کبھی یوں

بھی ہوتا کہ تفضّل رات گئے اپنے کاروباری سفر سے لوٹ آتا۔ لیکن ساس کے اصرار کے باوجود پھول جان اپنے کمرے میں نہ جاتی اور رات نند کے ساتھ پڑی رہتی۔ افواہ یہ تھی کہ تفضّل اس قسم کی راتوں کا فائدہ اٹھا کر بیلا سے ملا کرتا تھا۔

شادی کے چند روز بعد بیلا پھول جان کو دیکھنے آئی تھی۔ اس موقع پر بنوتن نے پھول جان کو بتایا تھا کہ سا کا بھائی اس لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ تاہم پھول جان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا شوہر ابھی تک اس لڑکی کی زلف کا اسیر تھا۔ خیر' شادی کے ایک سال بعد کا قصہ ہے کہ ایک رات پھول جان نے کچی نیند میں محسوس کیا کہ تفضّل کمرے سے باہر جا رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پھول جان گہری سوچ میں پڑ گئی۔ شوہر کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات اس کے دل میں پیدا ہونے لگے اور اس نے تفضّل پر نظر رکھنی شروع کر دی اسی طرح چند روز گزر گئے اور جب پھول جان کی مشکوک سرگرمیوں کا یقین ہو گیا تو اس نے نند کے ذریعے اپنی ساس کو اس معاملے کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے خود بھی تفضّل سے چال چلن بدلنے کو کہا۔ لیکن وہ اس کی بات ماننے کے بجائے غصے میں آ گیا اور چھڑی سے اس کو بری طرح پیٹنے لگا۔

پھول جان نے ایسا ہی ایک اور دردناک واقعہ بھی سنایا۔ وہ بتانے لگی کہ ایک دفعہ تفضّل دو نسوانی قمیضوں کا کپڑا گھر لایا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ ایک معمولی سی ساڑھی کے لئے پھول جان کو کئی کئی دن تک اس کی منتیں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن اب وہ خود ہی دو قمیضوں کا کپڑا لے آیا تھا۔ پھول جان جاننا چاہتی تھی کہ یہ کپڑا کس کے لئے ہے۔ تفضّل نے جواب دیا کہ ان میں سے ایک پھول جان کے لئے ہے اور دوسرا کسی اور کے لئے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس دوسرے ٹکڑے کے پیسے کسی نے اس کو کپڑا لانے کے لئے دیئے تھے۔ مگر وہ تھا کون؟ اس سوال کا تفضّل نے گول مول سا یہ جواب دیا کہ وہ ایک شخص ہے جو قریب ہی رہتا ہے اور یہ کہ پھول جان اس کو نہیں جانتی۔ اس نے کوئی نام نہ لیا کیونکہ اس کو خدشہ تھا کہ پھول جان بنتن کے ذریعے اس شخص کا پتہ چلانے کی کوشش کرے گی۔ تاہم پھول جان نے آخر کار معلوم کر ہی لیا کہ کپڑے کا دوسرا ٹکڑا بیلا کے لئے تھا اور یہ کہ تفضّل نے یہ کپڑا اپنے طور پر بیلا کو تحفے میں دیا تھا۔ اس مسئلے پر ایک رات دونوں میاں بیوی جھگڑنے لگے۔ اس دوران تفضّل غصے سے لال پیلا ہو گیا اور پھول جان کو پیٹنے لگا۔ بات جب پھول جان کی برداشت

سے باہر ہوگئی تو وہ کمرے سے باہر بھاگی۔ اس دوران اس کی ساس شور سن کر جاگ چکی تھی۔ پہلے تو وہ انتظار کرتی رہی کہ شاید میاں بیوی کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ لیکن جب بات بڑھنے لگی تو اس نے پھول جان کو آواز دی۔ مگر پھول جان خاموش رہی۔ وہ اندھیرے میں اس کے دروازے سے لگی کھڑی رہی۔ ساس نے بیٹے کو آواز دے کر پوچھا کہ آیا پھول جان کمرے میں ہے۔ وہ بیٹے کو کوسنے لگی۔ اس پر تفضّل کمرے سے باہر آیا اور پھول جان کو دھکیل کر اندر لے گیا۔ اندر جاتے ہی دونوں پھر لڑنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد دونوں میں کئی روز تک بول چال بند رہی۔ یوں پھول جان کی ازدواجی زندگی کا سلسلہ چلتا رہا۔

1974ء کے قحط کے زمانے میں پھول جان کا ایک بھائی اس کو گھر لے گیا۔ وہ حاملہ تھی۔ میکے جا کر اس نے تفضّل کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ اس کے والد کو یہ بات بری لگی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسے بدمعاش شخص کے پاس واپس نہ بھیجے گا۔ کچھ عرصے بعد پھول جان کا سسر اس کو لینے آ گیا۔ لیکن اس کے باپ نے بتایا کہ وہ پھول جان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے' کیونکہ تفضّل معمولی باتوں پر بھی اس کو مارتا ہے۔ سسر نے پھول جان کے باپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھول جان سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ واپس چلی جائے۔ پھول جان نے سوچا کہ ''میں اس وقت حاملہ ہوں۔ چند روز بعد ماں بن جاؤں گی۔ تب یہ معاملہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بس واپس چلی جاؤں اور تفضّل کو ایک اور موقع دوں۔'' مگر اس کا باپ نہیں مان رہا تھا۔ اس نے پھول جان کو واپس نہ بھیجنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

اس پر پھول جان نے اپنے سسر کو ساری رام کہانی سنا ڈالی' اور بتایا کہ جب بھی وہ میکے آتی ہے تو اس کا میاں کے پاس واپس جانے کو جی کیوں نہیں چاہتا۔ ایسے موقعوں پر وہ چھپ جایا کرتی تھی اور گھر والے اس کو ڈھونڈ کر واپس جانے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ گھر والوں نے اس کو رکشہ میں باندھ کر شوہر کے پاس بھیجا تھا۔ پھول جان کا خیال تھا کہ اگر ان دنوں بھی یوں مجبور کر کے اس کو واپس بھیجا جاتا تھا تو وہ اب کیوں رک جائے۔ آخر کار اس نے مقدر کے سامنے سر جھکا دیا اور سسر کے ساتھ واپس جانے پر تیار ہوگئی۔ یہ بات اس کے باپ کو پسند نہ آئی۔ مگر پھول جان سسرال روانہ ہوگئی۔ تفضّل کا رویہ پھر بھی نہ بدلا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قدر مار پیٹ کے بعد پھول

جان واپس آنے کی جرات نہ کرے گی۔ مگر وہ آ گئی تو پھول جان کے ساتھ ساتھ اس کو باپ پر بھی غصہ آیا جو اس کو واپس لایا تھا۔ اصل قصہ یہ تھا کہ اس کے باپ کو بیٹے کی حرکتوں کا علم ہو گیا تھا اور وہ بہو کو واپس لایا ہی اس امید پر تھا کہ شاید اس طرح تفضّل سدھر جائے۔

ان دنوں اس خاندان کی مالی حالت پہلے سے بھی بد تر ہو گئی تھی۔ گھر میں نیم فاقے کی کیفیت تھی۔ پھول جان کے دکھ اور تکلیفیں بڑھ گئی تھیں۔ دو مہینے اسی حالت میں گزر گئے۔ ایک بار پھر تفضّل نے بیوی کو بری طرح زدوکوب کیا اور دونوں میں تقریباً ایک ماہ تک بات چیت بند رہی۔ اس دوران تفضّل نے دھان کی فصل کی کٹائی کے لئے ایک ساتھ کے ہمراہ دو ماہ کے لئے سلہٹ جانے کا ارادہ کیا۔ روانگی سے دو تین روز پہلے پھول جان نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس کو میکے چھوڑ آئے۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی اور کے ساتھ چلی جائے اور اگر ہمیشہ کے لئے چلی جائے تو اچھی بات ہو گی۔

پھول جان نے یہ تین مہینے اپنے شوہر کے ساتھ بہت ہی تلخی میں گزارے تھے۔ چنانچہ اب اس نے ہمیشہ کے لئے جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔ تفضّل کی روانگی کے دوسرے ہی روز اس نے اپنے بارہ سالہ دیور عبدالحق کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس کو میکے پہنچا دے۔ یہ 1974ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔

خلیل میاں نے پھول جان کو دیکھتے ہی صاف صاف کہہ دیا کہ ''اگر تم ہمیشہ کے لئے آئی ہو تو ہم تیار ہیں۔ ورنہ ابھی اپنے دیور کے ساتھ لوٹ جاؤ'' اس پر پھول جان پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی ہے۔ خلیل میاں کو اب بھی اس بات کا رنج تھا کہ پہلی بار بیٹی نے اس کی بات نہ مانی تھی۔ تب سے پھول جان مہیش پور واپس نہیں گئی۔ اپنی داستان سناتے ہوئے وہ کہنے لگی کہ ''کیا میں صرف دکھ سہنے کے لئے اس دنیا میں آئی ہوں۔''

باپ کے گھر آنے کے ایک ماہ بعد پھول جان نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس کا نام کبیر الاسلام رکھا گیا۔ پھول جان کے میکے میں بھی حالات ٹھیک نہ تھے۔ غربت اور محرومی کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ پھر بھی خلیل میاں نے زچہ بچہ کی دیکھ بھال کی ہر ممکن کوشش کی۔ ادھر تفضّل کا یہ حال تھا کہ وہ بیوی تو کیا اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے بھی طویل عرصے تک نہ آیا۔

MashalBooks.org

بچے کی پیدائش سے فارغ ہو کر پھول جان نے چند روز آرام کیا اور پھر باپ کے گھر میں سلائی مشین پر کام کرنے لگی۔ ان دنوں خلیل کا بوڑھا والد بھی اسی گھر میں آ چکا تھا۔ یوں خلیل میاں کے پاس دو سلائی مشین ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو سلائی کا کام سکھانا شروع کر دیا تھا۔ مگر کام بہت کم ملتا تھا۔ لہٰذا خلیل میاں نے دو بڑے بیٹوں کو کہیں اور محنت مزدوری کے لئے بھیج دیا۔ دکان پر وہ تنہا کام کرنے لگا اور باپ کی پرانی مشین گھر لے آیا تھا۔ پھول جان کو یہاں آئے اب ایک سال ہونے کو تھا۔ مگر تفضّل نے اس کی یا اس کے بیٹے کی کوئی خبر نہ لی تھی۔ میکے آنے کے پانچ چھ ماہ بعد پھول جان کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ اس کے شوہر نے بیلا سے شادی کر لی ہے اور یہ کہ اس پر تفضّل کا باپ بہت برہم ہوا تھا اور اس نے ایک ماہ تک اس کو اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔

اگلے برس یعنی 1975ء میں خلیل میاں کی دکان میں دو چوریاں ہو گئیں۔ پہلی بار صرف چند کپڑے چوری ہوئے اور خلیل میاں کو گاہکوں کو رقم ادا کرنی پڑی۔ دوسری بار اس کی سلائی مشین بھی چوری ہو گئی۔ یوں اس کے پاس صرف ایک مشین رہ گئی جو گھر میں پھول جان کے زیرِ استعمال رہتی تھی۔

ان چوریوں کے سبب سلیم پور سے خلیل میاں کا دل کھٹا ہو گیا۔ اس نے یہ گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ 1976ء کے اوائل میں اس نے ٹنگائل نامی قصبے کے نئے بازار میں ایک ٹیلرنگ شاپ کرائے پر حاصل کی۔ اس دکان میں دو سلائی مشینیں تھیں۔ بہت سے غور و فکر کے بعد اس نے پھول جان کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے نواحی گاؤں ڈگولیہ کے دو کمروں کے ایک مکان کا ایک کمرہ تیس روپے ماہوار کرائے پر حاصل کر لیا۔

ٹنگائل میں خلیل میاں نے درزی کا کام اپنے دو بیٹوں کے ساتھ مل کر شروع کیا۔ جب کہ ڈگولیہ میں پھول جان گھر پر باپ کی سلائی مشین پر کام کرنے لگی۔ اس کے علاوہ وہ کھانا پکاتی اور گھر کا دوسرا کام کاج بھی کرتی۔ رات کو خلیل میاں یا اس کا کوئی ایک بیٹا گھر آ جاتا جب کہ باقی لوگ دکان پر ہی رات بسر کرتے۔ گھریلو ضروریات پر پھول جان کو زیادہ رقم خرچ نہ کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ بچانے لگی۔ ایک سال یونہی گزر گیا۔ اس دوران پھول جان کے لئے چند ایک رشتے آئے۔ ان میں سے ایک اس کے چچا کی وساطت سے آیا تھا۔ اس لڑکے کا تعلق چرابنیاں گاؤں سے تھا۔ مگر پھول جان کو یہ کسی

MashalBooks.org

نے نہ بتایا کہ تھا کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔ بعد میں پھول جان کو معلوم ہوا کہ اس کی پہلی بیوی بھی ہے۔ لہٰذا اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس کے چچا نے شادی کے لئے خلیل میاں کو راضی کر لیا تھا۔ مگر پھول جان ڈٹ گئی۔ وہ ساری عمر تنہا رہنے پر تیار تھی مگر دوسری بیوی بن کر رہنا اس کو برداشت نہ تھا۔ باپ نے جب زیادہ اصرار کیا تو پھول جان اپنی دادی کے پاس بھاگ گئی جو اپنی بیٹی کے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے دادی اور پھوپھی کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور ان کی منت کی کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھ لیں۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنا خرچ وہ خود اٹھائے گی اور اپنا کھانا پینا الگ رکھے گی۔ وہ سلیم پور واپس نہ جانا چاہتی تھی جہاں اس کی ماں اپنے کئی چھوٹے بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں کے گھر میں اس کے لئے ویسے بھی گنجائش نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہ گھر بازار کے قریب تھا اور اس کا ماحول پھول جان کے لئے سازگار نہ تھا۔ اس لئے بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اپنی پھوپھی کے گھر پناہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ 1974ء کے اواخر کی بات ہے۔ پھوپھی کے گھر آئے ہوئے وہ اپنی بہترین ساتھی، یعنی سلائی مشین ساتھ لانا نہ بھولی تھی۔

یہاں ہم دو چار باتیں پھوپھی کے بارے میں بھی بتا دیں۔ وہ خلیل میاں کی بہن تھی۔ اس کے خاوند کا نام حشمت علی تھا۔ اس کے تین بچے تھے جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ حشمت اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتا تھا، جب کہ اس کی بیٹی کی شادی ایک بہت ہی غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ اکثر اوقات اپنے باپ کے گھر رہا کرتی تھی۔

پھول جان کو یہاں رہنے کی اجازت مل گئی اور اس نے سلائی کا دھندا شروع کر دیا۔ یوں اس نے کچھ پیسے بچالئے۔ وہ اپنا اور اپنے بیٹے کا کھانا خود پکاتی تھی۔ ابتدا میں معاملات درست رہے لیکن وہ بہرحال اس گھر کا فرد نہ تھی۔ اس نے یہاں پناہ مانگی تھی جو اس کو مل گئی تھی، مگر اس کو یہاں کوئی آزادی حاصل نہ تھی۔ زندگی کے تکلیف دہ تجربے کی بنا پر اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے بیٹے کو پڑھائے لکھائے گی اور ایک معزز آدمی بنائے گی۔

پھوپھی کے گھر پھول جان نے چار طویل برس گزارے۔ اس دوران اس نے کئی مصیبتیں اور سختیاں برداشت کیں۔ دادی اس کی سرپرست اور محافظ کا کردار ادا کر رہی تھی اور ہر برائی سے اس کو بچاتی تھی۔ پھول جان نے پناہ دینے والے رشتہ داروں کے ساتھ محبت اور

خلوص کے رشتے برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ ایک عمدہ درزن تھی اس نے یہاں آنے کے بعد اس کو سلائی کا بہت سا کام بھی ملنے لگا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں کے ہر طرح کے لباس تیار کر لیتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض فیشن ایبل کپڑے سینا بھی اس کو آ گیا تھا۔ مردوں کے کپڑوں کی سلائی کا کام وہ قبول نہ کرتی تھی۔ اس کو احساس تھا کہ مردوں کے کپڑے سینے سے گاؤں میں اس کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ کسی اور کے گھر میں رہتی تھی اور اگر اس کی وجہ سے گھر میں اجنبی مرد آنے لگے تو لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگیں گے۔ مردوں کے جسم کا ناپ لینا تو واقعی گاؤں والوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتا۔

پھول جان سلائی کا معاوضہ دوسروں سے کم لیا کرتی تھی۔ کپڑے سلوانے کے لئے آنے والی بعض عورتیں اس کے پاس بھی بیٹھ جاتیں اور وہ ان کی مرضی کے مطابق لباس تیار کر دیتی۔ گاہکوں کو اس کی ایک اور سہولت بھی میسر تھی۔ وہ یہ کہ پھول جان ادھار پر کام کر دیتی تھی اور جب گاہکوں کے پاس پیسے آتے تو وہ ادا کر دیتے۔ گاؤں میں اس طرح کی باتوں کے سبب چھوٹا بڑا ہر کوئی اس کو چاہنے لگا تھا۔ تہواروں کے موقع پر وہ خاص طور پر پھول جان کی خدمت حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ گردونواح کے دیہات سے بھی گاہک اس کے پاس آنے لگے۔

پھول جان کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی سلائی مشین بہت پرانی ہو چکی تھی اور صحیح طریقے سے کام نہ کرتی تھی۔ یوں بعض اوقات اس کو بعض گاہک واپس بھیجنا پڑتے تھے۔ وہ سلائی کے لئے قیمتی کپڑے بھی قبول نہ کرتی تھی، کیونکہ اس کو خدشہ تھا کہ مشین ان کو خراب کر دے گی۔ اس طرح مہارت رکھنے کے باوجود پھول جان اچھی طرح کام نہ کر سکتی تھی اور اس کی آمدنی پر برا اثر پڑنے لگا تھا۔ اس کے باوجود چند برسوں میں اس نے چھ سو روپے بچا لئے۔

جب میری پھول جان سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ بارہ روز پہلے وہ اپنی مرضی کے خلاف پھوپھی کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اب اس نے وہاں واپس نہ جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ''کیا وہاں تمہارا کوئی جھگڑا ہوا تھا اور کیا تم نے پھوپھی کا گھر پہلے بھی کبھی چھوڑا تھا؟ پھول جان کا جواب یہ تھا کہ ''بدقسمتی سے یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے غصے سے مغلوب ہو کر وہ گھر چھوڑا۔''

''مگر تم تو علیحدہ کھاتی پکاتی تھیں اور الگ ہی رہتی تھیں۔ تو پھر جھگڑا کس بات پر

ہوتا تھا؟ ویسے بھی ان لوگوں نے تمہیں پناہ دی تھی، تمہیں ان سے لڑنا نہیں چاہئے تھا۔''

پھول جان نے جواب دیا ''میں لڑنا تو نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو ہی جاتی تھی۔''

اصل بات یہ ہے کہ جب گاہک اس کے پاس آتے اور گھر میں بیٹھ کر باتیں کرتے تو اس کی پھوپھی کے خاندان والوں کو یہ بات پسند نہ آتی۔ وہ اس کا بے جا مداخلت خیال کرتے تھے۔ ان لوگوں کو پھول جان کے کردار پر بھی شبہ تھا اور وہ باتیں بناتے تھے۔ جب وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتی تو بات بڑھ جاتی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کی پھوپھی زاد بہن کسی گاہک کی قمیض وغیرہ چپکے سے اٹھا لیتی اور بعد میں پھول جان کو پتہ چلتا کہ گم ہونے والی قمیض تو پھوپھی زاد نے زیب تن کر رکھی ہے۔ شروع شروع میں پھول جان نے ایسے موقعوں پر زبان بند رکھی، کیونکہ وہ بات بڑھانا نہ چاہتی تھی۔ ایسے معاملے کا ذکر اس نے صرف خلیل میاں سے کیا تھا اور اس نے پھول جان کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب چوری کی وارداتیں بڑھنے لگیں تو مجبور ہو کر پھول جان نے اس بارے میں اپنی پھوپھی سے بات کی۔ پھوپھی کو اس بات پر بہت غصہ آیا کہ اسکی بیٹی پر چوری کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے پھول جان کو برا بھلا کہا اور ساتھ ہی گھر چھوڑنے کو بھی کہہ دیا۔ یوں پھوپھی کے گھر آنے کے دو سال بعد پھول جان کو پہلی بار وہاں سے نکلنا پڑا اور اس نے ایک ہمسائے کے گھر میں پناہ لی۔ وہ اپنی مشین بھی لے آئی اور وہیں کام کرنے لگی۔ اس واقعہ کے تقریباً تین ہفتے بعد پھول جان کی دادی نے پھوپھی اور بھتیجی میں صلح کروائی اور اس کو واپس لے آئی۔

بعد ازاں ایک اور سخت واقعہ پیش آ گیا۔ ہوا یوں کہ گاؤں کی چوپال نے پھول جان کو تین بڑے پردے بنانے کے لئے کپڑا دیا۔ ان میں سے دو پردے 21 فٹ لمبے تھے اور تیسرا 15 فٹ لمبا تھا۔ چوپال والوں نے پردوں کے لئے مختلف رنگوں کے کپڑے خریدے تھے اور سلائی کی خاطر دینے سے پہلے ان کے ٹکڑوں کو گن لیا تھا۔ پھول جان نے ڈیڑھ سو روپے کے معاوضے پر پردے سینے کی حامی بھری تھی۔ اس نے مناسب وقت پر پردے تیار کر کے کلب والوں کے حوالے کر دیئے۔ چونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس نے پردوں کی تیاری میں سارا کپڑا صرف کر دیا ہے، اس لئے پھول جان نے ٹکڑوں کو گننے کی پروا نہ کی۔ چوپال

والے البتہ اس قدر بے پروا نہ تھے۔ انہوں نے ٹکڑے گنے تو معلوم ہوا کہ ایک ٹکڑا کم ہے۔ چنانچہ وہ پردے اٹھا کر پھول جان کے پاس لے آئے۔ پھول جان نے ان کو بتایا کہ اس نے سارا کپڑا صرف کر دیا ہے۔ بعد میں تلاش کرنے پر اس نے دیکھا کہ ایک ٹکڑا اس کی پھوپھی کے کمرے میں کسی نے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ چوپال کے ایک دولڑکوں نے جب چوری کا چرچا کیا تو پھول جان کی پھوپھی سخت برافروختہ ہوئی اور اس نے لڑکوں کو گالیاں دیں۔

چوپال کے رکن تقاضا کرنے لگے کہ پھول جان بتائے کہ چوری کس نے کی تھی۔ پھول جان نے اپنی آنکھوں سے تو کسی کو کپڑے کا ٹکڑا چراتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لہٰذا وہ کسی کا نام نہ لینا چاہتی تھی۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ یہ گھر کے کسی فرد کی کرتوت تھی۔ پھول جان نے جب کسی کا نام نہ لیا تو چوپال والے پورے گھر کو برا بھلا کہنے لگے۔ اس پر یہ معاملہ گاؤں کے چوہدری کے پاس پیش کیا گیا۔ اس نے فیصلے کے لئے ایک دن مقرر کیا۔ مگر اس روز پھول جان کی پھوپھی کے گھر کا کوئی فرد پیش نہ ہوا۔ چوہدری کو یہ بات اچھی نہ لگی اور اس نے پورے کنبے کا حقہ پانی بند کرنے کا حکم دے دیا اور یہ بھی کہا کہ اس کنبے کے کسی فرد کو اجتماعی عبادت میں شریک نہ ہونے دیا جائے۔

گاؤں اور کنبے کے اس جھگڑے کا مرکزی کردار چونکہ پھول جان تھی، لہٰذا وہ چوہدری کے سامنے مقدمہ پیش ہونے کے دن سے پہلے ہی پھوپھی کا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس بار اس نے اپنے ایک رشتہ دار سلطان کے گھر پناہ لی۔ تاہم اس بار پھول جان کو اپنی سلائی مشین ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ گاؤں کی ایک لڑکی خدیجہ کو اس نے مشین کا کام سکھا دیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس کو سلائی کا تھوڑا بہت کام ملتا تو وہ خدیجہ کے گھر جا کر اس کی مشین پر کام کر لیتی...... یونہی دن گزرتے گئے۔ آخر ایک روز پھول جان کا باپ آیا اور اس نے گاؤں کے چوہدری سے مقدمہ دوبارہ سننے کی درخواست کی۔ اس کے لئے ایک اور دن طے پایا۔ اس مرتبہ پھول جان نے گاؤں کی پنچائیت میں پیش ہو کر سارا الزام اپنے سر لے لیا اور چوہدری سے معافی کی درخواست کی۔ اس کے بعد پھول جان کا باپ اس کو دوبارہ پھوپھی کے گھر لے گیا۔ اب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ رہنے لگی تھی۔ لیکن اس خاندان کے لوگ اب کسی گاہک کو آنے نہ دیتے تھے۔ یوں پھول جان کا کاروبار خطرے کی زد میں آ گیا۔ چنانچہ ایک بار پھر وہ پھوپھی کے گھر سے نکل آئی۔ اب اس کا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

پھول جان نے اس بار ایک مڈل کلاس ہمسائے کے گھر میں پناہ ڈھونڈی۔ اس کا نام چراغ علی خان ہے، مگر وہ سور جا کے نام سے مشہور ہے۔ پھول جان اس کو'' کا کا'' (یعنی چچا) کہا کرتی ہے۔ اس کے بوڑھے والدین زندہ ہیں۔ پھول جان ان کو دادا اور دادی پکارتی ہے۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ چراغ علی خان کے گھر میں ہی تھی۔ یہاں آئے اس کو چند روز ہوئے تھے۔ اس گھر میں وہ اپنی نئی مشین لے کر آئی ہے جو اس نے گرامین بنک کے قرضے سے خریدی ہے۔ سلائی کا کام وہ باہر والے کمرے میں کرتی ہے اور رات کو دادی اور کا کا کی بیٹی کے ساتھ بڑے کمرے میں سوتی ہے۔ اس لڑکی کو بے بی پکارا جاتا ہے۔ پھولن کا خیال ہے کہ وہ اس گھر میں آرام سے رہے گی۔ زندگی کے دکھ دینے والے تجربوں نے اس کو یہ سکھایا ہے کہ دور کے لوگ قریبی رشتہ داروں سے بھی اچھے ہوا کرتے ہیں۔

مجھے چراغ علی سے گفتگو کا موقع ملا۔ میرا خیال ہے کہ ہو تجربہ کار زمین دار ہے۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔ گنے کے موسم میں وہ کرشنگ مشین حاصل کر کے راب بناتا ہے یوں اس کو خاصا منافع مل جاتا ہے۔ وہ خوش گوار شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر پھول جان یہاں رہی تو وہ کوشش کر کے اس کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ لے گا جہاں وہ رہ سکے اور اپنی آمدنی پر گزر بسر کر سکے۔ وہ کہنے لگا کہ ''ایک بے سہارا عورت کی مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے میں اس کے لئے وہ کچھ کرنا چاہتا ہوں جو اس کے عزیز واقارب نہیں کر سکے۔'' چراغ علی چھ بچوں کا باپ ہے اور مجھے اس کے رویے میں خلوص کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

چراغ علی کے یہاں منتقل ہونے کے بعد سے پھول جان کو زیادہ کام ملنے لگا ہے۔ جہاں تک زندگی کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ گزشتہ سات برسوں کے دوران میں پھول جان کے لیے یوں تو بہت سے رشتے آئے ہیں، لیکن ان میں اکثر مرد پہلے سے شادی شدہ تھے۔ اس کے علاوہ بھی ہر تجویز کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا رہا۔ لہٰذا پھول جان نے شادی کی کوئی تجویز قبول نہ کی۔ گزشتہ عید کے موقع پر اس کا سابق شوہر آیا تھا اور وہ اپنے بیٹے کے لئے چند پرانے کپڑے چھوڑ گیا تھا۔ ان میں ایک قمیض، ایک ٹی شرٹ اور ایک پتلون شامل تھی۔ پھول جان یہ کپڑے رکھنے پر آمادہ نہ تھی۔ لیکن لوگوں نے اس کو سمجھایا کہ اگر اس کا سابق شوہر چاہے تو بیٹے کو ساتھ لے جا سکتا ہے۔

پھول جان کے لئے یہ بہت تکلیف دہ بات تھی۔ لہٰذا اس نے چپ چاپ کپڑے قبول کر لئے۔

اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا بیٹا کپڑے ملنے پر بہت خوش ہوا اور اس نے فوراً کپڑے پہن بھی لئے۔ گاؤں میں یہ افواہ بھی تھی کہ تفضّل میاں پھول جان کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بیلا کے ساتھ شادی کے بعد پھول جان اس کے ساتھ جانے پر کسی طور تیار نہ تھی۔ البتہ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ تفضّل میاں کے ساتھ چلی جائے۔ پھول جان کا حال یہ تھا کہ وہ دوبارہ اس کے ساتھ جانے پر مرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ ہاں اگر اس کو کوئی اچھا مرد مل جاتا تو وہ ضرور اس سے شادی کر لیتی۔ اس طرح اور کچھ نہیں تو زندگی میں کچھ تحفظ ہی میسر آ جاتا۔ جہاں تک مالی معاملات کا تعلق ہے وہ اپنی روزی خود پیدا کر رہی ہے اور اس بارے میں اس کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہے۔ اس کا بیٹا اب سات برس کا ہو چکا ہے۔ پھول جان اس کو سکول میں داخل کروانا چاہتی ہے تا کہ وہ تعلیم حاصل کر سکے۔

1980ء کے سیلاب کے زمانے میں دو ماہ تک پھول جان کو سلائی کا بہت کم کام مل سکا۔ یوں اس کو اپنی بچت کے ایک حصے پر گزارا کرنا پڑا۔ سال میں اس کا بس یہی نقصان ہوا تھا۔ وہ اپنی بچت کو روزہ مرہ ضروریات کے لئے استعمال نہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی خوراک کم کر دی اور بیٹے کو بھی روزانہ صرف ایک روٹی دینے لگی۔ اس کے باوجود وہ اس دکاندار کی 45 روپے کی مقروض ہو گئی جس سے روز مرہ استعمال کی اشیاء خریدا کرتی تھی۔ بعد میں عید کا تہوار آیا تو بہت سا کام ملنے لگا۔ یوں اس نے یہ رقم ادا کر دی۔ اس کے پاس اب بھی چھ سو روپے نقد محفوظ تھے اور اس رقم سے وہ نئی سلائی مشین خریدنا چاہتی تھی۔ اس خواہش کے ساتھ وہ محنت مزدوری کرتی رہی۔

ساہوکار سے رقم ادھار لینے سے پھول جان ہمیشہ ہچکچاتی رہی ہے البتہ ایک بار اس نے کسی کے مشورے پر دس فی صد ماہانہ سود پر ایک سو روپے کسی کو ادھار دیئے تھے۔ یوں دو مہینے کے بعد اس کو بیس روپوں کا فائدہ ہو گیا تھا۔ بعد ازاں اس نے یہ رقم واپس لے کر زمین کے ایک ٹکڑے پر دھان کی کاشت کے لیے استعمال کر لئے۔ اس نے سلطان کو دھان کی کاشت کے دنوں میں چھ سو روپے دیئے اور یہ معاملہ طے کیا کہ اس کو نہ صرف پوری رقم واپس مل جائے گی بلکہ اس کو فصل کا بیسواں حصہ منافع کے طور پر بھی ملے گا۔ مگر فصل اچھی نہ

MashalBooks.org

ہوئی اور سلطان وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اس نے پھول جان کو صرف گیارہ من دھان دیا۔ رقم اب بھی سلطان کے پاس ہی ہے کیونکہ پھول جان کو نقد رقم پاس رکھنے سے ڈر آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے پیسے بنک میں کیوں نہیں رکھتی۔ اس نے جواب دیا کہ ''میں اس رقم سے ٹین کی چادریں خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن بعض مسائل کی وجہ سے یہ کام نہ ہو سکا۔ میں نے پیسے اس لئے بنک میں جمع نہیں کروائے کہ ضرورت پڑنے پر آسانی سے ان کو استعمال کر سکوں۔'' میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ آیا اس نے کبھی کسی کو ساہوکاروں کے چنگل میں پھنستے دیکھا ہے، تو اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔

جب اس علاقے میں گرامین بنک کی شاخ قائم ہوئی تو انہی دنوں پھول جان کو اس کے بارے میں علم ہو گیا تھا ہر مہینے وہ ایک دو بار اپنی ماں سے ملنے جایا کرتی تھی۔ یونہی آتے جاتے ایک روز اس کی نظر بینک کے سائن بورڈ پر پڑی جو اس کی ماں کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔

گرامین بینک کے بارے میں تفصیل پھول جان کو اس کے چھوٹے بھائی نے فراہم کی جو سلیم پور کی ایک رائس مل میں کام کرتا ہے۔ ان کی بعض ہمسایہ عورتوں نے بینک سے قرض لینے کے لئے گروپ بنا رکھا تھا۔ پہلے گروپ میں امبیہ، بیدانہ اور دوسری عورتیں شامل تھیں۔ امبیہ اب اس علاقے میں عورتوں کے گروپوں کی سربراہ ہے۔ امبیہ اور بیدانہ دونوں پھول جان کی ہم عمر ہیں اور وہ بچپن میں سہیلیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان دونوں کو ایک مہینے کے عرصے میں قرض مل گیا تھا۔ پھول جان نے یہ بات سنی تو اس نے بھی بنک سے قرض حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ مگر لوگ کئی باتیں بناتے تھے اور پھول جان کو حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ کوئی اس کو ڈراتا کہ ''اگر تم رقم لوٹا نہ سکیں تو وہ لوگ تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر جیل میں پھینک دیں گے۔'' دوسرے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگ ڈر کے مارے گروپوں میں شامل ہونے سے گریز کرتے تھے۔ یہی حال ابتدا میں پھول جان کا تھا۔ لیکن ایک روز وہ بنک کی ملازمہ صفیہ سے ملی تو اس نے ساری غلط فہمیاں دور کر دیں۔ صفیہ نے اس کو سمجھایا کہ ''لوگ تو بس افواہیں اڑاتے ہیں۔ یہ بنک غریبوں کی امداد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس سے معاملہ کرنے میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔'' صفیہ کی باتوں سے پھول جان کو حوصلہ ہوا۔ اس کے بعد وہ ٹنگائل جا کر اپنے باپ سے ملی اور

اس سے مشورہ کیا۔ خلیل میاں نے ہاں کر دی۔

امبیہ کا گروپ بننے کے صرف ایک ماہ بعد پھول جان نے بھی گروپ سازی شروع کر دی۔ اس اثنا میں امبیہ اور بیدانہ کو قرض مل گیا تھا اورانہوں نے کام شروع کر دیا تھا۔ پانچ ارکان کا گروپ بنانے کے لئے پھول جان اور رضیہ کو سخت محنت کرنی پڑی۔ جب انہوں نے پہلا اجلاس کیا تو چندلوگ آ کر ان کو سخت قسم کی دھمکیاں دینے لگے۔ ان دھمکیوں کے باعث ایک رکن نے گروپ چھوڑ دیا اور اجلاس نہ ہو سکا۔ بعد ازاں انہوں نے حلیمہ نامی ایک عورت کو اپنا رکن بنایا۔ مگر صرف دو اجلاسوں میں شرکت کے بعد حلیمہ بھی خوف کے باعث علیحدہ ہو گئی۔ تاہم باقی ارکان اس کے گھر گئیں اور اس کی ہمت بندھائی۔ جب وہ نہ مانی تو اس کو ساتھ رکھنے کے لئے بنک کے عملے کی مدد حاصل کی گئی۔ چنانچہ بنک کے لوگوں نے حلیمہ کو سمجھایا۔ یوں ایک طرح سے اس کو گروپ کا رکن رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس کو بتایا گیا کہ ''اگر تم گروپ کی رکن نہیں بننا چاہتیں تو پہلے آئی ہی کیوں تھیں؟ اب اگر جانا ہے تو پہلے اپنی جگہ کسی اور عورت کو لاؤ۔''

اس کے بعد گروپ کی طرف سے، گروپ کی سربراہ رضیہ نے اپنا اور پھول جان کا نام قرض حاصل کرنے کے لئے پیش کیا۔ پھول جان اس علاقے کی مستقل رہائشی نہ تھی، لہٰذا بنک کے ایک افسر نے اس کے نام پر اعتراض کیا اور اس کو قرض نہ دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک اور رکن ثمرن کا نام تجویز کر دیا گیا۔

بنک کا فیلڈ مینجر پھول جان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لہٰذا اس نے پھول جان کی خاطر مینجر سے ملاقات کی۔ اس نے بے زمین مردوں کے گروپوں کے سنٹر چیف سے بھی درخواست کی کہ وہ پھول جان کے سلسلے میں مینجر سے سفارش کرے۔ دوسری طرف خود پھول جان نے اس ضمن میں صفیہ کی مدد حاصل کی۔

تین ہفتوں میں گروپ کی پہلی دو ارکان کو قرض مل گیا۔ اور ایک ماہ بعد مزید دو ارکان نے رقم حاصل کر لی۔ اس کے مزید ایک ماہ بعد، یعنی گروپ بنانے کے تقریباً تین ماہ بعد پھول جان کو بھی پندرہ سو روپے کا قرض مل گیا۔ یوں اس کو قرضے کے لئے کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کے رشتہ داروں کو خبر نہ تھی کہ وہ گروپ میں شامل ہو چکی ہے۔ دو تین اجلاسوں میں پھول جان کی شرکت کے بعد ہی ان کو اس بارے میں اطلاع ملی۔ اس دوران میں بنک

کے مینجر نے پھول جان کے چچا سے اس کے بارے میں پوچھا تھا اور چچا نے مینجر کو مشورہ دیا تھا کہ اس کو قرضہ نہ دیا جائے۔ اصل میں سبھی رشتے دار گروپ بنکنگ سکیم میں پھول جان کی شرکت کی مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ چچا نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''اگر تمہارے خلاف کوئی مقدمہ ہوا یا کوئی اور مسئلہ کھڑا ہوا تو ہمیں اس میں ملوث نہ کرنا۔ ہمیں ان باتوں کا کچھ علم نہیں ہے۔ بس ہمیں تو تم معاف ہی کرنا۔''

پھول جان اس علاقے کی مستقل رہائشی نہ تھی اور اس کے رشتے دار بنک سے تعلق کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے پھول جان کے لئے کئی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں اور اس کو رقم ملنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔ پھول جان کا باپ البتہ اس کی کھل کر مدد کر رہا تھا۔ اس نے بنک سے درخواست کی کہ وہ اپنی بیٹی کی ضمانت خود دے گا۔ بنک مینجر بھی دیکھ رہا تھا کہ پھول جان گروپ کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہو رہی تھی اور وہ سکیم کے تمام قواعد وضوابط کی خلوص دل سے پیروی کر رہی تھی۔ چنانچہ آخر کار اس نے پھول جان کو قرضہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

نئی سلائی مشین کی قیمت پھول جان نے معلوم کر رکھی تھی۔ باپ کے ساتھ مشورے سے اس نے پرانی مشین فروخت کرنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ پرانی مشین کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بنک کے قرضے میں شامل کر کے وہ ایک نئی سلائی مشین خرید لے گی۔ چنانچہ اس نے صرف اتنی رقم کے قرضے کے لئے درخواست دی تھی جو نئی مشین خریدنے کے لئے درکار تھی۔

بنک سے رقم ملنے پر پھول جان بہت خوش ہوئی۔ اس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔ بات یہ ہے کہ یوں تو اس کا شوہر تھا اور گھر بھی، بھائی اور ہمدرد بھی تھے، پھر بھی وہ تنہا تھی۔ اس کے پاس وسائل بھی نہ تھے۔ اب وہ ایک ہی خواب دیکھتی تھی کہ کسی طرح اس کا بیٹا معاشرے میں کوئی باعزت مقام حاصل کر لے۔ طویل انتظار کے بعد بنک سے اس کو رقم ملی تھی۔ یہ گویا پھول جان کے لئے اپنے خواب کی تکمیل کی طرف ایک قدم تھا۔ اس رقم سے وہ نئی مشین خریدے گی، یوں وہ زیادہ اور بہتر کام کر سکے گی۔ اس کی آمدنی بڑھ جائے گی۔ وہ دن کے خوابوں میں کھو گئی اور سوچنے لگی کہ زیادہ آمدنی ہو گی تو وہ ایک مکان خرید لے گی۔ اپنے بیٹے کو پڑھائے لکھائے گی۔ پہننے اور کھانے کو اچھی چیزیں نصیب ہونے لگیں گی۔

MashalBooks.org

زندگی میں وہ ساری بازیاں ہار چکی تھی۔ پھر بھی بنک کی امداد ملنے پر وہ ساری ناکامیاں بھول گئی۔ پھول جان خوشی سے جھوم اٹھی۔ مگر دل میں کہیں ایک وسوسہ بھی تھا کہ اگر میں بنک کا ہفتہ وار قسطیں ادا نہ کر سکی تو کیا ہوگا؟ بنک کی رقم ادھر ادھر خرچ ہوگئی تو کیا بنے گا؟

بنک سے رقم مل گئی۔ مگر پرانی مشین فروخت کرنا سہل نہ تھا۔ اس میں کئی روز لگ گئے۔ تقریباً ایک ماہ بعد اس کے باپ، خلیل میاں نے یہ مشین ساڑھے چھ سو روپے میں بیچ دی۔ پچاس روپے اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور چھ سو پھول جان کو دے دیئے۔ خود پھول جان کو جو بنک سے پندرہ سو روپے ملے تھے، ان میں سے پچھتر روپے اس نے گروپ ٹیکس کے طور پر ادا کر دیئے تھے۔ یوں اس کے پاس1425روپے رہ گئے تھے۔ پرانی مشین کی رقم ملا کر کل2025روپے ہوگئے۔ نئی مشین خریدنے کے لئے وہ والد کے ساتھ ٹنگائیل گئی یہاں سے اس نے دو ہزار روپے میں نئی مشین خریدی۔

اس کے علاوہ پھول جان نے اپنی محنت مزدوری سے چھ سو روپے بچا رکھے تھے۔ نئی مشین خریدنے سے دو ماہ پہلے اس نے یہ رقم دھان کی کاشت میں لگا دی تھی۔ اب یہ رقم اس کو واپس مل گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اس رقم سے اپنے مکان کے لئے ٹین کی چادریں خریدنے کا ارادہ کیا ہے۔ نئی سلائی مشین کی بدولت اب وہ پہلے سے زیادہ کام کر رہی ہے اور اس کو معاوضہ بھی بہتر مل رہا ہے۔ انٹرویو کے لئے جب میں اس کے پاس جایا کرتا تھا تو وہ اپنے کام میں مصروف دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ایک دو سہیلیاں بھی کام میں کبھی کبھی اس کی مدد کر دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک بیدانہ ہے۔ بیدانہ کو جب کبھی سلائی کی ضرورت ہوتی ہے تو پھول جان معاوضے کے بغیر اس کا کام کر دیتی ہے۔

پھول جان کو اس کی روزانہ محنت کا خاصا معاوضہ مل جاتا ہے۔ تاہم وہ بہت سا کام ادھار پر کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو زیادہ آرڈر مل جاتے ہیں۔ روزانہ وہ زیادہ سے زیادہ گیارہ کپڑے سی سکتی ہے اور یہ کپڑے کا معاوضہ ڈیزائن، سائز، کپڑے کی نوعیت وغیرہ کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک بار عید کے موقع پر اس نے دن رات کام کر کے انیس کپڑے سیئے تھے جن میں شلواریں، قمیض اور فراک وغیرہ شامل تھے۔ وہ کبھی ناغہ نہیں کرتی۔ البتہ مہینے میں ایک دو بار ٹنگائیل جاتی ہے۔ جہاں وہ اپنے باپ سے ملتی ہے اور سلائی کا سامان وغیرہ بھی خرید لیتی ہے۔ وہ صبح کے وقت جاتی ہے اور شام کو لوٹ آتی ہے۔ ظاہر ہے

کہ ایسے موقعوں پر وہ سلائی کا کام نہیں کرسکتی۔ لیکن وہ جاتی ہی تب ہے جب کام زیادہ نہ ہو۔ اگر وہ صرف دو کپڑوں کی سلائی کرے تو اس کو چار روپے فی کپڑا کے حساب سے آٹھ روپے مل جاتے ہیں۔ جب کام زیادہ ہو تو وہ تیس پینتیس روپے روزانہ بھی کما لیتی ہے۔ کبھی کبھی جب کام زیادہ نہیں ہوتا تو وہ سلائی مکمل کر کے ادھار پر کام کروانے والے گاہکوں سے رقم وصول کرنے چلی جاتی ہے۔

اپنی آمدنی پھول جان روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ باقاعدگی سے ہفتہ وار قسطیں بھی ادا کر رہی ہے۔ اب تک وہ اکیس قسطوں میں 575 روپے ادا کر چکی ہے۔ اس معاملے میں پھول جان کی باقاعدگی قائم ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ادھار کے کاموں کے سبب اس کے پاس قسط جمع کروانے کے لئے نقد رقم کافی نہیں ہوتی۔ تب وہ گھریلو ضروریات کے لئے تھوڑی سی رقم رکھ کر باقی رقم بنک کو دے دیتی ہے۔

میں نے پھول جان سے اس کے ہفتہ وار اخراجات کے بارے میں پوچھا تو اس کا کہنا تھا کہ تفصیل اس کو یاد نہیں رہتی۔ تاہم اس نے بتایا کہ گزشتہ ہفتے اس نے تقریباً پچاس روپے خرچ کئے تھے۔ وہ روزانہ ایک بار تازہ اور ایک بار باسی کھانا کھاتی ہے۔ کسی خاص روز وہ دوبار بھی کھانا پکا لیتی ہے۔ یوں دونوں بار تازہ کھانا دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا بیٹا دن میں تین چار بار تازہ اور باسی کھانا کھاتا ہے۔۔

ایک بار میں پھول سے ملنے گیا تو اس روز اس نے ایک لوکی او ایک کھیرا خرید رکھا تھا۔ تاہم وہ بتانے لگی کہ ایسی چیزیں عام طور پر اس کی خوراک میں شامل نہیں ہوتیں۔

پھول جان غریب دیہاتیوں کے پرانے کپڑوں کی مرمت بھی کر دیتی ہے اور وہ بدلے میں اس کو سبزیاں دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ مچھلی اور سبزیاں بھی لیتی ہے۔ تاہم گزشتہ ہفتے اس نے ایسی کوئی شے نہ خریدی تھی۔ البتہ ایک گاہک اس کو ادھار چکانے کے سلسلے میں دو انڈے دے گیا تھا۔

مشقت کا ذکر کرتے ہوئے مجھے پھول جان نے بتایا کہ گزشتہ ہفتے اس نے پانچ روز کام کیا تھا۔ ایک روز وہ سلیم پور میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی جب کہ ایک دن ایک گاہک کے لئے میٹریل خریدنے اور باپ سے ملنے کی خاطر ٹنگائیل چلی گئی تھی۔ دونوں روز وہ کام نہ کرسکی۔ تاہم ماں سے ملنے والے دن اس نے اپنے بھائی کے لئے ایک قمیض تیار کر لی

تھی۔ٹنگا ئیل جانے والے دن اس نے صبح کے وقت مرکزی میٹنگ میں شرکت کی تھی اور دس بجے وہاں سے روانہ ہوگئی تھی، خیر، عام طور پر وہ ہفتے میں یوں دو روز ضائع نہیں کیا کرتی۔ اس ہفتے میں اس نے مجموعی طور پر پچاسی روپے کا کام کیا تھا۔

اس سے ہم پھول جان کی ہفتہ وار آمدن اور خرچ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ پچاسی روپے کی آمدنی کے مقابلے میں اس کے اخراجات 45.25روپے تھے۔تیس روپے کی ہفتہ وار قسط گرامین بنک کو ادا کی تھی۔یوں اس نے مجموعی طور پر 77.25روپے خرچ کئے اور 7.75روپے اس کے پاس بچ گئے۔

گروپ کی دوسری ارکان کے ساتھ پھول جان کے تعلقات بہت دوستانہ ہیں۔ وہ گروپ کے مرکزی اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتی ہے۔سنٹر کی دوسری تمام ارکان بھی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے مل جل کر کام کرتی ہیں۔

پھول جان کا کہنا ہے کہ گرامین بنک کو ہر کوئی پسند کرتا ہے۔ وہ مجھے بتانے لگی کہ ''طویل عرصے تک کافی جتن کر کے میں صرف چھ سو روپے بچا سکی تھی۔ آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ وہ ہزار روپے جمع کرنے کے لئے مجھے کس قدر پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ بنک کی امداد کے بغیر میں شاید نئی مشین کبھی نہ خرید سکتی تھی۔ میرا یہ خواب ہمیشہ ادھورا رہتا اور میری حالت نہ بدلتی۔ بنک نے مجھے وہ کچھ دے دیا ہے جو میرے والدین یا میرا شوہر بھی نہ دے سکتا تھا۔''

پھول جان اپنی محنت اور اپنی جدوجہد سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔اب بھی وہ دوسری کی عطا کردہ پناہ گاہ میں رہتی ہے۔لیکن وہ اسی علاقے میں زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا خرید کر اپنا گھر بنانے کی آس لگائے ہوئے ہے۔

یہاں میں آپ کو پھول جان کی ملکیتی چیزوں کی تفصیل بھی بتا دوں۔ اس کے پاس المونیم کے پانچ برتن، ٹین کی دو تھالیاں، ایک جگ، ایک گلاس، ایک تکیہ، دو لحاف، ایک تنکوں کی بنی ہوئی چٹائی، چار ساڑھیاں، (جن میں سے دو خاصی پرانی ہیں) ایک بوسیدہ ساڑھی، دو پیٹی کوٹ دو بلاؤز اور ایک کرسی ہے۔ پھول جان کی ساری جائیداد بس یہی کچھ ہے اور یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ حال ہی میں اس نے گرامین بنک کے قرضے سے ایک بالکل نئی سنگر سیونگ مشین خریدی ہے۔اس کا بیٹا کبیر اب سات برس کا ہو چکا ہے۔ وہ اگرچہ

دبلا پتلا اور لاغر سا ہے۔لیکن چلبلا اور شرارتی ہے۔ جب وہ کام میں مصروف ہوتی ہے تو کبیر اس کے لئے کئی مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔

میرے سامنے اس نے اپنی پتلون ماں کی سلائی مشین میں رکھ کر خود ہی اس کے پھٹے ہوئے حصے کی مرمت کر لی تھی۔

جو تھوڑی بہت رقم برسوں کی محنت سے پھول جان نے بچا رکھی ہے، وہ اس سے ٹین کی چادریں خریدنا چاہتی ہے۔ان چادروں کو اپنا گھر بنانے کے لئے استعمال کرے گی۔ چراغ علی کے گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنا یہ خواب مکمل کرے گی۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے غافل نہیں ہے اور اس کو معاشرے میں باعزت مقام دلانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس کا بیٹا مقامی پرائمری سکول میں پڑھ رہا ہے۔

MashalBooks.org

محفل کا گھر

محفل گھریلو عورت' اور کئی بچوں کی ماں ہے۔ زندگی کے دن گزارنے کیلئے اس کو سوجتن کرنے پڑتے ہیں۔

محفل کا گھر ٹنگائیل ضلع کے لوھاریہ نامی گاؤں میں ہے۔1944ء کے لگ بھگ پیدا ہونے والی محفل اپنے والد شفیق مالک کی پہلی اولاد ہے۔ والدین نے بڑے چاؤ سے اس کا نام محفل رکھا تھا۔ شفیق مالک کے بچوں کی تعداد بعد میں بڑھنے لگی۔ چند ہی برسوں میں وہ سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ بن گیا۔ مالی حالت اس کی پہلے بھی اچھی نہ تھی۔ بچوں کی تعداد بڑھنے سے بوجھ بڑھتا گیا۔ چنانچہ محفل اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش غربت' محرومی، سختی اور غفلت کے ماحول میں ہوئی۔ غیر یقینی مستقبل ان بچوں کے سر پر تلوار بن کر لٹکتا رہا تھا۔ محفل سات سال کی ہوئی تو دادی اس کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کی آرزو کرنے لگی۔ چنانچہ اسی گاؤں کے مغربی حصے میں رہنے والے عباس میاں سے اس کو بیاہ دیا گیا۔

اس زمانے میں عباس میاں محفل کے ایک دور کے چچا کے گھر ملازم تھا۔ اپنا اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بچپن ہی میں وہ باپ کے سائے سے محروم ہوگیا تھا۔ دو اس کی بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ بہنوں کی شادی ہوچکی تھی اور وہ کہیں اور رہتی تھیں۔ عباس میاں کی ماں نے دونوں بیٹوں کو چھوڑ کر اور شادی کر لی تھی۔ دونوں بھائی گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی میں رہنے لگے۔ بچپن ہی میں عباس نے لوگوں کے گھروں میں نوکری شروع کر دی تھی۔ جب کہ اس کا بھائی گھر میں رہتا اور یومیہ اجرت پر مزدوری کرتا تھا۔ پھر اس نے شادی کر لی۔ عباس میاں اپنے بھائی کے خاندان کی مدد کرتا رہا۔ لیکن گاؤں والوں نے اس کو سمجھایا کہ بھائی کی

MashalBooks.org

مدد کرنے کی بجائے اس کو اپنے لئے کچھ بچانا چاہئے۔ چنانچہ اس نے روش بدل لی۔نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے وقت عباس میاں کے پاس دلہن کے لئے چار چھوٹے موٹے زیور خریدنے کے لئے رقم جمع ہوچکی تھی۔ محفل ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتی ہے کہ ''میرے شوہر نے مجھے چاندی کی آٹھ چوڑیاں' سونے کے دو کڑے' چاندی کا ہار' سونے کے کانٹے اور ایک ستاروں والا کمر بند دیا تھا۔''

جب سے عباس میں نے بھائی کی مدد بند کی تھی دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق ہوگئے تھے۔عباس میاں کا اپنا گھر کوئی نہ تھا' لہٰذا اپنی سات سالہ دلہن کو اس نے سسر کے گھر میں ہی رکھا۔ دو سال تک تو اس نے بیوی کے خرچ کے لئے ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عباس میاں جب بھی سسرال آتا' کوئی نہ کوئی تحفہ لے آتا۔مگر محفل اس کے قریب نہ پھٹکتی ۔ چنانچہ وہ محفل کی خالہ سے اس کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ یونہی دس سال بہت گئے۔شفیق مالک کا کوئی بیٹا جوان نہ تھا۔ وہ عباس کو ہی اپنا بیٹا سمجھتا۔سترہ برس کی عمر تک محفل باپ کے گھر میں پڑی رہی۔اس زمانے میں وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔تقریباً چھ سال بعد عباس میاں نے نوکری چھوڑ دی اور گاؤں کے اسی حصے میں کپڑا بننے کا کام کرنے لگا۔مگر ہوا یوں کہ چند ہی دنوں بعد وہ واپس آیا اور اس نے محفل کو تین سو روپے دیئے تا کہ اس رقم سے آبائی زمین پر جھونپڑی بنائی جاسکے۔محفل نے ایک مزدور بلوایا اور اپنے شوہر کے باڑے میں جھونپڑی بنوالی۔ پھر وہ اسی جھونپڑی میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔

عباس میاں کبھی کبھی آتا اور محفل کو کچھ پیسے دے جاتا۔محفل خود بھی مزدوری کرنے لگی تھی۔ باپ کے گھر رہتے ہوئے اس نے مچھلیاں پکڑنے کا ے جال بننے کا ہنر سیکھ لیا تھا اور اب وہ اس سے تھوڑی بہت کمائی کر لیتی تھی۔ یوں اس کے دن گزرنے لگے۔

ایک بار میں محفل سے ملنے گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ بوگرا میں رہتے ہوئے اس کے شوہر نے بعض اور ہنر بھی سیکھے تھے جو بعد میں اس نے بیوی کو بھی سکھائے ۔ یہ بات بتانے کے بعد محفل چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئی اور اس کے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں ہوگئے۔ پھر وہ کہنے لگی کہ عباس میاں نے بوگرا میں ایک چیز بھی سیکھی تھی اور وہ تھی جوئے بازی' جس نے بالاخران کی زندگیاں برباد کردیں۔اپنی اور شوہر کی مشترکہ آمدنی سے محفل اچھا

خاصا گھر چلا رہی تھی، لیکن جوئے بازی کی لت بیچ میں آ گئی اور یوں عباس میاں کی طرف سے ملنے والی رقم میں باقاعدگی نہ رہی۔ وہ دن بھی آئے کہ جب وہ ایک پیسہ بھی بھیجنے کے قابل نہ ہوتا تھا۔ محفل کی مشکلات شروع ہوگئیں۔

کئی سال یونہی بیت گئے۔ بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ کے زمانے میں عباس میاں نے بوگرا کو خیرباد کہا اور اپنے گاؤں' لوہاریہ' لوٹ آیا اور یہاں اس نے سستے زیور کی دکان کھول لی۔ محفل دکان کی دیکھ بھال کرنے لگی اور عباس میاں پھیری لگا کر چوڑیاں' ربن' ہار' کانٹے اور انگوٹھیاں وغیرہ بیچنے لگا۔ یہ دکان انہوں نے اپنی زمین پر بچ جانے والی تھوڑی سی خالی جگہ پر بنائی تھی۔ میاں بیوی دونوں مل کر یہ کاروبار کر رہے تھے۔ عباس میاں مختلف چیزیں کوروٹیا سے خرید کر لاتا اور پھر بازاروں اور گلیوں میں گھوم کر فروخت کرتا۔ وہ نقد رقم کے علاوہ چاول' پٹ سن' گندم اور دوسری قسم کے اناج کے بدلے بھی اشیا فروخت کر دیتا تھا۔ اچھی بکری ہو جاتی تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے اور اگر مندا رہتا تو وہ کسی نہ کسی طور' کم کھا کر اور کم خرچ کر کے' گزارہ کر لیتے۔

جنگ ختم ہوگئی تو محفل کا شوہر جولا ہے کے طور پر محنت مزدوری کرنے کی خاطر بھولا نامی گاؤں چلا گیا۔ ان دنوں اس کو بیس پچیس روپے یومیہ اجرت مل جاتی تھی۔ بھولا میں کچھ عرصہ مزدوری کرنے کے بعد 1973ء میں عباس میاں نے اپنے گھر میں دو کھڈیاں لگوالیں۔ بنائی کا اجازت نامہ حاصل کیا اور ایک ملازم کی مدد سے کام کرنے لگا۔ گھر کا سارا کام کاج محفل سنبھالے ہوئے تھی۔ تاہم وہ جال بننے کے کام میں شوہر کی مدد بھی کرنے لگی۔ یہ دونوں کھڈیاں محفل کے زیور فروخت کر کے حاصل کی گئی تھیں۔

دو برس تک یہ کام چلتا رہا پھر 1975ء کے لگ بھگ دست کاروں کی طرف سے دھاگے کی سپلائی بند ہوگئی اور کھڈیوں کا کام رک گیا۔ یہ دو سال محفل کے خاندان کے لئے بہت اچھے گزرے تھے۔ شاید وہ لوگ کچھ رقم بچا بھی لیتے' مگر عباس میاں کی جوئے کی لت نے کوئی بچت نہ رہنے دی۔ خاندان کے لئے اس نے اور بھی کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک اور بھی عادت تھی جو خاندان کے وسائل پر بوجھ بننے لگی تھی۔ وہ بہت مہمان نواز تھا۔ کوئی مہمان آ جاتا تو وہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اس کی تواضع کرتا۔ مہمان نوازی یقیناً بری بات نہیں ہے۔ لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں اور عباس میاں اس امر کا خیال نہ رکھتا تھا۔ وہ غیر متوقع

طور پر لوگوں کو گھر لے آتا اور ان کی خوب خاطر تواضع کرتا۔ افلاس زدہ خاندان کے لئے اس کی یہ عادت مصیبت بن گئی۔ مگر عباس میاں معقول طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

کھڈیاں بند ہوگئیں تو عباس میاں پیاز، لہسن، ادرک اور ہلدی جیسے مرچ مصالحے بیچنے لگا۔ چند روز میں اس نے موسمی اشیاء فروخت کرنے کا کام بھی کیا۔ محفل بھی فارغ نہ بیٹھی اور چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر بیچنے لگی۔ گھر میں وہ مچھلیوں کے جال بنتی اور کبھی کبھی ان سے تھوڑی بہت رقم ہاتھ لگ جاتی۔ اس ساری محنت و مشقت کے باوجود غربت اور محرومی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

یہی وہ دن تھے کہ جب عباس میاں کی دو بہنوں نے زمین کے چھوٹے سے آبائی ٹکڑے سے اپنا حصہ مانگنا شروع کیا۔ عباس میاں نے مجبور ﷺ کر دونوں کھڈیاں بیچ دیں اور دونوں کا حصہ ادا کر دیا۔ اس کے پاس تھوڑی سی رقم بچ گئی تھی مگر وہ دوسری گھریلو ضرورتوں پر خرچ ہوگئی۔ پلے کچھ نہ رہا تو عباس میاں یومیہ اجرت پر مزدوری کرنے لگا۔ گھر کے افراد کی تعداد اب سات ہو چکی تھی جب کہ عباس میاں کو پانچ چھ روپے روزانہ سے زیادہ مزدوری نہ ملتی تھی۔ محفل کی کمائی بھی بس برائے نام ہی تھی۔ یوں جب حالت بہت خراب ہوگئی تو عباس میاں نے زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر دیا۔ اس سے ڈیڑھ سو روپے اس کے ہاتھ لگے جو چند دنوں میں پار ہو گئے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر عباس میاں نے ایک بار پھر جولاہے کا کام کرنے کا ارادہ کیا اور ھولاؤں کا رخ کیا۔ وہاں اس نے کچھ رقم بچائی اور دوبارہ گھر لوٹ آیا۔ یہ 1978ء کا واقعہ ہے۔ واپسی کے دن شام کو اس نے سسرال جانے کا ارادہ کیا۔ مگر راستے میں اچانک گر پڑا۔ ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے عباس میاں کے سر پر پانی ڈالا۔ بعض نے آیتیں پڑھ کر پھونکیں اور پھر اٹھا کر سسر کے گھر لے گئے۔ یہ خبر محفل تک پہنچی تو وہ باپ کے گھر کی طرف بھاگی۔ اس کا خیال تھا کہ عباس میاں پر بدروحوں نے حملہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس بے چاری نے بدروحوں کو بھگانے کی تدابیر کیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ عباس میاں پر کسی نے جادو ٹونہ کر دیا ہے۔ چنانچہ بہت سی آیتیں پڑھ کر اس پر پھونکی گئیں اور پھر اس کو گھر لے آیا گیا۔ ان ساری کوششوں کے باوجود رات گئے تک خون بہتا رہا۔ بعد میں اس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا، مگر بے حد لاغر ہوگیا اور محنت کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ خاوند کی

بیماری کے سبب محفل بھی کام ڈھنگ سے نہ کرسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں جو معمولی رقم تھی، وہ بھی چند دنوں میں نہ رہی۔

بدقسمتی نے گویا اس واقعہ کے ساتھ ہی محفل کا گھر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس کے دکھ بڑھنے لگے۔ محفل نے اپنے بھائی سے بیس روپے ادھار لے کر ٹنگا ئیل میں اپنے شوہر کا ایکس رے کروایا ٹنگائیل سے واپسی کے آٹھ روز بعد عباس میاں کی چھاتی او رکولہوں میں درد ہونے لگا۔ علاج کے لئے کوئی وسیلہ نہ رہا تو محفل نے مجبوراً اپنی زمین کا ایک ٹکڑا دوسو روپے میں فروخت کر دیا۔ اس رقم میں سے وہ سو روپے کی دوائیاں لائی اور باقی رقم خوراک پر خرچ ہوگئی۔ خاندان کے باقی افراد مرچوں کے ساتھ روٹی کھانے لگے۔

علاج سے کچھ افاقہ تو ہوا۔ لیکن عباس میاں کوئی سخت مشقت کرنے کے قابل پھر بھی نہ ہو سکا۔ بھوک اور افلاس کے باعث وہ جلد ہی یومیہ اجرت پر کام کرنے لگا، لیکن کمزوری کے سبب روزانہ کام پر جانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

دکھ اور تکلیف میں خاندان کے دن گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ عباس میاں کے حواس جواب دینے لگے۔ اور جنون کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ وہ رات کو سوسکتا تھا اور نہ ہی دن میں اس کی آنکھ لگتی تھی۔ دن کے وقت وہ گلیوں میں نکل جاتا اور لوگوں کو زور زور سے آواز دینے لگتا۔ کبھی کبھی تو وہ دوسروں کی چیزیں توڑ پھوڑ دیتا۔ محفل بے چاری کیا کرتی۔ اس نے زمین کا ایک اور ٹکڑا تین سو روپے میں بیچا تا کہ شوہر کا علاج کروا سکے۔ مگر سخت کوشش کے باوجود عباس میاں کو ٹنگائیل یا میمن سنگھ لے جانا ممکن نہ ہوا۔

آخر تنگ آ کر محفل نے اپنے ایک بہنوئی کو ٹنگائیل بھیجا جس نے ڈاکٹر عباس میاں کو کیفیت بتا کر دوائیں لا دیں۔ چند ہی دنوں میں علاج معالجے اور گھر کی دوسری ضرورتوں پر یہ تین سو روپے بھی خرچ ہو گئے۔ مگر عباس میاں کی حالت جوں کی توں رہی۔ بیٹی کے گھر کی یہ حالت دیکھ کر محفل کے باپ کو بڑا ترس آیا اور اس نے اپنی کچھ زمین آٹھ سو روپے میں فروخت کر کے یہ رقم داماد کے علاج کے لئے دے دی۔ محفل نے اس میں سے تقریباً پانچ سو روپے عباس میاں کے علاج پر صرف کیئے، جب کہ باقی رقم گھریلو ضروریات کی نذر ہوگئی۔

MashalBooks.org

یہ صورت حال یاس انگیز تھی۔ ان دکھ بھرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے محفل نے مجھے بتایا کہ عباس میاں کی حالت یہ تھی کہ ایک دن وہ اچھا بھلا دکھائی دیتا اور دوسرے روز نڈھال ہو جاتا۔ ایک عرصے تک یہی چلن رہا۔ اس زمانے میں محفل کے پاس دو بکریاں تھیں جو اس نے تمام مصائب کے باوجود اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں۔ عباس میاں ان بکریوں کو ایک روز منڈی کی طرف لے گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ان کو ساتھ لئے واپس آ گیا۔ وہ دوڑ کر جھونپڑی میں داخل ہوا اور فرش پر گر گیا۔ اس کی حالت پھر غیر ہونے لگی تھی۔ وہ تکلیف سے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ محفل نے اسے دیکھا تو اس کے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ عباس میاں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد عباس میاں کی حالت بہتر ہوگئی۔ اس کی بے چینی ختم ہوگئی مگر قوت گویائی باقی نہ رہی۔ دوسری طرف محفل بھی ٹھیک نہ تھی۔ کئی بیماریوں سے اس کا پالا پڑ چکا تھا۔ اس لئے محنت مشقت کے قابل نہ رہی تھی۔ مگر اب جب کہ گھر میں بیمار شوہر پڑا تھا، وہ کیا کرتی۔ کس سے مدد مانگتی، کون اس کو سہارا دیتا۔ مجبور ہو کر اس نے تین سو روپے کے عوض دونوں بکریاں فروخت کیں اور اپنے بیٹے کو کچھ روپے دیئے تاکہ مٹی کے برتنوں کا کاروبار شروع کیا جا سکے۔ دکھ کے ان دنوں میں بیٹے نے روزی کمانا شروع کی۔ اس اثنا میں پندرہ دن تک عباس میاں کی زبان بالکل بند رہی۔ کوشش کے باوجود وہ ایک لفظ بھی نہ ادا کر سکا۔ وہ اشاروں سے کام لینے لگا۔ سولھویں دن اس کے ناک اور منہ سے اچانک پھر خون بہنے لگا۔ محفل کا کہنا ہے کہ خون اس قدر بہہ رہا تھا کہ ایک پورا برتن بھر گیا۔ محفل ایک بار پھر اس کے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ اس دوران میں اچانک عباس میاں کی قوت گویائی بحال ہوگئی۔ تاہم خون بھی بہے جا رہا تھا۔ محفل کو آج بھی وہ الفاظ یاد ہیں جو اس کے شوہر نے اس موقع پر کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''میرے اوپر پانی مت ڈالو۔ میں ٹھنڈ سے جم جاؤں گا۔ فائدہ ہی کیا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔''

اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے ہیں۔ تاہم اس کا ذکر کرتے ہوئے محفل کی آنکھیں اب بھی نم ہو جاتی ہیں۔ بیتے ہوئے ایام کا ذکر کرتے ہوئے اس نے میری نوٹ بک پر اداس نظروں سے دیکھا اور گہری آہ بھری۔ عباس میاں کا انتقال جون 1979ء میں ہوا تھا۔ وہ اپنے پیچھے ایک بیوی، دو بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑ گیا تھا۔ محفل کے پاس کفن دفن کے لئے بھی پیسے نہ تھے، چنانچہ لوکل کونسل کے ایک سابق رکن نے، جس کے گھر میں کبھی عباس میاں

نوکر رہ چکا تھا، لوگوں سے پیسے اکٹھے کیے اور یوں اس کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔

خاوند کی وفات کے بعد محفل کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ ابتداء میں اس نے عزیزوں اور ہمسایوں کو مدد پر بھروسہ کرنا چاہا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اردگرد کے گھروں میں کام کاج کرنے لگی۔ بیٹا مٹی کے برتن بیچنے کا کام کر رہا تھا۔ یوں ماں بیٹے کی مشترکہ کمائی سے یہ خاندان گزارا کرنے لگا۔ وہ بہت ہی مفلسی اور مصیبتوں کے دن تھے۔

مارچ 1980ء میں لوھادیہ گاؤں کے چند بے زمین افراد نے گرامین بنک سے قرضے حاصل کیے۔ بنک کا ایک ملازم محفل کی جھونپڑی کے قریب ایک رکن کے گھر میں رہنے لگا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کے ذریعے محفل کو اس بنک کے مقاصد کا علم ہوا۔

محفل ایک روز اس رکن سے ملنے گئی تو اس نے محفل کو مشورہ دیا کہ دوسرے لوگوں کے گھروں میں ملازمت کرنے کے بجائے اس کو بنک سے قرضہ لے کر اپنا کوئی کام شروع کرنا چاہئے۔ اس کے اردگرد بھی غریب لوگ رہتے تھے۔ چنانچہ قرضہ حاصل کرنے کی خاطر گروپ بنانے میں اس کو کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ تین چار دنوں میں اس نے گروپ بنا لیا۔ تاہم بعض لوگوں نے اس کو بددل کرنا چاہا۔ وہ اس کو ڈراتے تھے کہ اگر وہ وقت پر قرضہ واپس نہ کر سکی تو بنک والے اس کا گھر اور زمین ضبط کر لیں گے اور اس کو رسیوں سے باندھ کر جیل میں پھینک دیں گے۔ محفل ان باتوں کو خاطر میں نہ لائی اور اس نے گاؤں کے مردوں کے قرضہ گروپ کی مثال سے حوصلہ حاصل کرتے ہوئے اپنا گروپ بنا ہی لیا۔ اس کے بعد وہ گروپ کی عورتوں کو لے کر بنک چلی گئی۔ بنک کے قواعد کے مطابق اس نے سات سات روزہ تربیتی پروگرام بھی شروع کیا۔ تربیت کے بعد قرضہ حاصل کرنے کے لیے محفل کو تقریباً ایک مہینہ انتظار کرنا پڑا۔ شاید وہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں سے دل ہی دل میں کسی قدر ڈر گئی تھی۔ چنانچہ اس نے صرف تین سو روپے کی قلیل رقم کے لئے درخواست دی اور رقم اس کو مل گئی۔ اپنے گروپ میں سب سے محفل اور روپ جان کو قرضہ ملا۔ چونکہ یہ گروپ محفل کی کاوشوں سے وجود میں آیا تھا، لہٰذا اس کو گروپ کی سربراہ بنا دیا گیا۔

محفل کے گروپ کو قرضہ مل گیا تو آس پاس کے لوگ بڑی دلچسپی سے ان کے معاملات پر نگاہ رکھنے لگے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ عورتیں بنک سے ملنے والی رقم کا کیا کریں گی۔ یہ غریب لوگ بھی آس لگائے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے کہ ''اگر تمہیں اس سکیم

MashalBooks.org

سے فائدہ پہنچا تو ہم بھی تمہاری طرح قرضہ حاصل کریں گے۔''

اس گاؤں میں کئی آدمی سود پر رقم دینے کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ سو روپے دے کر دس روپے فی مہینہ سود لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ غریبوں کو رقم نہیں دیتے، کیونکہ ان کو رقم ڈوبنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف گرامین بنک کا مقصد ہی صرف ان غریب لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ لہٰذا وہ صرف غریبوں کو قرضے دیتا ہے۔ جوں جوں لوگوں کو اس امر کی خبر ہوتی گئی، وہ بنک میں دلچسپی لینے لگے اور غریب لوگ اس سے مدد لینے لگے۔ اس امر کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ صرف محفل کے گاؤں میں اب تک بنک سے قرضہ حاصل کرنے والے عورتوں کے بارہ گروپ تشکیل پا چکے ہیں۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بے زمین اور دوسرے غریب لوگوں کو ان کے رشتہ دار، ہمسائے اور گاؤں کے بزرگ اس بنک کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ البتہ ساہوکار بنک سے خوش نہیں اور خوشحال زمین دار بھی ناراض ہیں کیونکہ اب ان کو شکار آسانی سے نہیں ملتے، اس کے برخلاف محفل اور اس کے گروپ کی ارکان کا کہنا ہے کہ عام لوگوں کی اکثریت گرامین بنک کو پسند کرتی ہے۔

بنک کے قرضے سے محفل کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ مل گیا۔ اس کو کئی ہنر آتے تھے، وسائل اور خود اعتمادی کی البتہ کمی تھی۔ اب معمولی وسائل اور ان سے زیادہ خود اعتمادی محفل کو ملی تو اس نے پڑوسیوں کے گھروں میں نوکری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بنک سے ملنے والی رقم سے اس نے گاؤں کے ایک شخص سے ڈھائی من دھان خریدا اور باقی رقم بیٹے کو دی تاکہ وہ قریبی دیہات سے مٹی کے برتن خرید کر اپنا کاروبار بہتر بنا سکے۔ ماں بیٹے نے اب زیادہ حوصلے اور جوش وخروش سے کام شروع کر دیا ہے۔ جن دنوں میں یومیہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کو اچھا معاوضہ ملتا ہے، تو اس کا بیٹا اپنا کاروبار چھوڑ کر مزدوری کرنے لگتا ہے۔ محفل بیوہ بھی اب دوسروں کے جھوٹے برتن نہیں مانجھتی۔ وہ بازار سے دھان خریدتی ہے، اس کو صاف کرتی ہے۔ دھاگہ خرید کر بیچنے کے لئے مچھلیاں پکڑنے کے جال بنتی ہے، اور جو منافع حاصل ہوتا ہے، اس سے روز مرہ کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ قرضے کی قسطیں ادا کرتی ہے۔ پہلے چھ ماہ میں ہی اس نے اپنا قرض اتار دیا تھا۔

پہلے قرضے کی واپسی کے بعد محفل نے مزید قرضے کے لئے درخواست دی مگر وہ دو

MashalBooks.org

ماہ تک منظور نہ ہوسکی۔ ان دو مہینوں کو وہ شدید اذیت اور آزمائش کی مدت قرار دیتی ہے۔ یہ 1980ء کے سیلاب کے زمانے کا قصہ ہے۔ سیلاب کا پانی اس کی جھونپڑی تک پہنچ گیا تھا اور باہر نکلنا محال ہو گیا تھا۔ ان دنوں کسی مزدور کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں بیٹے نے جو تھوڑے بہت پیسے بچا رکھے تھے، وہ بھی مصیبت کے ان دنوں میں خرچ ہو گئے۔

محفل کے اہل خانہ کے لئے فاقہ کشی کے دن شروع ہو گئے۔ تین روز تک کھانے کو کچھ بھی نہ ملا۔ چوتھے روز پڑوس میں رہنے والی ایک عزیز اپنے کھانے کا کچھ حصہ بچا کر بھوک سے نڈھال بچوں کے لئے آئی۔ یوں ان چھ افراد نے اس سے پیٹ کی آگ بجھانا چاہی۔ اس سے بھوک خیر تو کیا مٹنا تھی، البتہ ان کی تھوڑی بہت توانائی لوٹ آئی۔ دوسرے روز محفل نے ایک مہربان پڑوسی کی مدد سے اپنی زمین کا ٹکڑا فروخت کرنا چاہا، لیکن سیلاب کے دنوں میں کسی کو اس معاملے میں دلچسپی نہ تھی۔ تاہم ایک ہمسایہ زمین دار کی منتیں کر کے محفل نے سودا کر ہی لیا۔ اس نے زمین دار کی ساری شرطیں مان لیں۔اور طے یہ پایا کہ وہ پانچ دس روپے کی قسطوں میں قیمت ادا کرے گا۔ پانچ روپے کی پہلی قسط محفل کو اسی وقت مل گئی جس سے اس نے قریبی دکان سے ڈھائی سیر آٹا خرید لیا۔ محفل اور اس کے بچوں نے رات اور دوسرے دن کی صبح اسی پر گزارا کیا۔

زمین کے عوض محفل کو کل سو روپے ملے۔ لیکن یہ رقم قسطوں میں ملی تھی۔ چنانچہ جوں جوں رقم ملتی گئی وہ خرچ بھی ہوتی رہی۔ سب سے بڑی قسط سے اس نے بمشکل ایک من دھان خریدا۔ اس کے دو ماہ بعد اس کو گرامین بنک سے سات سو روپے کا نیا قرضہ مل گیا۔ اس دوران میں برسات کے دن بھی بیت گئے تھے۔

نئے قرضے کے بل بوتے پر محفل نے ایک بار پھر پورے جوش وخروش سے کام شروع کر دیا۔ وہ حالیہ مصائب سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ مگر ہوا یہ کہ شروع میں کام ٹھیک طریقے سے چلتا رہا اور وہ منافع سے قرضے کی قسطیں ادا کرتی رہی۔ پھر صورت حال بدلنے لگی۔ گزشتہ ایک ماہ سے کاروبار مندا ہے اور محفل کو اپنے سرمائے سے قسطیں ادا کرنے پڑتی ہیں۔ میں نے اس سے موجودہ کاروبار حاصل ہونے والے منافع کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ گزشتہ ہفتے اس نے تین من دھان صاف کئے۔ گزشتہ

ہفتے اس کا بیٹا بیمار رہا تھا۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور یومیہ اجرت پر کام کرتا رہا۔ اس کو چھ روپے روزانہ اجرت مل رہی تھی۔ چنانچہ گزشتہ ہفتے اس نے چھ روز کام کر کے چھتیس روپے کما لئے تھے۔ اس طرح ماں بیٹے کی آمدنی سے گزارا ہو رہا تھا۔

جہاں تک خوراک کا تعلق ہے، محفل نے کبھی مچھلی یا گوشت نہیں خریدا۔ وہ گرد ونواح میں اگنے والی سبزیاں اور جڑی بوٹیاں کھانے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر اس نے خود بھی سبزیاں اگا رکھی ہیں۔ ان سے وہ سالن بنا کر چاولوں کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ صبح کے وقت یہ خاندان روٹی کھاتا ہے اور دوپہر کے وقت چاول پکائے جاتے ہیں۔ محفل کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ اس کو اور اس کے بچوں کو مناسب خوراک دستیاب نہیں۔ وہ تو اس بات پر شکر کرتی ہے کہ وہ روزانہ بچوں کو دو وقت دال دلیہ مہیا کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔

محفل اپنے گروپ کی سربراہ ہے اور ایسے ہی مختلف گروپوں کی مرکزی لیڈر بھی ہے۔ لہٰذا اس کو بہت سے لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔ مرکزی لیڈر کی حیثیت سے اس نے کبھی کسی اجلاس سے ناغہ نہیں کیا اور مرکز کے تمام لوگوں کے ساتھ اس کے خوش گوار تعلقات ہیں۔ اس کا گروپ بنک کے ابتدائی مرحلوں میں ہی بن گیا تھا۔ اس لئے وہ بنک کے تمام قواعد وضوابط سے بخوبی آگاہ ہے۔

محفل نے مستقبل کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ اس کو امید ہے کہ جلد ہی دوسرا قرضہ بھی اتر جائے گا۔ پھر وہ گرامین بنک سے ایک اور یعنی تیسرا قرضہ لے گی۔ آئندہ زیادہ رقم حاصل کرنا چاہتی ہے تا کہ کاروبار جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بچھڑا بھی خرید سکے۔ گرامین بنک کو وہ اپنا سچا اور ہمدرد دوست سمجھنے لگی ہے۔ مصیبت کے دنوں میں اس نے اپنی زمین پڑوسی کو بیچی تھی تا کہ اس کو کچھ آرام میسر آ سکے۔ لیکن اس میں محفل کو کئی مشکلات پیش آئی تھیں بنک کا البتہ معاملہ ہی اور ہے۔ غریب لوگوں کے محض اعتبار پر ان کی مدد کر رہا ہے۔

محفل پڑھی لکھی نہیں۔ تاہم بنک سے قرضہ حاصل کرنے کے لئے اس نے دستخط کرنا سیکھ لئے تھے۔ اس کو علم کا شوق بھی ہے اور وہ اپنے دوسرے بیٹے کو سکول میں داخل کروانے کا عزم کیئے ہوئے ہے۔

اس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا سترہ برس کا ہے۔ یہ شباب کی بہار کے دن ہوتے ہیں۔ مگر وہ بے چارہ غربت اور محرومی کی آغوش میں پلا ہے لاغر اور زرد دو ہے۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر لڑکیاں ہیں جن کی عمر تیرہ اور گیارہ برس ہے۔ دوسری بیٹی گاؤں کے اس حصے میں ایک شخص کے گھر ملازم ہے۔ اس کی بیوی محفل کی رشتے دار ہے۔ چوتھے نمبر پر بیٹا ہے جس کی عمر سات سال ہے اور سب سے چھوٹی لڑکی ہے جواب پانچ برس کی ہو چکی ہے۔ اپنے بچوں میں سے محفل چوتھے نمبر والے کو یعنی سات سالہ بیٹے کو تعلیم دلانے کی آس لگائے ہوئے ہے۔ بچوں کی تعداد سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محفل یا اس کے مرحوم شوہر کو کبھی خاندانی منصوبہ بندی کا خیال نہ آیا تھا۔ وگرنہ محض منصوبہ بندی کی بدولت ان کے مصائب کسی نہ کسی حد تک کم ہو سکتے تھے۔

محفل کا گھر اب پانچ مرلہ زمین پر واقع ہے۔ اس جھونپڑی کے علاوہ اس کے پاس ایک مرغ ہے اور وہ ایک بکری میں بھی حصہ دار ہے۔ جھونپڑی کی دیواریں مناسب طور پر نہیں بنائی گئی تھیں۔ اگلی اور پچھلی دونوں دیواروں کی حالت قدرے بہتر ہے لیکن باقی دو دیواریں بہت شکستہ ہو چکی ہیں۔ اگلی دیوار بھی دروازے کے پاس سے ٹوٹ چکی ہے۔ درخت کی شاخوں اور ٹکڑوں کی مدد سے اس کی مرمت کی گئی ہے۔ بوسیدہ دیواروں کے سبب ہوا اور روشنی آسانی سے جھونپڑی میں داخل ہو جاتی ہیں۔

جھونپڑی کے اندر قدم رکھیں تو چند گھریلو چیزیں ادھر ادھر بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کونے میں چولھا رکھا ہے۔ ایک چولھا باہر بھی ہے۔ چولھے کے اوپر بانس کی الماری میں مٹی کے چار برتن رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی چند اور برتن کمرے میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مغربی کونے میں ایک کرم خوردہ تختہ رسیوں کی مدد سے دیوار کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس پر ٹین کا ایک صندوق، چھوٹے بچوں کے چار تکیے، ایک بوسیدہ مچھر دانی اور دو ایک برتن رکھے ہیں۔ بچوں کے پھٹے پرانے کپڑے بھی اس پر دکھائی دیتے ہیں۔

اس تختے کے نیچے تقریباً تین فٹ لمبا مچھلیاں پکڑنے کا جال رکھا ہوا ہے۔ یہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ دیوار کے ساتھ ایک مضبوط لکڑی کی چارپائی اور چوبی ٹوکریاں رکھی ہیں۔ ان میں محفل کے بڑے بیٹے نے مٹی کے برتن رکھے ہوئے ہیں اور ان کو اٹھا کر وہ گلی کوچوں میں پھیری لگاتا ہے۔ شمالی دیوار کے ساتھ رسی کے تھیلے لٹک رہے ہیں جن میں چند بوتلیں، ایک

مرتبان اور چاول ناپنے کے لئے بانس کے دو ڈونگے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اور ایسی ہی چند بوسیدہ چیزیں محفل بیوہ کی کل کائنات ہیں۔

محفل کی خوبی یہ ہے کہ وہ محنت سے جی نہیں چراتی۔ شوق او رلگن سے کام کرتی ہے۔ اپنے بچوں کے بارے میں اس کو بہت سی امیدیں ہیں۔ دیانت داری، عزم اور خود اعتمادی کے ذریعے وہ اپنی حالت بہتر بنانے کا پختہ ارادہ کئے ہوئے ہے۔

MashalBooks.org

زلیخا کی موت

1962ء میں پیدا ہونے والی زلیخا ایک مفلس خاندان کے سات بچوں میں سے سب سے بڑی تھی۔ وہ جوان ہوئی تو اس کی شادی ہو گئی۔ مگر اس کی ازدواجی زندگی زیادہ عرصے قائم نہ رہی۔ شوہر نے طلاق دے دی تو وہ باپ کے گھر واپس آ گئی۔ جلد ہی اس کو احساس ہو گیا کہ وہ گھر والوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ بن گئی ہے۔ گھر والوں کا ہی ذکر ہے، معاشرہ بھی اس بے چاری کو اچھوت سمجھنے لگا تھا۔ چنانچہ دکھ اور مایوسی کے عالم میں ایک روز اس کے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

جب میں زلیخا کے باپ کے پاس گیا تو وہاں چاروں طرف برسات کا پانی کھڑا تھا۔ کشتی کے سوا گھر تک پہنچنے کا کوئی او روسیلہ نہ تھا۔ چنانچہ بڑی مشکل سے میں ایک کشتی کرایئے پر حاصل کر کے اس گھر تک پہنچا۔ گزشتہ کئی روز کی بارشوں نے پورے علاقے کو کیچڑ اور دلدل میں تبدیل کر دیا تھا۔ جب میں زلیخا کے چچا سے باتیں کر رہا تھا تو زلیخا کی بوڑھی بیمار ماں بستر سے اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ دکھ، تکلیف اور بیماری نے اس کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ خود کو سنبھالنا بھی اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ پیڑھی گھسیٹ کر وہ ہم لوگوں کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد زلیخا کا باپ، کابل منڈل اور زلیخا کے چچا زاد بھی آ گئے۔

اس باڑے میں ٹین کی چھتوں والے دو مکان تھے اور دو گھاس پھونس کے بنے ہوئے تھے۔ ٹین کی چھت والے مکانوں کو لکڑی اور بانس کے ستونوں کا سہارا دیا گیا تھا۔ ان کی دیواریں پٹ سن کے ڈنٹھلوں سے بنی ہوئی تھیں۔ گھاس پھونس کے مکانوں کی دیواریں

بھی اسی قسم کی تھیں۔ ان میں سے ایک باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا جب کہ دوسرا گائے کے چھپر کا کام دیتا تھا۔ زلیخا کے والدین اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ٹین کی چھت والے مکان میں رہتے تھے جب کہ اس کے تین بڑے بھائی دوسرے مکان میں مقیم تھے۔

گھر کے پچھواڑے ناریل کا ایک درخت تھا۔ مغربی کونے میں کیلے کے چند جھنڈ تھے اور چند درخت صحن میں بھی تھے۔ مغرب کی طرف بانسوں کا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر اناج رکھنے کے لئے تین ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو خالی تھیں جب کہ تیسری ٹوکری میں تھوڑا سا دھان تھا۔ تین چار تھیلوں میں دھان کے لئے بیج بھی رکھے ہوئے تھے۔ مختلف قسم کے اناج رکھنے کے لئے چار کالے گھڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ گھر کے اندر دیوار کے ساتھ بانس کی الماری میں چند برتن اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ چھت دھویں سے بالکل سیاہ ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک طرف ٹوٹا پھوٹا ٹین کا صندوق اور ایک بوسیدہ سوٹ کیس پڑا تھا۔ دو تین کپڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ زلیخا کی دو ساڑھیاں دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ ایک کونے میں ٹین کی چھ تھالیاں، پلاسٹک کا ایک جگ، نمک رکھنے کے لیے مرتبان، ٹین کا ایک مگ اور چند دوسرے برتن پڑے تھے۔ تو یہ تھی زلیخا کے گھر کی کیفیت۔

کابل منڈل یومیہ اجرت پر مزدوری کرتا ہے۔ تاہم وہ پٹ سن کے ایک تاجر کا ایجنٹ بھی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا خاندان کی معمولی سی زمین پر کھیتی باڑی کرتا ہے۔ تاہم کبھی کبھی وہ محنت مزدوری دوسروں کے لئے بھی کر لیتا ہے۔ دوسرا بیٹا پڑوس کے ایک گھر میں سالانہ بنیاد پر نوکر ہے۔ کابل منڈل کی زیر کاشت زمین بہت تھوڑی ہے۔ تاہم وہ شراکت کی بنیاد پر بھی کاشتکاری کرتا ہے۔ ان کا باڑہ تقریباً تیس مرلے زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ جب کہ منڈل کی دوسری بیٹی کی شادی پہاڑیوں کے قریب رہنے والے ایک شخص سے ہو چکی ہے۔ یہ بیٹی کبھی کبھی شراکت کی اساس پر کاشت کے لیے زمین اپنے باپ کو دے دیتی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس خاندان کی گزر بسر سخت تکلیف اور محرومی کی حالت میں ہو رہی ہے۔

دس برس کی عمر میں زلیخا سخت اذیت ناک بیماری کی شکار ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ماں ان ایام کو یاد کرتے ہوئے مجھے بتانے لگی کہ "زلیخا جب دس سال کی تھی تو اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ایک مہینے تک وہ بستر پر پڑی رہی تھی۔ اس کا دایاں بازو اور دائیں ٹانگ بے حس

ہو گئی تھی۔ اس کو اٹھا کر اندر باہر لانا پڑتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے دیسی علاج سے بڑی بیٹی تندرست ہوئی تھی۔''

کابل منڈل تین بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کی دو بہنیں بھی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ پرائمری سکول تک اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ زلیخا کی ماں البتہ ان پڑھ تھی۔ بے پناہ مشکلات کے باوجود زلیخا نے بھی تین جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ اس نے قرآن مجید بھی پڑھا تھا۔ اب اس کا ایک چھوٹا بھائی سکول جاتا ہے۔ یہ خاندان ماں باپ کے علاوہ پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے۔

زلیخا پندرہ برس کی ہوئی تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ غربت اور افلاس کے باوجود ظاہر ہے کہ جہیز تو دینا ہی تھا۔ چنانچہ اس کے لئے جتنے بھی رشتے آئے ان کے ساتھ جہیز کی فرمائشیں شامل تھیں۔ ایسا بھی ایک رشتہ بیلٹا نامی گاؤں سے آیا تھا۔

دولہا کا بڑا بھائی زلیخا کو دیکھنے آیا تھا۔ زلیخا اس کو پسند آ گئی تو شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔ مقررہ روز دولہا جبار علی برات لے کر آ گیا۔ چنانچہ رسمیں ادا کرنے کے بعد زلیخا نئے گھر روانہ ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ جبار علی نے زلیخا کو شادی سے پہلے نہیں دیکھا تھا اور وہ بڑے بھائی کی ہدایت پر شادی کے لئے تیار ہوا تھا۔ شادی کے بعد جب اس نے پہلی بار زلیخا کو دیکھا تو اس کو مایوسی ہوئی۔

زلیخا کے باپ نے بھی جبار علی کی رائے جاننے یا اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر توجہ نہ دی تھی۔ جانے بوجھے بغیر ہی اس نے بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ اس نے پانچ سو روپے میں اپنی چار مرلہ زمین بیچ کر اور اپنی ساری پونجی ملا کر بیٹی کو گیارہ سو روپے کا جہیز بھی دے دیا تھا۔ اس نے کچھ رقم محفوظ نامی اپنے رشتہ دار سے قرض بھی لی تھی۔

زلیخا کا شوہر کاشت کار تھا۔ اس کے آٹھ بھائی اور آٹھ بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اور یہ سارے بھائی مل کر ایک ہی باڑے میں رہتے تھے۔ ان کے مالی حالات اچھے نہ تھے، مگر زلیخا کے خاندان سے بہر حال بہتر تھے کم از کم وہ ادھار لئے بغیر گزارہ کر رہے تھے۔ جبار کے ماں باپ دونوں اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔

زلیخا اس گھر میں سب سے چھوٹی بہو تھی۔ اس لئے وہ توقع کرتی تھی کہ سب لوگ

اس کے ساتھ زیادہ محبت سے پیش آئیں گے۔ ہوا بھی یہی ۔ چنانچہ اس کے دیور اور دیورانیاں اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ زلیخا جب بھی میکے آتی۔ وہ اپنے سسرال والوں کی بہت تعریفیں کرتی۔ جبار علی زلیخا کے ماں باپ کے گھر جاتا تو اس کی ماں جبار کی بہت آؤ بھگت کرتی۔ شادی کے دن کابل منڈل نے اپنی بیٹی کا ہاتھ جبار علی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے رو کر کہا تھا ''بیٹا، میں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی تمہارے سپرد کر دی ہے ۔ اس کا خیال رکھنا۔'' شروع کے دن اچھے گزر گئے ۔مگر دو ہی مہینوں میں جبار علی کے تیور بدلنے لگے۔ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کو برا بھلا کہنے لگا۔ زلیخا نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے والدین سے بالکل نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ خاموش اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے لگی۔ جب کبھی وہ میکے جاتی تو زیادہ تر وقت بستر پر اکیلی پڑی رہتی۔ ہر وقت وہ کسی سوچ میں گم دکھائی دیتی تھی۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ زلیخا بہت سیدھی سادی لڑکی ہے۔ شاید سادگی ہی اس کی بربادی کا سبب بن رہی تھی۔

دوسری طرف جبار علی نے زلیخا سے پیچھا چھڑانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ اس کو مارنے پیٹنے لگا۔ بھائی اس بدسلوکی میں مداخلت کرتے تو وہ اور بھی غضب ناک ہو جاتا۔

زلیخا کو معلوم تھا کہ یہ سب کچھ اسے خود ہی سہنا ہے۔ چنانچہ وہ خاموش رہی اور اپنے والدین سے کچھ نہ کہا۔ اس دوران میں بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب رمضان کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور عید میں تین دن رہ گئے تھے تو زلیخا کا باپ چند روز کے لئے اسے گھر لے آیا۔ اس کو کیا خبر تھی کہ اب وہ یہیں رہے گی۔ زلیخا کا باپ اور بھائی بہنوئی کو لینے خود بلیٹا گاؤں گئے تھے تا کہ جبار علی کو لا سکے۔ لیکن سسر کی بات سننا تو درکار جبار علی نے اس سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور چند پڑوسیوں کے ذریعے اس کی بے عزتی بھی کروائی۔ زلیخا کی خاطر اس کے بھائی اور باپ یہ سب کچھ سہ گئے۔ پھر جب جبار علی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ زلیخا کو واپس لے جانے پر تیار نہیں ۔تو اس کا باپ بہت پریشان ہوا اور وہ جبار علی کے ایک ایک رشتے دار سے ملا اور ان سے جبار علی کو رویہ بدلنے کو کہلوانا چاہا۔مگر جبار علی کا دل شاید پتھر کا بنا ہوا تھا۔ وہ موم نہ ہو سکا آخر کار جبار علی نے شادی کے موقع پر زلیخا کے باپ سے ملنے والے گیارہ سو روپے اور طلاق کے کاغذات اپنے سسر کو بھجوا دیئے۔ ٹوٹے ہوئے دل کا ساتھ کابل منڈل اپنی بیٹی کی بربادی کے یہ کاغذات گھر لے آیا۔

مجھے یہ دکھ بھرا قصہ سناتے ہوئے زلیخا کے ماں باپ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ

MashalBooks.org

سکے اور زار وقطار رونے لگے۔ بے چارگی کے عالم میں ان کے دیکھنے کے سوا میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ اگر شادی سے پہلے زلیخا کے سرپرستوں نے احتیاط سے کام لیا ہوتا، اگر وہ جبار علی سے پہلے بات کرتے اور اس کے خیالات سے آگاہ ہو جاتے تو شاید زلیخا کو ان دردناک مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

آنسو پونچھتے ہوئے کابل منڈل کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا ''صاحب، آپ سارے سوال اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ زلیخا نے آپ کے بنک سے قرض لیا تھا۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس جب بھی پیسے ہوئے میں آپ کی ساری رقم لوٹا دوں گا۔ میں اپنی بچی کی روح کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ گھر بیچ کر بھی مجھے قرض ادا کرنا پڑا، تو میں کردوں گا۔''
پھر اس نے مجھے بتایا کہ بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے ایک بار اس نے قرض لے کر کس طرح ادا کیا تھا۔ ان دنوں اس نے بعض دوسرے افراد کے ساتھ مل کر قرض لیا تھا۔ اس کے حصے میں پچاس روپے آئے تھے لیکن ان میں سے بعض لوگوں نے قرض واپس نہ کیا تو منڈل کو ڈیڑھ سو روپے ادا کرنے پڑے تھے۔

زلیخا اپنے شوہر کے ساتھ صرف سات مہینے رہی تھی۔ اس مختصر مدت میں اس نے بہت سے رنج اٹھائے تھے۔ مگر وہ شوہر کا دل نرم نہ کر سکی تھی۔ آخر جب شوہر نے طلاق دے دی تو وہ اپنے گھر والوں کے سر پر بوجھ بن گئی۔ طلاق کے بعد وہ آٹھ ماہ زندہ رہی۔ اس مدت میں اس کو اور بھی زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں۔ گھر والے اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ وہ محسوس کرتی کہ وہ ماں باپ پر، بہن بھائیوں پر بوجھ بن گئی ہے۔ یوں اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچتی۔ ان حالات میں اس نے محنت مزدوری کرنے اور اپنی روزی خود کمانے کا ارادہ کیا تھا۔

اس دوران میں زلیخا کے والدین نے اس کی دوسری شادی کے لئے بہت کوششیں کیں۔ لیکن طلاق یافتہ لڑکی کے لئے شوہر تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ خیر، ایک دو رشتے پھر بھی آگئے۔ مگر جہیز اور دوسرے مسائل نے بات نہ بننے دی۔

میں نے سنا ہے کہ انہی دنوں زلیخا اپنے گاؤں کے ایک نوجوان رحیم سے محبت کرنے لگی تھی۔ دونوں کے گھر والے اس معاملے میں بالکل بے خبر تھے۔ رحیم سالانہ بنیاد پر ایک دوسرے گاؤں میں کھیتوں پر مزدوری کرتا تھا۔ اپنے گاؤں میں کبھی کبھار ایک دو روز کے

لئے آیا کرتا تھا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ رحیم اور زلیخا میں کوئی تعلق بن جائے گا۔ زلیخا کے گھر کے ساتھ پانی کا ایک بڑا تالاب تھا جس کے دوسری طرف رحیم کا گھر تھا۔ دونوں کے خاندانوں میں بھی کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ البتہ زمین کی کھدائی کے مسئلہ پر دونوں میں ایک بار جھگڑا ہوا تھا۔ جس کی تھوڑی بہت کشیدگی باقی تھی۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ زلیخا عمر میں رحیم سے بڑی تھی۔ ان حالات میں، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگیں گے۔

زلیخا ساتھ والے گھر میں جایا کرتی تھی او ررحیم بھی کسی بہانے سے وہاں آنکلتا تھا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ گرد وپیش سے شاید بے خبر تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے چھپ چھپ کر ملنا شروع کر دیا۔ ان ملاقاتوں میں زلیخا حاملہ ہوگئی۔ یہ طلاق کے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ جب اس کے حمل کو پانچ ماہ ہو گئے تو اب اس کو دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپانا ممکن نہ تھا۔ یوں ایک ناقابل برداشت آزمائش شروع ہوگئی۔ زلیخا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ آخر کار چاروں طرف سے مایوس ہوکر زلیخا نے رابعہ نامی ایک رشتہ دار خاتون کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس عورت کو وہ اماں کہا کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ مصیبت کے اس وقت پر اماں اس کی مدد کرے گی۔ اماں نے ساری بات سنی تو ہکا بکا رہ گئی۔ زلیخا جیسی شرمیلی لڑکی نے یہ کیا کر دیا تھا۔ وہ تو ایسی لڑکی تھی کہ گاؤں میں کسی نے اس کو نظر بھر کر کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ چنانچہ اماں کو بڑی مشکل سے زلیخا کی بات پر یقین آیا۔ زلیخا چاہتی تھی کہ وہ دوائی کھا کر حمل گرادے۔ مگر رابعہ نے اس کی اجازت نہ دی۔

اس کا خیال تھا کہ اس طرح خود زلیخا کی زندگی خطرے کی زد میں آجائے گی۔ جب اماں کوئی چارہ نہ کرسکی تو زلیخا مایوسی کی اتھاہ گہرئیوں میں ڈوب گئی۔ کوئی راہ اس کو سجھائی نہ دیتی تھی۔ مایوسی کی ان تاریکیوں میں وہ خودکشی کا سوچنے لگی۔

دوسری طرف اماں نے اس معاملے کا ذکر زلیخا کی ماں سے کر دیا۔ ماں نے اپنے شوہر سے بات کی اور یوں یہ بات دوسرے قریبی رشتہ داروں تک پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ پورے گاؤں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ زلیخا کا راز گاؤں میں پھیل گیا۔ آخر کار گاؤں کے بزرگ، پنچائیت کے ارکان اور انکا چوہدری اکٹھے ہوئے۔ زلیخا او رحیم کے رشتے داروں کو بھی یہ معاملہ نمٹانے کے لئے اجلاس میں بلایا گیا۔ رحیم اب تک اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتا رہا

تھا۔لیکن جب زلیخا نے اقرار کر لیا تو وہ بھی ماننے پر مجبور ہو گیا۔گاؤں کے بزرگوں نے سوچ بچار کے اور طویل مذاکرات کے بعد کہا کہ آئندہ بدھ کے روز ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔ دونوں کے رشتے دار دل سے شادی پر رضا مند نہ تھے۔مگر گاؤں والوں کے سامنے خاموش رہے۔ اصل میں دونوں خاندانوں میں سماجی اور معاشی فرق تھا اور ویسے بھی زلیخا عمر میں رحیم سے بڑی تھی۔

رحیم کے اہل خانہ کا کہنا یہ تھا کہ ان کا لڑکا نوجوان ہے، اس لئے وہ زلیخا جیسی بڑی عمر کی اور طلاق یافتہ لڑکی کو کیسے قبول کر لیں۔خود زلیخا بھی اس ساری مصیبت کی ذمے دار خود کو سمجھتی تھی کہ اس نے ایک نوجوان لڑکے کو خود ترغیب دے کر یہ مصیبت مول لی تھی۔ رحیم کا دادا کہتا تھا کہ وہ لوگ زلیخا کو قبول کر لیں گے، لیکن اگر رحیم کو اس کے باپ نے عاق کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ لہٰذا وہ رحیم کے لئے جہیز کے طور پر نصف بیگھا زمین کا مطالبہ کرنے لگا۔خود رحیم خاموش رہا۔مگر اس کے رشتہ داروں نے یہ مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ زلیخا کے خاندان کا موقف یہ تھا کہ زلیخا ان کی اکلوتی بیٹی نہیں۔ لہٰذا اس کو اتنی زیادہ جائیداد دے کر گھر کے دوسرے افراد کو غربت کے اندھے کنویں میں نہیں پھینکا جا سکتا۔ اس کو باپ کی جائیداد میں سے صرف اپنا حصہ ہی مل سکتا ہے۔زلیخا کے بھائی تو اس بات کے بھی شدید مخالف تھے۔ وہ غضب ناک ہو رہے تھے اور کہتے تھے کہ زلیخا کی پہلی شادی پر ہی کافی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ وہ اس کو اور کچھ دینے پر تیار نہ تھے۔ آدھے بیگھا زمین کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر یہ نئی مصیبت بھی تو اس نے خود ہی کھڑی کی تھی۔ چنانچہ اس کے بھائی کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہ تھے۔

آخر میں دیہی کونسل کے ایک سابق رکن کوششوں سے دونوں خاندانوں نے معاملہ طے کر ہی لیا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ زلیخا کو شادی میں کچھ زمین دی جائے گی۔ یہ فیصلہ ایک سوموار کے روز ہوا تھا۔ اس کے مطابق دوسرے روز یعنی منگل کو دونوں خاندانوں کے سر پرستوں کو نکاح کے سلسلے میں ضروری دستاویزات تیار کروانے کی خاطر ٹنگائیل جانا تھا۔ اسی شام کو شادی کو رسوم ادا ہونی تھیں اور زلیخا کو نئی سسرال جانا تھا۔ اجلاس میں یہ باتیں طے کرنے کے بعد سب لوگ گھروں کو واپس چلے گئے۔

کابل منڈل اجلاس سے اٹھ کر گھر آیا تو اس کے بیٹوں نے طوفان اٹھا دیا۔ بڑے

MashalBooks.org

سے چھوٹا بیٹا زیادہ ہی قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ بیٹوں کو باپ کا فیصلہ قبول نہ تھا۔ وہ اپنی بہن کو ایک پائی بھی دینے کے حق میں نہ تھے اور باپ اس کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کی حامی بھر آیا تھا۔ بدقسمت کابل مینڈل جو ایک مطلقہ اور ناجائز طور پر حاملہ لڑکی کا باپ تھا، کہاں تک ضبط کرتا۔ غصے سے بے قابو ہو کر وہ زلیخا کو ننگی گالیاں دینے لگا۔ بیٹوں کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر وہ زلیخا سے کہنے لگا۔'' تو زہر کھا کر مر کیوں نہیں جاتی، خدا تجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔ روزانہ سینکڑوں مرتے ہیں۔ تیری باری پتہ نہیں کب آئے گی۔ شاید مجھے ہی تیری جگہ مرنا پڑے گا۔''

جھگڑا دوسرے روز پھر شروع ہو گیا۔ دوسرا بیٹا غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ بہن کو وہ گندی گالیاں دینے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ بہن کی کرتوت کے سبب وہ گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ وہ بہن کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا اور وہ سامنے آئی تو خود اس کو قتل کر دے گا۔

دوسری طرف بھی حالات کچھ سازگار نہ تھے۔ رحیم کی ماں کہتی تھی کہ وہ طلاق یافتہ اور بدکردار لڑکی کو بہو کے طور پر قبول نہیں کرے گی۔ نصف بیگھا زمین کا مطالبہ اصل میں اس کو ٹالنے کا بہانہ تھا۔ مگر اب وہ امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ رحیم کی ماں گاؤں کے بزرگوں کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔ چنانچہ غصے اور نفرت کا اظہار کرنے کی خاطر وہ زلیخا کے گھر کے سامنے جا کر زور زور سے چلانے لگی۔'' بے شرم عورت، تم نے میرے معصوم بیٹے کو خراب کیا ہے۔ شادی ہو جائے تو پھر میں تمہیں مزہ چکھاؤں گی۔''

زلیخا مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف بھائی اس سے ناراض تھے اور کوئی بات سننے پر تیار نہ تھے۔ اس نے اپنے باپ کو بھی سارے گاؤں میں بے عزت کر دیا تھا۔ اس کی آبرو خاک میں ملا دی تھی۔ دوسری طرف اس کی ہونے والی ساس سرعام طعنے اور دھمکیاں دے رہی تھی۔ زلیخا کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں چلی جائے۔ کس سے اپنے درد کی دوا لے۔ کون اسکے زخموں پر مرہم رکھے گا۔ بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ'' زندگی بھر مجھے اس گناہ کی ذلت برداشت کرنی ہوگی۔ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، وہ ساری زندگی کے لیے طعنہ بن جائے گا۔ ذلتوں اور رسوائیوں کے سوا اس دنیا میں میرے لیے کچھ نہیں رہا۔'' اس کو محسوس ہوا جیسے پورے معاشرے نے اس کو دھتکار دیا ہو۔

MashalBooks.org

کوئی ٹھکانہ اس کے لئے نہ رہا ہو۔ ایسے میں اپنی زندگی ختم کرنے کے سوا اس کے لئے چارہ کار ہی کیا تھا۔ وہ اس بارے میں سوچنے لگی۔

منگل کی صبح کو طے شدہ پروگرام کے مطابق دونوں پارٹیوں کو ٹنگائیل جانا تھا۔ اس سلسلے میں انتظامات کر لئے تھے۔ لیکن اچانک زلیخا کی ماں کی چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ ہر کوئی چونکا۔ پڑوسی اس کے گھر کی طرف بھاگنے لگے۔ رحیم کے گھر والے بھی حیرانی کے عالم میں وہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ زلیخا نے زہر پھانک لیا ہے۔ اس کی جان بچانے کی تمام کوششیں کی گئیں۔ مگر بچنا تھا اور نہ بچی۔ زہر کا اثر ختم کرنے کے لئے اس کو اٹھا کر قریبی جوہڑ میں غوطے دیئے گئے۔ انڈے، املی اور ناریل کا تیل اس کے حلق میں ٹھونسا گیا۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تقدیر میں جو لکھا تھا، ہو کر رہا اور محرومیاں یہیں چھوڑ کر زلیخا تمام بندھنوں سے آزاد ہوگئی۔ جب وہ زہر اپنے منہ میں رکھ رہی تھی تو شاید اس کے دل سے دعا نکلی ہو ''بھائیو تم ہمیشہ شاد رہو۔ آباد رہو۔'' یا ہوسکتا ہے کہ جان نکلنے کے آخری لمحے میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ابھی پیدا نہ ہونے والے بچے کا ہیولا آ گیا ہو۔

صبح سویرے زلیخا بیٹھک میں بے ہوش پائی گئی تھی اور وہیں اس کا کام تمام ہوا تھا۔ اب اس کے بھائیوں کو جائیداد کے انتقال کی دستاویزات تیار کروانے کے لیے ٹنگائیل جانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اب تو بس کفن دفن کا بندوبست کرنا تھا۔ خدا جانے زلیخا کی موت پر رحیم کے احساسات کیا تھے۔ تاہم اس کا خاندان اس پر زیادہ خوش نہ تھا۔

کسی کو خبر نہیں کہ زلیخا نے زہر کہاں سے حاصل کیا تھا۔ بعض ہمسایوں کا گمان یہ ہے کہ دھان کی فصل کے لئے کیڑے مار دوا گھر میں رکھی تھی۔ شاید وہی اس نے پی لی ہو۔ تاہم زلیخا کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ ایسی کوئی دوا گھر میں نہ تھی۔ غالباً وہ لوگ پولیس سے خوف زدہ تھے۔ اس لئے گھر میں کیڑے مار دوائی کی موجودگی سے بھی انکار کر رہے تھے۔ خیر، ہمسایوں کی رائے یہ ہے کہ زلیخا ایسی لڑکی نہ تھی جو کسی بیرونی وسیلے سے زہر حاصل کرنے کا بندوبست کرسکتی۔

کسی نہ کسی سبب سے زلیخا کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرنے میں ناکام رہی تھی۔ جو تفصیل ہم نے یہاں بیان کی ہے، اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ناکامی میں زلیخا کا قصور زیادہ نہ تھا۔ طلاق کے بعد وہ اپنے والدین پر بوجھ نہ بننا چاہتی تھی۔ وہ خود اپنے پاؤں پر

کھڑے ہونے کی آرزومند تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے جدوجہد بھی کی تھی۔لیکن جوانی کے زور نے اس کو اندھیرے میں دھکا دے دیا اور بالآخر زندگی اس سے روٹھ گئی۔ اس دنیا میں وہ اپنے لئے جگہ نہ بنا سکی اور یوں اس کو قبل از وقت دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔

1980ء کے سیلاب کے بعد سے زلیخا کے باپ کے مالی حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ وہ قرض لے کر گھر بار چلا رہا تھا۔ سیلاب کے منہ زور پانیوں نے اس کی فصل تباہ کر دی تھی۔ اس نے محنت مزدوری کرنا چاہی، لیکن اس کو یا اس کے بیٹوں کو کوئی کام نہ مل سکا۔ تب اس نے شریف نامی ایک شخص سے پندرہ سو روپے (بلا سود) ادھار لئے تاکہ بچوں کی دال روٹی کا بندوبست کر سکے۔ یہ اس کے لئے واقعی بہت تکلیف کے دن تھے۔ اور قیامت یہ ٹوٹی کہ انہی ایام میں زلیخا بھی مزید بوجھ بن کر میکے آن ٹپکی۔

زلیخا کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کے خاندان کی حالت پہلے سے ابتر ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان رہنے لگی۔ باپ اس کو اچھا بھلا جہیز دے کر رخصت کر چکا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ سسرال سے دھتکار دی گئی تھی۔ اب اگر اس کی دوبارہ شادی ہوتی تو اس کو دوسری بار جہیز دیا جانا تھا۔ اس کو اپنے خاندان کے مصائب کا بخوبی احساس تھا۔ غریب باپ جہیز کے لئے رقم کہاں سے لائے گا؟ اور اگر رقم نہ ہوئی تو دوبارہ اس کی شادی نہ ہو سکے گی۔ تو ان حالات میں زلیخا آخر کیا کرتی؟

یہ خبر زلیخا کے کانوں تک پہنچ چکی تھی کہ گاؤں کی چند عورتوں نے مل کر گرامین بنک سے قرضہ لیا ہے۔ امینہ نامی ایک بے زمین ہمسائی کو گرامین بنک کے قرضے سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ اس کے دن بدل گئے تھے۔ اور اب وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر زلیخا اس کے پاس گئی اور بنک کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہ جان کر اس کو بہت خوشی ہوئی کہ یہ بنک غریبوں کی خاطر بنایا گیا ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی قرضہ لینے کے خواب دیکھنے لگی۔ اس کو مستقبل سہانا نظر آنے لگا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دن بدل جائیں گے۔ وہ پھر سے بیاہی جائے گی۔ اور اپنے گھر میں شوہر اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی کے دن گزارے گی۔ اچھے دنوں کے بارے میں وہ اس قدر پرامید تھی کہ اس نے اپنی ماں سے بھی ان باتوں کا ذکر کر دیا تھا۔ اب زلیخا کی ماں ان باتوں کو یاد کرتی ہے تو اس سے صبر نہیں ہوتا۔ وہ روتی ہے اور چلاتی ہے "ہائے میری جان ہم نے تمہیں اندھیری قبر میں پھینک دیا ہے۔ تم

MashalBooks.org

تو پھول کی طرح تازہ تھیں اور کیا کیا خواب دیکھتی تھی۔ ہائے اب میں کیا کروں۔ خدا نے تمہاری جگہ مجھے کیوں نہ اٹھالیا۔''

خیر، زلیخا نے جب بنک سے قرضہ لینے کی بات اپنے باپ سے کی تھی تو باپ نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس نے سختی سے زلیخا کو بتادیا تھا کہ وہ قرضے کی رقم مفید طور پر استعمال نہ کر سکے گی اور ہفتہ وار قسطوں کی ادائیگی اس کے بس کا روگ نہ ہوگا۔ باپ کا کہنا تھا کہ وہ عورت ہے۔ اس قسم کے معاملات کا اس کو کوئی تجربہ نہیں، قرض لے کر وہ مصیبت میں پھنس جائے گی اور دوسروں کی تکلیف کا باعث بھی بنے گی۔

زلیخا نے بہرطور والدین کے اعتراضات کی پرواہ نہ کی اور امینہ کی مدد سے ایک ماہ کے اندر اپنا گروپ بنالیا۔ اس نے والدین سے کہہ دیا کہ ان کو اس معاملے میں ٹانگ اڑانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

زلیخا لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ لہٰذا ہر کوئی اس کو گروپ کی چیئر مین بنانا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہ مانی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خاصی شرمیلی ہے اور لڑکوں سے میل ملاپ کی اس کو عادت نہیں۔ لہٰذا وہ چیئر مین کے فرائض اور ذمہ داریاں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گی۔ تاہم آخر کار گروپ کو بچانے کی خاطر اس کو چیئر مین بننا ہی پڑا۔

چند روز بعد گرامین بنک سے زلیخا کو بارہ سو روپے کا قرضہ مل گیا۔ شروع میں اس کو یہ رقم مناسب طور پر استعمال کرنے میں دقتیں پیش آئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا باپ لاتعلق ہوگیا تھا اور اس کی مدد نہیں کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اس رقم سے کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے تو پھر باپ اور بھائی اس کی مدد کرنے لگے۔ وہ زلیخا کو بازار سے دھان لا دیتے اور جب وہ اس کو چھان پھٹک کر صاف کر دیتی تو وہ چاول بازار لے جا کر فروخت کر دیتے۔ بارش کے دنوں میں جب دھان کو صاف کرنا دشوار ہوتا ہے، وہ بازار سے چاول لاتے اور زلیخا پڑوسیوں کو فروخت کر دیتی۔ زلیخا بنک سے ملنے والی پوری رقم ایک ہی بار اپنے اس کاروبار میں نہ لگا سکی تھی۔ اس نے گرامین بنک کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ رقم گاؤں کے بیوپاریوں کو معمولی سود پر دے دی۔ اگر اس کا باپ اور بھائی ابتدا ہی سے اس کی مدد کرتے تو شاید وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ ویسے بھی مختلف لوگوں کو کم سود پر رقم دینے کے بجائے وہ کسی مناسب کاروبار میں اپنی رقم لگاتی تو شاید اس کو زیادہ فائدہ ہوتا۔

اس وقت کسی نے اس کی مدد کی تھی اور نہ ہی رہنمائی۔ اپنی سادہ لوحی میں وہ یہی سمجھے ہوئے تھی کہ اس نے رقم کو بہترین طریقے سے استعمال کر لیا ہے۔ اپنی قسطیں وہ منافع سے یا دوسرے ذریعوں سے ادا کر دیا کرتی تھی۔ ماں نے اس کو ایک بطخ دے رکھی تھی جس کے انڈے بیچ کر بھی وہ کبھی کبھی قسط دے دیتی تھی۔ گھر بار کا بوجھ اس پر نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دوسری ذمہ داریاں تھیں، اس لئے قسطیں ادا کرنے کے بعد بھی اس کے پاس تھوڑے بہت پیسے بچ جایا کرتے تھے۔

زلیخا کی ماں نے مجھے بتایا کہ موت کے وقت زلیخا کے پاس آٹھ سو روپے تھے۔ ان میں سے تین سو روپے نقد تھے اور باقی روپے اس نے لوگوں کو قرض دے رکھے تھے۔ مرنے کے بعد زلیخا کی بچت میں سے تقریباً ڈیڑھ سو روپے اس کی تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئے۔

حلیمہ کی آس

حلیمہ نے بچپن میں اچھے دن دیکھے تھے، لیکن بدقسمتی اس کی تاک میں تھی۔ جلد ہی اس کا باپ اس دنیا سے سدھار گیا تو حلیمہ کے لئے بس اندھیرے ہی رہ گئے۔ باپ کی زندگی میں ان لوگوں کا اچھا بھلا گھر تھا۔ ہر کوئی حلیمہ کو چاہتا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔ کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ باپ کی موت کے ساتھ ہی زندہ رہنے کے لئے اس کی طویل اور کٹھن جدوجہد شروع ہو جائے گی۔ اس کو سو پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور بدقسمتی آخر میں اس کو اپنی ماں کے ساتھ شوہر کے گھر لے جائے گی۔ کبھی اس نے سوچا نہ تھا کہ مدد کے لئے اس کو ہاتھ پھیلانے پڑیں گے اور لوگوں کی جلی کٹی باتیں سننے کو ملیں گی لیکن شادی کے بعد سے حلیمہ کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آرہا ہے۔ اس کی زندگی ناقابل برداشت مصائب کی شکار رہی ہے۔

حلیمہ خاتون ڈھاکہ سے میمن سنگھ جانے والی سڑک کے جنوب میں باغیچہ بازار سے مغرب میں چار سو گز کے فاصلے پر رہتی ہے۔ اس کا گھر کیا ہے، ٹین کا ایک سائبان ہے جس میں وہ اپنے خاوند، بچوں اور بوڑھی ماں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

میں حلیمہ سے ملنے گیا تو اس نے بیٹھنے کے لئے ایک ٹوٹا پھوٹا سٹول دیا۔ گفتگو کا آغاز میں نے اس کے حال اور خاندان کی بھلائی کے ذکر سے کیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کی اور اس کے گھر کی کیفیت بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

یہ باڑہ تقریباً ڈھائی سو گز زمین کو گھیرے ہوئے ہے جب کہ ٹین کی بوسیدہ

MashalBooks.org

جھونپڑی اس کے شمالی حصے میں ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً تیرہ فٹ اور چوڑائی چھ فٹ کے قریب ہوگی۔ دیواریں پٹ سن اور گیہوں کے ڈنٹھلوں سے ڈھانپی ہوئی تھیں۔ جھونپڑی کا جنوبی کونہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ایندھن کے طور پر پٹ سن کی خشک شاخیں اور چند ٹوٹے ہوئے بانس دھرے تھے۔ ایک کونے میں میلا کچیلا لحاف اور چند تکیے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرے کونے میں بھی دو تین لحاف پڑے تھے۔ اس کونے کے دوسری طرف ایک صراحی اور پیالہ رکھا تھا جب کہ فرش پر مٹی کی چار پانچ تھالیاں، پیسنے والا ایک ٹوٹا ہوا پتھر اور مختلف سائز کے مٹی کے چند برتن پڑے تھے۔ ایک طرف تہہ کی ہوئی مچھر دانی دکھائی دے رہی تھی۔ حلیمہ اپنی زندگی کی مدوجزر کی کہانی سناتے ہوئے ہاتھ کے پنکھوں پر کشیدہ کاری بھی کرتی جا رہی تھی۔

حلیمہ خاتون 1954ء کے لگ بھگ قریبی یونین کے گاؤں سونو تیا میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باپ کے دو اور بھائی تھے۔ اور تینوں کی تقریباً آٹھ ہزار مربع گز قابل کاشت زمین تھی۔ حلیمہ کا اپنا خاندان ماں باپ، ایک بڑے بھائی اور خود حلیمہ پر مشتمل تھا۔ اس کو اپنے دادا دادی یا نانا نانی دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان دنوں چونکہ ان کا خاندان مختصر تھا، اس لئے جو زمین ان کے حصے آئی تھی، وہ کافی تھی۔ حلیمہ کو گھر میں کبھی کوئی کمی محسوس نہ ہوئی تھی۔ بھائی اور باپ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ حلیمہ ابھی پانچ برس کی ہوئی تھی کہ اس کا باپ فوت ہوگیا۔

باپ کی زندگی میں حلیمہ کے دن مزے میں گزر رہے تھے۔ اس کا بھائی پانچ جماعتیں پاس کر چکا تھا جب کہ اس نے خود گاؤں کے مکتب سے قرآن پڑھ لیا تھا۔ تاہم اس کو بنگالی زبان پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر اس کا باپ زندہ رہتا تو وہ بھی سکول میں داخل ہو کر پڑھ لکھ جاتی۔ ماں اور بھائی سے بھی اس کو گہرا لگاؤ تھا۔ گھر کے کام کاج میں وہ ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح مہنگائی نہ تھی۔ اس لئے کھیتی باڑی سے حاصل ہونے والی آمدنی گھر کے خرچ کے لئے کافی تھی۔ حلیمہ کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں پانچ سات روپے کی ساڑھی مل جاتی تھی اور چودہ آنے میں، یعنی ایک روپے سے بھی کم رقم سے گیارہ سیر چاول خریدے جا سکتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا خاندان اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے حلیمہ کے باپ کو اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی

بدقسمتی کا اندھیرا اس خاندان کے مقدر پر چھا گیا۔

حلیمہ کا باپ اپنے دونوں بھائیوں سے بڑا تھا۔ چنانچہ اس کی زندگی میں بھائیوں نے جائیداد کے بارے میں کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد خاندان میں واحد مرد حلیمہ کا بھائی رہ گیا تھا، جو عمر میں چھوٹا تھا اور کمزور بھی، چچاؤں نے اس بات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور مشکلات پیدا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے حلیمہ کے باپ کی زمین کے کچھ حصے پر ناجائز قبضہ بھی کر لیا۔ گاؤں میں ایک ساہوکار بھی رہتا تھا۔ اس نے حلیمہ کے بھائی کو زمین فروخت کردینے کا مشورہ دیا اور وہ مان گیا۔ چنانچہ بھائی نے جائیداد کا کچھ حصہ اسی ساہوکار کو فروخت کر دیا۔ اب وہ اور اس کی ماں حلیمہ کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے۔

حلیمہ کا رنگ ایسا نہ تھا کہ آپ اس کو گوری کہہ سکیں۔ وہ سیاہی مائل تھی اور آپ جانتے ہی ہیں کہ اس رنگ کی دوشیزاؤں کے لئے رشتے آسانی سے نہیں ملتے۔ اس کی ماں اچھا جہیز دینے پر تیار تھی، لیکن بات تو دولہا کی تلاش تھی۔ اچھا رشتہ ملنے میں تاخیر ہوئی تو ماں اور بھائی دونوں کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ آخرکار ماں کی کوششیں رنگ لائیں اور تیرہ برس کی عمر میں حلیمہ دنیال گاؤں کے علا والدین سے بیاہی گئی۔ اس کا ذہنی توازن قدرے بگڑا ہوا تھا۔ اس لئے لوگ اس کو، پاگل علاؤ، کہا کرتے تھے۔ شادی کے موقع پر ماں نے حلیمہ کو کنگن اور دولہا کو ایک قمیض اور ایک لنگی دی۔ بارہ افراد پر مشتمل برات کی خاصی آؤ بھگت کی گئی اور پھر حلیمہ کو پیا گھر بھیج دیا گیا۔

علاؤالدین کا ایک بڑا بھائی تھا۔ باڑے کے علاوہ ان کے پاس تھوڑی سی زرعی زمین تھی۔ کسی زمانے میں ان کے باپ کے پاس چھ سات ہزار مربع گز اراضی ہوا کرتی تھی۔ مگر بڑے میاں بہت کاہل اور بے ہمت تھے۔ چنانچہ اپنے گزارے کے لئے انہوں نے تھوڑی تھوڑی کرکے زمین بیچ ڈالی تھی۔ اب وہ دوسرے جہاں سدھار چکے تھے۔ علاؤالدین کی ماں بھی کافی عرصہ پہلے اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوچکی تھیں۔ سسرال میں حلیمہ کا ایک جیٹھ تھا اور دو نندیں۔ یہ سب علاؤالدین سے بڑے تھے۔ اب ان لوگوں کو دن گزارنے تھے۔ جب کہ میں بتا چکا ہوں علاوادین کسی قدر مخبوط الحواس تھا، اس لئے وہ زیادہ کام کاج نہ کرسکتا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنی ذمے داریوں سے لاپرواہ رہا۔ اس کو ان باتوں کا کبھی خیال بھی نہ

آیا تھا۔ دوسرے بھائی کو یہ بات اچھی نہ لگتی تھی۔ چونکہ تمام ذمہ داریاں اس کو ادا کرنی پڑتی تھیں اور اب علاؤالدین کی شادی کے بعد گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ یہ بوجھ بھی بھائی کو اٹھانا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ تقریباً دو سال بعد تنگ آ کر اس نے علاؤالدین سے علیحدگی کو کہہ دیا۔ اس کے بعد علاؤالدین محنت مزدوری پر پہلے کی نسبت زیادہ توجہ دینے لگا۔ لیکن مشقت سے اس کو کھانا تو مل جاتا تھا، اجرت نہیں ملتی تھی۔ یہ حال دیکھ کر حلیمہ نے خود بھی لحافوں کی سلائی اور مچھلیاں پکڑنے کے جال بننے کا کام شروع کر دیا۔ وہ دو روپے فی لحاف کے حساب سے معاوضہ لیا کرتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی تھوڑی بہت زمین پر کاشت بھی شروع کر دی اور یوں گزارہ کرنے لگے۔

سسرال سے الگ ہوئے چند ماہ ہی گزرنے تھے کہ حلیمہ نے پہلے بیٹے کو جنم دیا۔ ان دنوں اس خاندان کا گزارا علاؤالدین کی یومیہ اجرت پر تھا۔ پیدائش کے ایک ہفتے بعد بچہ شدید بیمار ہو گیا۔ رات بھر وہ روتا رہا اور اس کا جسم بالکل سرد ہو گیا۔ یہ حالت کچھ عرصہ قائم رہی اور پھر ایک رات وہ مر گیا۔ حلیمہ کا دل ٹوٹ گیا۔ جذباتی اور جسمانی دونوں اعتبار سے وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ لیکن وقت تمام زخم بھلا دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ حلیمہ نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

اس کے بعد 1971ء میں حلیمہ کی بڑی بیٹی منورہ بیگم پیدا ہوئی۔ تین سال بعد دوسری بیٹی مریم نے اور اس کے پانچ برس بعد سب سے چھوٹے بیٹے عبدالقاسم نے جنم لیا۔ اس سارے زمانے میں حلیمہ کو مناسب خوراک میسر نہ آئی تھی۔ حمل کے دنوں میں وہ کام نہ کر سکتی تھی اور اس کے خاوند کی آمدنی بے حد قلیل تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عام دنوں میں جو کچھ کھانے پینے کو مل جاتا تھا، حلیمہ اس سے بھی محروم ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی ماں پڑوسیوں سے کچھ نہ کچھ مانگ لایا کرتی تھی۔ یوں نوبت فاقہ کشی تک نہ پہنچتی تھی۔ لیکن وہ دن بھی آ جاتے تھے جب حلیمہ کو صرف پانی پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ کے ایام کی ایک یاد حلیمہ کو اکثر آیا کرتی ہے۔ ماں سے ملنے والے کنگن اس نے بیچ دیئے تھے اور بھیڑ کا ایک بچہ خرید لیا تھا۔ وہ جنگ کے دن تھے۔ بھیڑ کا بچہ سڑک کے کنارے ایک کھیت میں چر رہا تھا کہ رضاکار آئے اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔ بعد میں وہ اس کو ذبح کر کے کھا گئے۔

1974ء کا سیلاب اور قحط حلیمہ کے خاندان کے لئے اور بھی کئی مصیبتیں لئے آیا تھا۔ سات آٹھ دن تک ان لوگوں کو کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تھا۔ چنانچہ وہ پتے، ٹہنیاں اور گھاس پھوس کھانے پر مجبور ہوئے تھے۔ جو دو چار مرلے زمین ان کے پاس رہ گئی تھی۔ وہ بھی بیچنی پڑی تھی۔ مگر بات پھر بھی نہ بنی۔ حلیمہ کی ماں در بدر مانگنے لگی تھی، مگر کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ ویسے بھی بہت لاغر ہو چکی تھی۔ چنانچہ چند روز بعد بیمار ہو گئی۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ گھر بار چھوڑ کر دیناج پور کا رخ کر رہے تھے۔ حلیمہ نے بھی اپنا باڑہ دو سو روپے میں ایک زمیندار کے پاس رہن رکھا اور اس کے ساتھ طے کیا کہ وہ یہ رقم واپس کرنے پر باڑہ لے سکے گی۔ اسکے بعد وہ اپنے خاندان کو لے کر دیناج پور روانہ ہوگئی۔ خوش قسمتی سے وہاں ان لوگوں کو دور کا ایک رشتہ دار مل گیا جو درزی کا کام کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے پاس قیام کیا۔ اس رشتے دار کا نام جبار منشی تھا۔ جبار منشی نے اپنے باڑے میں ان لوگوں کے لئے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنادی۔ علاؤالدین ایک بار پھر یومیہ اجرت پر مزدوری کرنے لگا۔ اس کو کھانے کے علاوہ پانچ روپے روزانہ اجرت مل جاتی تھی۔ حلیمہ نے پنکھوں پر کشیدہ کاری کا کام شروع کر دیا۔ دو پنکھوں پر کام کی اجرت کے طور پر اس کو آدھا سیر چاول مل جاتے تھے۔ اس طریقے سے ان کے دیناج پور میں دن پہلے کی نسبت اچھ بسر ہونے لگے۔

حلیمہ کے دل کو البتہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اس پر چھایا رہتا تھا۔ وہ کہتی، یہ آرام ہم غریبوں کی قسمت میں کہاں ہوتا ہے۔ چند ماہ یونہی گزر گئے اور پھر حلیمہ کو ٹائفائڈ بخار نے آلیا۔ تین مہینے وہ بستر پر پڑی رہی۔ بیماری تو خیر گزر گئی مگر نامراد اپنی ایک نشانی چھوڑ گئی۔ چنانچہ حلیمہ کا بایاں کان سننے کی اہلیت سے محروم ہو گیا۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی بیمار رہنے لگے۔ کسی کو نزلہ زکام ہوتا، کسی کو بخار اور کوئی پیچش کی زد میں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ دیناج پور میں ان کا قیام مفید ثابت نہیں ہوا۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے ''یہ جگہ ہمارے لئے مناسب نہیں ہے۔ چلو گاؤں واپس چلتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی ساری بیماریاں دور ہو جائیں گی۔''

آخر کار ستمبر 1975ء میں اس خاندان نے دیناج پور کو خدا حافظ کہا اور اپنے گاؤں کا رخ کیا۔ لیکن وہاں ایک اور آفت انتظار میں تھی۔ جس شخص کو حلیمہ نے باڑہ پٹے پر دیا تھا اس نے باڑہ واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔ یوں ان لوگوں کو ایک پڑوسی کے

مویشی خانے میں پناہ لینی پڑی۔ بعدازاں گاؤں والوں کی مدد سے انہوں نے اپنا باڑہ واپس لے لیا، لیکن گروی کی رقم کی واپسی میں ایک برس لگ گیا۔ یہ رقم انہوں نے کئی قسم کی محنت مزدوری کر کے اکٹھی کی تھی۔

1980ء میں سیلاب آیا تو اس خاندان پر ایک اور قیادت ٹوٹ پڑی۔ پانی ان کے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ باہر نکلنا اور کوئی مزدوری تلاش کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ حلیمہ اور اس کی ماں نے بھیک مانگنا شروع کر دی اور اس طرح خاندان کی گزر بسر ہونے لگی۔

حلیمہ کا کہنا ہے کہ چونکہ وہ غریب لوگ ہیں، اس لئے دوسرے ان کی عزت نہیں کرتے اور ان کو نیچ سمجھتے ہیں۔ اس کے سادہ لوح شوہر کو ہر شخص فریب دیتا ہے۔ کوئی ان کی مدد کرتا ہے تو پھر پورے گاؤں میں اس کا ڈھنڈورا بھی پیٹتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلیمہ نے بھیک مانگنے کے لئے اپنے گاؤں سے باہر جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کے ان کے ساتھ سلوک کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ایک بار جب پڑوسیوں کے ساتھ باڑے کی دیوار پر جھگڑا ہوا تو انہوں نے حلیمہ کے شوہر کو پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ بعد میں گاؤں والوں کی مداخلت سے یہ جھگڑا ختم ہوا تھا۔

یہ لوگ چونکہ بہت غریب تھے، اس لئے کوئی ان کو قرض نہ دیتا تھا۔ البتہ حلیمہ کالی ہٹی بازار کے ایک دکاندار سے نقلی زیور ادھار پر لے آئی تھی۔ وہ ان کا کاروبار شروع کرنے کا سوچ رہی تھی۔ یہ پرانی بات ہے اور حالت یہ ہے کہ وہ اب بھی اس دکاندار کی پونے دوسو روپے کی مقروض ہے۔ اکثر اوقات وہ دکاندار گھر آدھمکتا ہے اور رقم کی واپسی کے لئے اصرار کرتا ہے۔ اس تجربے کے بعد سے حلیمہ کی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ رقم اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ پھر کبھی ادھار کے بکھیڑے میں نہ پڑے گی۔ حلیمہ خاتون اس قدر غریب ہے کہ اصل میں وہ کسی ساہوکار کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ اس کو بخوبی علم ہے کہ اس قسم کے لوگ اونچی شرح کے سود کے بغیر رقم نہیں دیتے۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ کوئی شے رہن رکھ لیتے ہیں اور پھر جو رقم دیتے ہیں، اس پر بہت زیادہ سود وصول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مقروض لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے بھی رہتے ہیں۔

گرامین بنک پراجیکٹ میں شمولیت سے پہلے حلیمہ خاتون کی مالی حالت بہت پتلی ہو چکی تھی۔ ان کی گزر اوقات علاؤالدین کی مزدوری اور بوڑھی ماں کو ملنے والی بھیک پر ہوتی

تھی۔ خود حلیمہ بھی گرد و پیش کے دیہات میں برتنوں کی پھیری لگایا کرتی تھی۔ لیکن اس طریقے سے روز مرہ کی ضرورتیں کہاں پوری ہوتی ہیں! چنانچہ گھر کے لوگوں کو روکھی سوکھی روٹی بھی مشکل ہی سے میسر آیا کرتی تھی۔ جہاں تک کپڑوں کا تعلق ہے۔ وہ سرکاری امداد یا دوسروں کی خیرات پر گزارہ کرتے تھے۔ معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ ہر کوئی ان کو حقیر سمجھتا تھا۔ اب بھی ان کی حالت بہتر نہیں ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حلیمہ پھیری کے بعد گھر واپس آ رہی تھی کہ دنیال گاؤں میں گرامین بنک کی مرکزی لیڈر یاسمین نے اسے اپنے گھر بلالیا۔ یاسمین کہنے لگی۔ تم دکانداروں سے ادھار سامان لا کر گلی گلی، گاؤں گاؤں بیچنے جاتی ہو۔ بھاگوٹیہ بازار میں گرامین بنک کی ایک شاخ قائم ہوگئی ہے۔ یہ بنک بے زمین لوگوں کو قرضے دیتا ہے۔ میں تمہیں بنک سے قرض نہ لے دوں تاکہ تم بہتر انداز میں اپنا کاروبار چلاسکو؟ یہ سن کر حلیمہ کے ذہن میں بجلی سی کوندگئی۔ وہ سوچنے لگی ''کاش مجھے کچھ پیسے مل جائیں تو میں اپنا کام مناسب طور پر کرلوں۔ لیکن، ہم جیسے غریبوں کو کون قرض دیتا ہے!''

حلیمہ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا شوہر اس قابل نہ تھا کہ وہ کوئی معقول بات کر سکے۔ لہٰذا حلیمہ نے ماں سے بات کی، دودن کے بعد وہ یاسمین کے گھر گئی اور اس سے قرضہ لینے میں مدد کرنے کی درخواست کی۔ یاسمین نے اس کو بنک کے قواعد وضوابط بتائے۔ اس کے بعد حلیمہ نے گروپ بنانے کی سنجیدگی سے کوشش شروع کردی۔ لیکن وہ جس کسی کے پاس جاتی وہ حلیمہ کو ٹالنے کی کوشش کرتی۔ کوئی بھی حلیمہ کے گروپ میں شامل ہونے کو تیار نہ تھی۔ سب عورتیں کہتیں ''تم قرض واپس نہ کرسکوگی۔ اس لئے ہمیں مشکل پیش آئے گی۔ لہٰذا ہم تمہیں گروپ میں نہیں رکھنا چاہتے۔''

بارہ دنوں تک حلیمہ کی تگ و دو ناکام رہی۔ آخر کار سنٹرل لیڈر یاسمین نے خود اس کا ساتھ دینے کا عزم کرلیا۔ وہ سب سے کہنے لگی کہ ''اگر حلیمہ قسطیں ادا نہ کرسکی تو میں اس کی جگہ رقم واپس کروں گی۔'' یاسمین کے اس وعدے سے گویا ساری الجھنیں دور ہوگئیں اور گروپ سازی کا عمل شروع ہوگیا۔ گروپ کی ارکان مسلسل سات دن تک یاسمین کے گھر میں آپس میں ملتی رہیں اور ہر ایک نے پانچ روپے روز کے حساب سے اپنی نجی بچت سے رقم جمع کروائی۔ اس کے بعد بنک کے قاعدے کے مطابق گروپ کو تسلیم کرلیا گیا اور اس کے دو

MashalBooks.org

ارکان کو بنک نے قرضہ دے دیا۔ اس کے پندرہ بیس دن بعد مرکزی اجلاس میں حلیمہ کو دوسو پچاس روپے قرض دینے کی تجویز پیش ہوئی۔ دو ہفتے بعد حلیمہ کو اس رقم کا قرض مل گیا۔

گروپ کی تکمیل کے بعد بھی دوسرے ارکان کے دل میں یہ شبہ رہا کہ حلیمہ اپنی قسطیں واپس کر سکے گی۔ جو دو ارکان اس کی سب سے زیادہ مخالفت کر رہی تھیں، ان کو حلیمہ کے بعد قرضہ ملا۔ چنانچہ وہ لوگوں سے کہنے لگیں کہ ''ہم تو حلیمہ کو گروپ میں شامل ہی نہ کرنا چاہتے تھے اور بنک والوں نے اس کو ہم سے بھی پہلے قرضہ دے دیا ہے۔''

حلیمہ کو قرضہ ملنے پر خاندان کے تمام افراد بے حد خوش ہوئے۔ ان کو یوں لگا جیسے خدا نے ان کی سن لی ہو۔ حلیمہ کی ہمت بڑھ گئی اور اس نے باقاعدگی سے قسطیں ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ قرضے کی رقم ملتے ہی اس نے بلبو رانی گاؤں کے ایک دکاندار کالو سے ڈیڑھ سو روپے کی کانچ کی چوڑیاں، کانٹے اور دوسرا نقلی زیور خرید لیا۔ عیدی پورنامی ایک قریبی گاؤں سے اس نے سو روپے کا دھاگہ اور چھڑیاں خریدیں۔

حلیمہ نے دھاگے اور چھڑیوں سے ہاتھ کے بنے ہوئے پنکھے بنائے۔ پھر ان پنکھوں اور نقلی زیور کو قریبی دیہات میں فروخت کر دیا۔ اب یہی اس کا کاروبار ہے۔ گاؤں گاؤں گھوم کر وہ ان چیزوں کو بیچتی ہے۔ اس کی ماں کو اب بھیک مانگنے کی حاجت نہیں۔ وہ گھر میں رہتی ہے اور حلیمہ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ ہاتھ کے بنے ہوئے پنکھے بیچ کر حلیمہ بنک کی قسطیں ادا کرتی ہے۔ گروپ کی دیگر ارکان کے ساتھ اب اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے حلیمہ کہتی ہے کہ ''انسان اچھا ہو تو کوئی دوسرا اس میں غلطی کیسے نکال سکتا ہے؟''

مرکزی اجلاسوں سے حلیمہ کبھی غیر حاضر نہیں ہوتی۔ لیکن سودا بیچنے کے لئے اس کو گاؤں گاؤں جانا پڑتا ہے۔ لہٰذا کبھی کبھی وہ اپنی قسطیں سنٹرل لیڈر کے سپرد کر دیتی ہے۔ پنکھے بیچ کر اس نے پہلا قرض پوری طرح ادا کر دیا ہے۔ اب اس میں حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے اور سمجھتی ہے کہ اگر بنک نے اس کو زیادہ رقم قرض دی تو وہ رقم بھی آسانی سے ادا کر دے گی۔

بنک کے قواعد وضوابط کے مطابق حلیمہ نے دوسرے قرضے کے لئے درخواست دی تھی۔ چنانچہ اس کو پانچ سو روپے مل چکے ہیں ان میں سے بھی وہ دوسو روپے واپس کر چکی

MashalBooks.org

ہے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر وہ ٹھیک ٹھاک رہی تو بقیہ رقم بھی وقت پر ادا کر دے گی۔ میں جب اس سے ملنے گیا تو اس نے مجھے تاکید کی کہ میں ڈھاکہ میں بنک کے حکام سے کہوں کہ وہ آئندہ اس کو ایک ہزار روپے قرض دینے پر رضا مند ہو جائیں۔

میں نے حلیمہ سے اس کی آمدنی، اخراجات نفع اور نقصان کی بابت پوچھا تو وہ کہنے لگی ''جناب آپ نے اپنی کاپی میں ہم جیسے غریبوں کی تفصیلات سے بھرلی ہے۔ اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ ہم لوگوں کو نہ تو حساب کتاب آتا ہے اور نہ ہی حساب کتاب کرنے کی فرصت ہمیں نصیب ہوتی ہے۔ میں ہر روز دس پندرہ روپے کما لیتی ہوں۔ اس میں سے چار پانچ روپے میرا منافع ہوتا ہے۔ اس سے دال روٹی حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے خاندان کو روزانہ ڈیڑھ سیر چاول درکار ہوتے ہیں۔ اور اتنے چاول ہم لوگ خرید نہیں سکتے۔''

حلیمہ تین دن میں دو پنکھے بنالیتی ہے۔ ہر پنکھے پر اس کی ڈھائی تین روپے لاگت آتی ہے اور وہ پانچ روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر روز پنکھوں کا کوئی گاہک مل جائے۔ خیر، ان باتوں کے باوجود وہ اپنی بکری سے ہفتہ وار قسطیں ادا کر رہی ہے۔ اس طرح اس کی گزر بسر ہو رہی ہے۔

حلیمہ کی دونوں بیٹیاں گھر پر رہتی ہیں۔ وہ جب پھیری پر جاتی ہے تو سب سے چھوٹے بیٹے عبدالقاسم کو ساتھ لے جاتی ہے۔ یہ لوگ رات کو بچا کچا کھانا صبح ناشتے کے طور پر کھاتے ہیں۔ سہ پہر کو پھیری سے واپسی پر حلیمہ آٹا یا چاول خرید لاتی ہے اور شام کے کھانے کے طور پر پکا لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''میرے بچے بہت صابر ہیں۔ جو کچھ میں لاتی ہوں وہ اس پر قناعت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ چھوٹے بچے کے لیے ایک آدھ بسکٹ یا مٹھائی خرید لیتی ہے۔ ان بچوں کی تعلیم کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا۔ روٹی ہی مشکل سے دستیاب ہوتی ہے تو تعلیم کے اخراجات کہاں سے آئیں گے۔ اس کا شوہر کبھی کبھار دو چار مچھلیاں پکڑ لاتا ہے اور حلیمہ پھیری کے دوران ادھر ادھر سے تھوڑی بہت سبزیاں حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے پاس دو بطخیں بھی ہیں۔ گزشتہ ایک سال کے دوران اس نے اپنے منافع سے کھانے پینے کی چیزوں کے سوا گھر کے لئے کچھ نہیں خریدا۔ البتہ گرامین بنک کی گزشتہ سالانہ تقریب کے موقع پر اس کے بیس پچیس پنکھے فروخت ہو گئے تھے۔ اس سے ملنے والی رقم سے حلیمہ نے اپنے لئے ساٹھ روپے کی ایک ساڑھی خرید لی تھی۔

خاندانی منصوبہ بندی حلیمہ کو پسند نہیں ۔ خاندانی بہبود کی کارکن کو ملا خاتون اس کو منصوبہ بندی پر راضی کرنے کے لیے دوبارہ آئی۔ مگر حلیمہ نہ مانی، اس کا کہنا تھا کہ ''اگر آپریشن کے بعد میں بیمار ہوگئی تو میرے پورے خاندان کے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ یہ لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ ویسے بھی خدا نے مجھے بچہ دیا تو اس کی روٹی بھی دے گا۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ بنک کے قرضوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا وہ کیا کرے گی؟ حلیمہ کا جواب یہ تھا کہ ''پہلے میں کچھ رقم بچا لوں، پھر سوچوں گی۔'' تاہم اس کو مکمل یقین ہے کہ گرامین بنک کی امداد سے اس کے دن بدل جائیں گے۔

MashalBooks.org

شماری کی خوشیاں

بنگلہ دیش کے دیہی علاقوں میں سب سے بدقسمت طبقہ بے زمین افراد کا ہے۔ یہ طبقہ صدیوں سے اس بری طرح کچلا اور روندا جا رہا ہے کہ بہت سے لوگ اس کو انسان بھی مشکل سے ہی سمجھتے ہیں۔ کسی کو اس طبقے کے افراد کے سماجی یا معاشی حقوق کا احساس نہیں۔ اسی طبقے کی ایک فرد شماری بیگم، کا قصہ لکھنے کے لئے میں چار رکھت کے علاقہ میں گیا تھا۔ جب ہم اس کے گھر کے سامنے پہنچے تو وہ فرش صاف کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ساڑھی کا پلو سر پر رکھا اور استقبال کے لئے آگے بڑھی۔ اپنی خستہ حال جھونپڑی کے سامنے اس نے زمین پر چٹائی بچھائی اور ہم کو اس پر بیٹھنے کو کہا۔

شماری کی جھونپڑی پندرہ فٹ لمبی اور نو فٹ چوڑی ہے۔ اس کی چھت ٹین کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا چھپر ہے۔ ان دونوں جھونپڑوں کے گرد و پیش چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ شماری کی جھونپڑی میں چند لحاف، روز مرہ کے استعمال کے کپڑے اور پانچ سات برتن بکھرے ہوئے تھے۔ ملاقات کے پہلے دن شماری کسی قدر شرمیلی رہی اور زیادہ کھل کر بات نہ ہو سکی۔ وہ سمٹ کر ہمارے پاس ایک پیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تعارف اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور چاہا کہ گاؤں کے لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

MashalBooks.org

شماری کو یا اس کے گھر کے کسی فرد کو اس کی قطعی تاریخ پیدائش کا علم نہیں ۔ یہ بات شماری کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی نہ آئی ہوگی کہ کسی روز اسے اپنی کہانی کسی شخص کو سنانی پڑے گی۔ بہرطور ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ چار رکھت کے علاقہ کے بیلٹا نامی گاؤں میں 1957ء کے لگ بھگ پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ ٹنگائیل ضلع کے صدر تھانہ میں واقع ہے۔ اس کے باپ کا نام رجب خان اور ماں کا نام چاند بیگم ہے، اس کے دادا کا نام بورو خان اور دادی کا نام شجور جان ہے۔ رجب خان کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹیوں کے نام سمیرا بیگم، شہزادی بیگم، منو بی بی، نوری بیگم اور شماری بیگم ہیں جب کہ اکلوتے بیٹے کا نام قادر حسین ہے۔ وہ سب سے چھوٹا ہے۔ لڑکیوں میں شماری سب سے چھوٹی ہے۔ لہٰذا وہ سب کی دلاری تھی اور سب اس سے لاڈ پیار کرتے تھے۔ اس کی پرورش دادا دادی اور باپ کے لاڈ پیار میں ہوئی۔ ہر وقت وہ اس کو گود میں اٹھائے رکھتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ پورا خاندان ہی اس سے بے حد پیار کرتا تھا۔ قادر حسین اکلوتا بیٹا تھا۔ لہٰذا اس کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ شماری سے ڈھائی سال چھوٹا تھا۔

شماری کی پیدائش کے زمانے میں رجب خان اچھا بھلا کسان تھا۔ وہ اپنی زمین پر کاشت کرتا اور کاشت کے لئے دوسروں سے بھی زمین پٹے پر لے لیتا تھا۔ اس کی اپنی چار بیگھے زمین تھی۔ اس کا باڑ خاصا لمبا چوڑا تھا۔ جس میں جابجا پھلدار درخت لگے ہوئے تھے۔ باڑے میں سبزیاں بھی کاشت کی جاتی تھیں۔ اس خاندان کے پاس گائے اور بیل بھی تھے۔ جو ہل چلانے کے کام آتے تھے۔ شماری کی ماں گھر کا کام کاج کرتی تھی اور بڑی بیٹیاں اس کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی باپ کے ساتھ کھیتوں کو بھی چلی جاتی تھیں۔ شماری کی ایک چہیتی گائے تھی جس کا دودھ شماری کی ماں ہر روز دوہا کرتی تھی۔ یہ گائے روزانہ تین سیر دودھ دیتی تھی۔ اس میں سے دو سیر دودھ وہ لوگ بیچ دیا کرتے تھے جب کہ باقی کا دودھ گھر میں صرف ہوتا تھا۔ ان لوگوں نے گائے بکریوں کی رکھوالی کے لئے ایک شخص کو ملازم بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ روٹی، کپڑا اور رہائش کے علاوہ اس کو ڈھائی سو روپے سالانہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کھیتی باڑی سے حاصل ہونے والی آمدنی پر رجب خان کے خاندان کی زندگی اچھی خاصی گزر رہی تھی۔ پٹے کی زمین پر جو پیداوار ہوتی تھی، اس کا نصف حصہ رجب کے حصے آتا تھا۔ عام طور پر وہ گھر کے دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنی

پیداوار کا کچھ حصہ فروخت کر دیا کرتا تھا۔ وہ اپنی زمین پر دھان، پٹ سن، مسور، پیاز، ادرک اور کئی دوسری سبزیاں کاشت کیا کرتا تھا۔

گائے کے چھپر اور باورچی خانے کے علاوہ رجب خان کی دو جھونپڑیاں تھیں۔ ایک میں بڑی لڑکیاں رہتی تھیں اور دوسری میں شماری اپنے والدین اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ بچپن میں کبھی کبھی اس پر کالی کھانسی کا دورہ پڑا کرتا تھا۔ والدین اور بہنوں کو اس پر بہت پریشانی ہوتی تھی، لیکن انہوں نے علاج کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ البتہ دوا کے طور پر اس کو دیسی جڑی بوٹیاں دیا کرتے تھے۔ شماری دو سال کی ہوئی تو ٹائفائڈ بخار نے اس پر حملہ کر دیا۔ شروع میں گھر والوں نے پرواہ نہ کی۔ لیکن جب ان کو احساس ہوا کہ بیماری شدت پکڑ رہی ہے تو اس کا باپ گاؤں کے ایک حکیم کو لے آیا۔ حکیم صاحب گاؤں میں ڈاکٹر کے نام سے مشہور تھے۔ علاج سے شماری تندرست ہوگئی۔ مگر اس کو لگ بھگ ایک ماہ تک مصیبت اٹھانی پڑی۔

اس زمانے میں دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ دیہی معاشرہ اس کو اچھا نہ سمجھتا تھا اور اس کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ بچیوں کو تعلیم کی اجازت دی جاتی تو بھی وہ عربی اور مذہبی تعلیم تک محدود ہوتی۔ بنگالی زبان نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ شماری ایک سال تک گھر میں ماں سے عربی کا قاعدہ پڑھتی رہی۔ اس کی بڑی بہنوں، نوری او رشہزادی نے قرآن مجید پڑھ لیا تھا۔ جب کہ دوسری دو بہنیں سمیرا اور منو بی بی بالکل ہی ان پڑھ رہیں۔ بھائی قادر حسین نے مقامی پرائمری سکول سے تین جماعتیں پاس کیں۔ مگر وہ گھر میں اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لئے ماں باپ اور بہنوں کے لاڈ پیار نے اسے خراب کر دیا اور وہ آگے نہ پڑھ سکا۔

بہت چھوٹی عمر سے شماری نے گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ وہ جھاڑو دیتی، برتن مانجھتی اور چھوٹی سے صراحی میں کنویں سے پانی لاتی۔ کھانا پکانے میں بھی مدد کرتی تھی۔ اسی طرح مویشیوں کی دیکھ بھال اور سبزیوں کی کاشت میں بھی وہ حصہ لیتی۔

گھر میں کمانے والا صرف رجب خان تھا۔ شماری کی ماں کھلے صحن میں بہت سی سبزیاں کاشت کرتی تھی۔ ان کا کچھ حصہ بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ تاہم سبزیوں کا بڑا حصہ گھر میں کام آتا تھا۔ خاندان کی حالت اچھی تھی۔ ان لوگوں کو دو وقت کی روٹی میسر تھی۔

پہننے کو مناسب لباس اور بیماری کی حالت میں دوا دارو مل جاتا تھا۔ کوئی مشکل یا محرومی نہ تھی اور یہ لوگ خوش باش زندگی بسر کر رہے تھے۔

شماری کے بچپن میں مہنگائی نہ تھی۔ روز مرہ کے استعمال کی اشیاء بہت کم قیمت پر دستیاب تھیں۔ چاول دس آنے سیر، آٹا چھ آنے سیر، دودھ تین آنے سیر اور خوردنی تیل تین روپے سیر مل جاتا تھا۔ عید اور دوسرے تہواروں کے موقع پر رجب خان بچوں کے لئے نئے کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ خود شماری بچپن میں چھوٹی سی ساڑھی پہنتی اور بالوں میں سرخ ربن لگایا کرتی تھی۔ اس کی عیدیں خوشیوں میں گزرتی تھیں۔

تین بڑی بہنوں کی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ نوری بیگم کی شادی شماری کے سامنے ہوئی۔ اس وقت شماری کی عمر دس سال تھی۔ اس کو شادی کی تقریبات کی ساری تفصیلات اچھی طرح یاد ہیں۔ رجب خان نے دولہا کو ایک لنگی اور ایک قمیض دی تھی جب کہ دلہن کو دولہا والوں نے کنگن، کانٹے، چاندی کی ایک زنجیر اور دو ساڑھیاں دیں۔ نوری بیگم جب شادی کا سرخ جوڑا پہنے میکے سے رخصت ہوئی تو شماری بیگم کو خیال آیا کہ ایک دن وہ بھی اس انداز سے بابل کا آنگن چھوڑ جائے گی۔ وہ اداس سی ہو گئی۔ شادی کی ساری رسموں سے لطف اٹھانے کے باوجود شماری کے دل میں شادی سے متعلق گہرا خوف سا پیدا ہو گیا۔

نوری کی شادی کو ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ شماری پر ملیریا کا شدید حملہ ہو گیا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی اور باپ کو علاج معالجے پر چالیس پچاس روپے خرچ کرنے پڑے۔ تندرست ہونے کے بعد اس نے دوبارہ گھر کا کام کاج شروع کر دیا۔ ایک شام کو وہ کنویں سے پانی بھر کر لا رہی تھی کہ اچانک اس کا سر چکرایا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ مٹی کا برتن ٹوٹ گیا۔ ماں اس کو گھر لے گئی۔ اس کے سر پر پانی ڈالا، ہاتھوں اور پاؤں کی مالش کی۔ کافی دیر بعد شماری ہوش میں آئی۔ اس واقعہ سے ماں اس قدر پریشان ہوئی کہ ساری رات اس کو نیند نہ آئی۔ باپ کو بھی تشویش لاحق ہوئی اور وہ گاؤں کے حکیم کو بلا لایا۔ حکیم نے شماری کو دیکھا اور کہا کہ شدید جسمانی تھکاوٹ کے سبب اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔

نوری بیگم کو رخصت کرنے کے بعد رجب خان شماری کے ہاتھ پیلے کرنے کے ارادے باندھنے لگا تھا۔ اپنی اس محبوب بیٹی کے لئے وہ کوئی اچھا سا دولہا ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس بات کا وہ اکثر اپنی بیوی سے ذکر کرتا۔ وہ احتجاج کرتی کہ شماری کی ابھی عمر کیا ہے۔ وہ

MashalBooks.org

مشکل سے گیارہ برس کی ہوئی ہے۔ تم نے ابھی سے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا کیوں شروع کر دیا ہے؟ وقت آنے دو، پھر دیکھا جائے گا۔‘‘

روز بروز شماری جواں ہو رہی تھی اور اس کے باپ کی پریشانیاں بڑھتی جا رہیں تھیں۔ چودھواں سال پورا کر کے اس نے پندرہویں سال میں قدم رکھ دیا۔ وہ خوبصورت تھی اور سگھڑ بھی۔ چنانچہ اس بات نے ساتھ والے پڑوسی لالو فقیر کو متوجہ کر لیا۔ وہ شماری کو بہو بنانے کی سوچنے لگا۔ لیکن فی الحال اس نے دل کی بات دل میں رہنے دی۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔

ایک سہ پہر کو رشتے کرانے والا ایک داڑھی والا بوڑھا آدمی شماری کے لئے رشتہ لے کر رجب خان کے گھر آیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکا آلو بہانی بامی گاؤں میں رہتا ہے۔ رجب خان نے اس کی بات سنی اور معقول سا جواب دیا کہ وہ لڑکے اور اس کے گھر بار کو دیکھ کر ہی جواب دے سکے گا۔ چنانچہ وہ گاؤں کے ایک چوہدری قیادت علی کو ساتھ لے کر آلو بہانی گاؤں گیا۔ لیکن یہ رشتہ اس کو پسند نہ آیا اور اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد چارکھت کے علاقے سے شادی کی ایک اور تجویز آئی۔ مگر رجب علی اس بار بھی نہ مانا۔

آخر کار لالو فقیر اپنے بیٹے رمضان علی کے لئے رشتہ مانگنے آ گیا۔ وہ رجب علی خان کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ رجب علی نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اصل میں اس کو یہ بات بھی اچھی لگی تھی کہ لالو فقیر کی بہو بن کر شماری دور نہ جائے گی۔ اس کے قریب ہی رہے گی۔ شماری رمضان علی کو بچپن سے جانتی تھی اور اس کو بڑے بھائی کا درجہ دیا کرتی تھی۔ خواب میں بھی کبھی اس نے رمضان علی کو خاوند کا روپ نہ دیا تھا۔ دوسری طرف غالباً رمضان علی خود بھی اس رشتے پر زیادہ خوش نہ تھا۔ بعد میں واقعات نے اس شبے کی تصدیق کر دی تھی۔

خیر، شادی طے ہوگئی۔ رجب علی بے حد خوش تھا اور اس کا خیال تھا کہ شماری بھی بہت خوش ہوگی۔ اس نے شماری کو جہیز میں اپنی آدھی جائیداد دینے کا اعلان کر دیا۔ رمضان علی اس حوالے سے شادی پر تیار ہوا تھا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ شادی کے بعد جائیداد قانونی طور پر شماری کو منتقل کر دی جائے گی۔ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد شماری رمضان علی سے پردہ کرنے لگی۔ وہ ہونے والے دولہا سے شرمانے لگی اور جہاں کہیں وہ نظر آتا، شماری آگے پیچھے ہو جاتی۔

شانو بیگم نامی ایک لڑکی سے رمضان کا معاملہ چل رہا تھا اور اس نے شانو سے شادی کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ وہ اکثر چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ شماری سے شادی پر رمضان علی محض جائیداد کے لالچ کی وجہ سے تیار ہوا تھا۔ کسی کو بھی اس کے دلی ارادوں کی خبر نہ تھی۔ شماری کے والدین بھی بالکل بے خبر تھے۔ خیر شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ گاؤں کے تقریباً پچیس افراد اس میں شریک ہوئے اور رجب علی خان نے ان کے لئے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔

اس نئے داماد کو رجب علی نے ایک لنگی، ایک قمیض، ایک صدری اور جوتوں کا ایک جوڑا شادی پر دیا۔ لالوفقیر نے بہو کو ایک ساڑھی، بلاوز، پیٹی کوٹ، صابن، تیل اور اس قسم کی دوسری چیزیں دیں۔ زیور میں چوڑیاں، کانٹے اور ہار شامل تھا۔ شماری کے والد نے چونکہ اس کو آدھی جائیداد دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس لئے جہیز کا تعین بھی اسی حوالے سے ہوا۔ رجب علی نے تو یہ پیش کش بھی کر دی تھی کہ شادی کے بعد اس کی بیٹی اور داماد اسی کے گھر میں رہیں۔ لالوفقیر کے بیٹے کو سسرال میں رہنے سے نصف جائیداد کے حصول میں آسانی ہو سکتی تھی، اس لئے لالوفقیر نے اس پیش کش پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنی نئی نویلی بہو کو گھر بھی نہ لے گیا۔ شادی کی تقریب ختم ہونے پر وہ اپنے مہمانوں کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ رمضان اپنے سسر کی گھر ہی میں رہ گیا۔

شادی کے ساتھ ہی رمضان اور شماری کی زندگیوں کا ایک نیا باب شروع ہو۔ رمضان سسرال میں مقیم رہا اور کھیتی باڑی میں سسر کی مدد کرنے لگا۔ شماری گھر کا کام کاج کرتی۔ وہ سب مل جل کر خوشیاں اور غمی بانٹنے لگے۔ رجب علی بھی داماد کو گھر میں رکھ کر بہت خوش تھا۔

شادی کے ایک ماہ بعد رمضان کی بہن رانی کے گھر میں ایک واقعہ پیش آ گیا۔ رانی اور شماری دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ رانی اکثر اوقات شماری کے ساتھ اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ ایک رات اچانک رانی کے گھر سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ساتھ چور چور، کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شماری اور رمضان دونوں بھاگ کر وہاں پہنچے تو رانی خون میں لت پت زمین پر گری ہوئی ملی۔ اس کے ساتھ والی جھونپڑی میں رانی کی ساس اور سسر اور دوسرے بہن بھائی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ چوروں نے ان کو بے رحمی سے

مارا پیٹا تھا اور گھر کی تمام قیمتی اشیاء لوٹ کر بھاگ گئے تھے۔ رانی کے سر پر بندوق کا دستہ مارا گیا تھا جب کہ اس کی ساس پر چاقو سے کئی وار کئے گئے تھے۔ سسر اور دوسروں کو بھی بے دردی سے پیٹا گیا تھا۔ وہ دردناک منظر آج بھی شماری کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور وہ اس کو بھول نہیں سکی ہے۔ اس ظالمانہ واقعہ کی تمام تفصیلات شماری کو اچھی طرح یاد ہیں۔

شماری دوبارہ اپنے سسرال گئی۔ پہلی بار وہ بارہ روز تک وہیں رہی۔ پانچ ماہ بعد وہ اپنی نند الا بچی کے ساتھ دوبارہ سسرال گئی۔ اس بار وہ ایک ماہ تک وہاں رہی۔ ساس اور سسر کے علاوہ شماری کے چار دیور اور تین نندیں تھیں۔ سب اس سے محبت کرتے تھے اور عزت بھی بہت کرتے تھے۔ شماری بھی ان کو بہت چاہتی تھی۔ اور ان سب کے ساتھ محبت واحترام سے پیش آتی تھی۔ ایک سال یونہی بیت گیا۔

سال تو بیت گیا مگر رمضان اپنی پرانی محبوبہ شانو کو بھلا نہ سکا۔ وہ چھپ چھپ کر اس سے ملتا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ شانو کی محبت کا اثر بڑھنے لگا۔ ڈیڑھ برس بعد رمضان بیوی کو اپنے گھر لے آیا۔ یوں سسر کے مشترکہ خاندان میں شماری کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ یہاں وہ گھریلو کاموں میں اپنی نندوں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ لالو فقیر کے پاس تین بیگھے زمین تھی۔ وہ اس زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا اور کچھ زمین بٹے پر بھی لے لیتا تھا۔ بڑے بیٹے کہیں اور محنت مزدوری کرتے تھے جب کہ ایک اور بیٹا اکرم علی رکشہ چلاتا تھا۔ سب افراد چونکہ کوئی نہ کوئی کام کرتے تھے اس لیئے خاندان کی گزر بسر اچھے انداز میں ہو رہی تھی۔

انہی ایام میں شماری حاملہ ہو گئی۔ پہلے پہل صرف اس کے شوہر کو اس امر کی اطلاع ہوئی لیکن رفتہ رفتہ گھر کے تمام لوگوں تک خوشی کی یہ خبر پہنچ گئی۔ ایک شام کھانے کے بعد شماری اور رمضان اکٹھے بیٹھے تھے کہ رمضان نے ایک عجیب وغریب بات شروع کر دی۔ وہ بیوی سے کہنے لگا کہ ''گھر میں تمہیں بہت سا کام کرنا پڑتا ہے اور تم تھک جاتی ہو۔ کیوں نہ میں ایک اور بیوی لے آؤں۔ وہ تمہاری مدد کیا کرے گی اور تمہیں زیادہ کام نہ کرنا پڑے گا۔ شانو کو تم جانتی ہو، وہ بڑی محنتی لڑکی ہے۔ گھر میں آ جائے گی تو تم مزے میں رہو گی۔'' یہ بات سن کر شماری کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سخت پریشان ہوئی مگر اس نے شدومد سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس واقعہ کے دو روز بعد رمضان شانو کے ساتھ کہیں رفو چکر ہو گیا۔ شماری کی دنیا ہی لٹ گئی۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ غصے اور رنج کے عالم میں وہ بے چاری آنسو

بہانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس نے کھانے پینے سے انکار کر دیا اور گھر والوں کی منتیں بھی اس کو ایک لقمہ کھانے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ دوسری صبح ہوئی تو رمضان شانو کو ساتھ لئے لوٹ آیا۔ یہ منظر دیکھ کر شماری اپنے دکھ پر قابو نہ پاسکی اور باپ کے گھر چلی آئی۔

شماری کے جانے کے بعد رمضان الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ شانو نے یہ کیفیت دیکھی تو اس کے باپ سے کہنے لگی۔''تمہارے بیٹے نے رات میرے ساتھ گزاری ہے۔ اب اس کو میرے ساتھ شادی کرنی ہوگی'' لالوفقیر مہر بہ لب رہا۔ یہ بات شماری کے کانوں تک پہنچی تو وہ شوہر کے گھر لوٹ آئی۔ شانو کا بھائی قاسم اس شادی کی مخالفت کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے تھانے میں رپورٹ درج کروا دی۔ اس پر پولیس آئی اور رمضان اور شانو دونوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ٹنگائیل کے تھانے میں دونوں کے بیانات قلمبند کروائے گئے۔ تھانے میں دونوں نے شادی پر رضا مندی ظاہر کر دی۔

اس گاؤں کے تین چوہدری، ارشاد معتبر، عالم معتبر اور کرامت علی اپنی کمینگی اور سازشی فطرت کے حوالے سے جانے پہچانے ہیں۔ ان تینوں نے اس معاملے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے شماری کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے دے۔ وہ شماری کو اپنے ساتھ تھانے لے گئے، یہاں شماری نے تذبذب کے عالم میں اس امر کی اجازت دے دی۔ یوں رمضان اور شانو کی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد رمضان، شانو اور شماری گھر لوٹ آئے۔

شماری مقدر کے آگے سر جھکانے پر آمادہ تھی۔ وہ سوکن کو برداشت کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوگئی تھی۔ مگر اس کا باپ بہت غصے میں تھا۔ اس نے کہا''شماری میری عزیز ترین بیٹی ہے۔ میں نے اس کے لئے ہمسائے کا رشتہ اسی لئے منظور کیا تھا کہ اس کی خوشیاں اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہوں۔ میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور عورت اس کے شوہر کی شریک ہو جائے۔ میں اس کی اجازت بالکل نہیں دوں گا۔ بس شماری کو ایک پل بھی اس گھر میں رہنے نہ دوں گا'' رجب علی شماری کو لینے اس کے گھر گیا۔ شماری کو باپ کی بات ماننی پڑی۔ چنانچہ رمضان کو چھوڑ کر وہ باپ کے ساتھ چلی آئی۔

لالوفقیر کو بھی بیٹے کے رویے سے شدید رنج پہنچا تھا۔ اس نے رمضان سے تعلق قطع کر لیا وہ اور شانو باقی خاندان سے الگ ہو گئے۔ اس دوران میں رمضان نے شماری کو

واپسی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ خیر، شماری کو اپنے شوہر سے محبت تھی اور وہ واپس آنا بھی چاہتی تھی، لیکن وہ باپ کی حکم عدولی کی جرات نہیں کر سکتی تھی اور باپ کی حالت یہ تھی کہ وہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی سننے پر تیار نہ تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی بیٹی رمضان جیسے شیطان کے ساتھ نہ رہے گی۔

شماری کو باپ کے گھر آئے تقریباً چار ماہ ہوئے تھے کہ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ رمضان اپنی بچی کو دیکھنے آیا۔ رجب علی خان نواسی کی پیدائش پر بے انتہا خوش تھا۔ اس نے نواسی کا نام صبور جان رکھا۔ وقت گزرتا گیا اور باپ کے گھر میں شماری کو ڈیڑھ سال بیت گیا۔ پھر اچانک وہ بیمار ہوگئی۔ کھانسی، خونی پیچش اور کمزوری کے سبب رجب علی کی حالت بتدریج بگڑنے لگی۔ گھر کی ساری ذمہ داری اس کے اکلوتے بیٹے قادر کے کندھوں پر آپڑی۔ باپ کے مشورے پر اس نے علاج معالجے کے لئے بہت سی رقم قرض لے لی۔ آخر کار اسے قرضے واپس کرنے کی خاطر ایک بیگھہ زمین فروخت کرنی پڑی۔ رجب علی تندرست پھر بھی نہ ہوا۔ رمضان کبھی کبھار بیمار سسر کی بیمار پرسی کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے لگا تھا۔ ایک بار جب اس کو ہفتہ وار رقم ملی تو وہ بیٹی کے لئے کپڑے خرید لایا اور چھپ کر شماری کے حوالے کر دیئے۔ شماری انکار نہ کر سکی۔ اس نے کپڑے لے لئے۔

بیمار اور لاغر رجب خان کو شماری کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ایک روز اس نے رمضان کو بلا بھیجا۔ دن بھر کی مزدوری کے بعد رمضان شام کے وقت سسر کے پاس آیا۔

یہاں ہم یہ بتا دیں کہ رمضان سے قطع تعلق کرتے ہوئے اس کے باپ لالو فقیر نے اس کو صرف ایک چھوٹی سی جھونپڑی دی تھی۔ اس کے سوا باپ کی ہر قسم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد پر رمضان کا کوئی حق نہ رہا تھا۔ دوسری شادی پر لالو فقیر کو اس قدر رنج پہنچا تھا کہ اس نے بیٹے کا خیال کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ رمضان علی کو اب سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ بھٹہ مزدور کی قلیل اجرت میں وہ نئی بیوی، شانو کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ جب وہ رجب علی سے ملنے آیا تو رجب علی نے کہا ”میں نے بڑی امیدوں سے اپنی بیٹی تمہارے سپرد کی تھی، مگر اس کے مقدر میں کوئی خوشی نہ لکھی تھی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ میرے مرنے کے بعد شاید اس گھر میں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا میں ایک بار پھر شماری تمہیں سونپ رہا ہوں۔ اس کو ساتھ لے

MashalBooks.org

جاؤ اور خوش رہو۔ اور ہاں، شادی کے وقت میں نے جو اراضی تمہیں دینے کا وعدہ کیا تھا تم اس کو اپنے نام انتقال کا بندوبست کرلو۔''

رمضان نے حامی بھر لی۔ شوہر کو دوبارہ حاصل کر کے شماری بھی بہت خوش تھی۔ شماری کی رضا مندی سے رمضان زمین کے انتقال کے انتظامات کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ رجب علی کی شدید علالت کے پیش نظر سب رجسٹرار کو اس کے گھر لانے کا بندوبست کیا گیا۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ سب رجسٹرار کی آمد سے ایک روز پہلے رجب علی فوت ہو گیا۔ آخری لمحوں میں شماری، اس کا بھائی اور بہن رجب علی کے پاس تھے۔ ان کی ماں غش کھا کر گر پڑی۔ رمضان اور اس کے باپ لالو فقیر کو موت کی اطلاع ملی تو وہ دونوں بھاگے آئے۔ دوسرے روز رجب علی کو گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

باپ کی موت سے شماری کی زندگی کی رہی سہی خوشیاں بھی چھن گئیں۔ وہ اندھیروں میں ڈوب گئی۔ ایک بار پھر گاؤں کے دو عیار چوہدری کرامت علی اور عالم معتبر جال بچھانے لگے۔ انہوں نے شماری کو شوہر کے گھر نہ جانے دیا۔ ہوا یوں کہ ان دونوں کے اکسانے پر لالو فقیر قادر پر دباؤ ڈالنے لگا کہ وہ ایک بیگھہ زمین اپنی بہن شماری کے حوالے کر دے اور اس ضمن میں دستاویز بھی تیار کرے۔ وگرنہ شماری کو شوہر کے پاس واپس نہ جانے دیا جائے گا۔ لیکن قادر نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شماری غریب بھائی کے گھر بیٹھی رہ گئی۔ پھر قادر نے شادی کر لی۔ شروع میں تو گھر آنے والی نئی دلہن کے ساتھ اچھے دن گزرے لیکن چھ ہی ماہ بعد حالات بدلنے لگے۔ قادر شماری کو ناگوار بوجھ سمجھنے لگا۔ یوں شماری اور اس کی بیٹی کے لئے زندگی دوبھر ہو گئی۔ مصیبت کے ان دنوں میں لالچی اور ظالم رمضان نے بیوی اور بیٹی کی خبر بھی نہ لی۔

شماری کو مرغیاں پالنے کا شوق تھا۔ ماں نے اس کو دو مرغیاں اور دو بطخیں خرید دیں تھیں۔ چند ماہ بعد مرغیاں اور بطخیں انڈے دینے لگی تھیں۔ شماری بہت خوش ہوئی۔ وہ انڈے بیچ کر رقم بچانے لگی۔ انہی دنوں اس کی بیٹی اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گئی اور شماری کی ساری بچت اس کے علاج معالجے پر خرچ ہو گئی۔

قادر کا حال تھا کہ وہ باپ کی طرح ہوشیار اور محنتی نہ تھا۔ وہ جائیداد کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کر رہا تھا۔ یوں کافی زرعی اراضی ہونے کے باوجود خاندان کے مالی حالات اچھ

نہ رہے تھے۔ غربت کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی ان لوگوں کو مناسب کھانا بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

طبیعت کے اعتبار سے شماری بہت اچھی عورت ہے۔ وہ جھگڑالو بالکل نہیں ہے۔ دوسروں کا خیال رکھتی۔ محبت سے پیش آتی ہے۔ سسرالی عزیزوں کے ساتھ اس کا میل جول بہت اچھا ہے۔ وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ شانو کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ شانو اس کو برداشت نہیں کرتی۔ رمضان کا رویہ بھی اس کے ساتھ زیادہ قابل تعریف نہیں رہا۔ شادی کے ایک سال بعد کا ذکر ہے کہ کھانے کی تیاری میں تاخیر پر رمضان غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے برتن اٹھا کر پھینک دیئے تھے۔ اور شماری کو ٹھڈے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر وہ اس قسم کی ساری زیادتیاں خاموشی سے برداشت کرتی رہی اور زبان بند رکھی۔ اس نے ان باتوں کا ذکر تک نہ کیا۔ بس چھپ چھپ کر روتی رہی۔

رمضان کی بہن الائچی کی شادی ڈگالیہ گاؤں کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ جس کی پہلے بھی ایک بیوی تھی۔ باپ کی خواہش پر الائچی اس شخص سے بیاہی گئی تھی۔ ان دنوں شماری اپنے باپ کے گھر میں رہا کرتی تھی۔ لہٰذا وہ اس شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی۔

باپ کی موت کے ڈھائی سال بعد تک شماری میکے میں رہی۔ 1980ء کے سیلاب کے دنوں میں ٹنگائیل کے اکثر علاقوں کی طرح بیلٹا گاؤں بھی زیر آب آ گیا۔ اس سے مکانوں، فصلوں اور مویشیوں کو شدید نقصان پہنچا۔ اپنی شیر خوار بچی کے ساتھ شماری ان دنوں باپ کے گھر میں رہا کرتی تھی۔ ان کا گھر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم انہوں نے ایک چبوترہ بنا کر اس پر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران کئی بیماریاں اور وبائیں پھوٹ پڑیں اور سیلاب کے ساتھ بے شمار سانپ بھی آبادیوں میں پہنچ گئے۔ کئی گھر تباہ ہو گئے۔ واقعی وہ لوگوں کے لئے کڑی آزمائش کے دن تھے۔

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی، (1971ء) کے زمانے میں شماری کی عمر چودہ سال تھی۔ اس کا پورا خاندان، بلکہ یوں کہیے کہ پورا گاؤں جنگی کارروائیوں کے باعث خوف زدہ ہو گیا تھا۔ نوجوان عورتیں اور مرد خاص طور پر نشانہ بن رہے تھے۔ عورتوں اور بالخصوص دوشیزاؤں کے اغوا اور عصمت دری کے بہت سے واقعات پیش آ رہے تھے۔ شماری کے گاؤں اور گردو پیش کے دیہات سے ہندو بھاگ گئے تھے۔ شماری کو بھی کئی بار حفاظت کی خاطر محفوظ

MashalBooks.org

جگہوں پر بھیجا گیا تھا۔

خیر، وہ زمانہ اب گزر چکا ہے۔ یادیں ہی باقی ہیں۔ شماری کا قصہ یہ ہے کہ بچی کی پیدائش کے بعد اس نے دور کی ایک رشتہ دار عورت سے پانچ سو روپے ادھار لئے تھے۔ ان روپوؤں پر اسے کوئی سود ادا نہ کرنا تھا۔ یہ رقم شماری کے بھائی کے لئے رکشہ چلانے کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ ان دنوں اس کنبے کی حالت زیادہ ہی خراب ہو چکی تھی۔ لائسنس ملنے کے بعد قادر رکشہ چلانے لگا۔ جو کچھ وہ کماتا، اس میں سے رکشہ کے مالک کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی رقم پر پورا خاندان بڑی مشکل سے گزارا کر رہا تھا۔

سودخوروں کا پہلا تجربہ شماری کو اس وقت ہوا تھا جب اس کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ اس کے باپ نے دس روپے مہینہ کے سود پر اپنی زمین کے لئے پانچ سو روپے قرض لئے تھے۔ مگر سودخوروں نے ایسا چکر چلایا کہ صرف چھ ماہ میں قرض پانچ سو روپے سے بڑھ کر آٹھ سو روپے تک جا پہنچا۔ آخر کار رجب علی نے کچھ زمین بیچ کر قرض ادا کیا۔ اس دوران رجب علی کو کئی بار توہین اور بے عزتی بھی گوارا کرنی پڑی تھی۔ سخت کوششوں کے باوجود وہ قرض ادا نہ کر سکا تھا اور زمین فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ خیر، شماری کا کہنا ہے کہ ساہوکار اب اس قدر طاقتور نہیں رہے جتنے کہ وہ چند سال پہلے تک ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں، باپ کی موت کے بعد قادر شماری کو بوجھ سمجھنے لگا تھا۔ رمضان نے بھی اپنی پہلی بیوی یا بیٹی کی خبر نہ لی تھی۔ یوں بھائی اور خاوند دونوں نے شماری کو نظر انداز کر دیا تھا۔ قادر بہت سست و کاہل تھا۔ وہ باقاعدگی سے رکشہ نہ چلایا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمین اس کے پاس تھی۔ اس پر کاشت نہ کرتا تھا، بلکہ کسی اور کو پٹے پر دے رکھی تھی۔ جو کچھ اس سے ملتا تھا، وہ کنبے کی ضروریات کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ کئی بار شماری اپنی مرغیوں سے ملنے والی رقم سے کنبے کے لئے دال روٹی کا بندوبست کرتی تھی۔ اس کی اپنی حالت یہ تھی کہ ساڑھی تار تار ہو چکی تھی، مگر وہ نئی ساڑھی خریدنے کی استطاعت نہ رکھتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ بوسیدہ ساڑھی سے تن ڈھانپنے کے جتن کرتی تھی۔ کنبے کے افراد کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے دال روٹی اور تن ڈھانپنے کے لئے لباس میسر نہ تھے تو بیماری کے عالم میں ان کو علاج معالجے کی سہولتیں کہاں سے میسر آتیں۔ چنانچہ انہی دنوں، چھوٹی بچی صبور جان اسہال کے مرض میں مبتلا ہوئی تو اس کے مناسب علاج کا بندوبست نہ ہو سکا۔ آخر

کار ہو معصوم جڑی بوٹیوں کے ٹوٹکوں ہی سے تندرست ہو گئی۔

پہلے پہل شماری نے ایک دور کے رشتہ دار سے گرامین بنک کے پراجیکٹ کے بارے میں سنا۔ اس رشتے دار کا نام جلیل تھا۔ جلیل نے یہ خبر گاؤں کے دوسرے رکشہ ڈرائیوروں سے سنی تھی۔ جلیل نے شماری سے کہا ''تم کئی مشکلات میں مبتلا ہو۔ تم گرامین بنک سے قرض کیوں نہیں لے لیتیں۔ یہ بنک بے زمین غریبوں کی امداد کر رہا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پانچ افراد کا ایک گروپ بن جائے تو ان کو بنک سے قرض مل جاتا ہے۔ تم تعلقہ دار کی بیوی سے بات کرو اور اس بنک سے قرضہ لینے کے قواعد وضوابط پوچھ لو' شروع میں شماری کو جلیل کی بات کا یقین نہ آیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ''بنک سے قرضہ لینے کے لئے تو مکان یا زمین رہن رکھنی پڑتی ہے۔ میرے پاس گھر ہے نہ زمین۔ مجھے بنک کیونکر قرضہ دے گا۔'' پھر ایک روز اس نے گرامین بنک کا چرچا ایک عورت سے سنا جس کے سسرال باروبیلٹا گاؤں میں تھے۔ اس عورت نے گرامین بنک سے ایک ہزار روپے قرض لئے تھے۔ اسی عورت نے شماری کو قرضہ حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ اس کے بعد شماری خود ایک گروپ بنانے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ بڑی بہن سمیرا اور اس کے میاں شیر علی سے بھی اس نے مشورہ کیا۔ انہوں نے شماری کی ہمت بڑھائی، تاہم ساتھ ہی یہ بھی جتلا دیا کہ اس معاملے میں خطرات بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کو خود بھی گرامین بنک کے منصوبوں کے بارے علم نہ تھا۔ یوں شماری تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ایک طرف تو وہ اپنا گروپ بنانے اور قرضہ حاصل کرنے کی آرزومند تھی اور دوسری طرف ساہوکاروں کے ہاتھوں باپ کے ساتھ ہونے والے سلوک کی یادیں اس کو ڈراتی بھی تھیں۔ تین مہینے اسی عالم میں بیت گئے اور شماری گروپ بنانے کی ہمت نہ کر سکی۔

بعد ازاں ماں کے کہنے پر شماری نے اپنے علاقے کے بنک ملازمین کے ساتھ مشورہ کیا۔ انہوں نے گروپ سازی کا طریقہ بتایا۔ اس کے بعد شماری نے پاس پڑوس میں رہنے والی عورتوں لطف النسا بیگم، تہمینہ بیگم، پیال بیگم اور جانو بیگم کو اکٹھا کیا اور گروپ بنالیا۔ فیلڈ منیجر کی اجازت سے فیلڈ ورکر پانچ عورتوں کے اس گروپ کو تربیت دینے لگا۔ جب اس گروپ کا پہلا اجلاس ہوا تو فیلڈ منیجر خود آیا اور اس نے ان عورتوں کو گرامین بنک کے پراجیکٹ کے قواعد کے بارے میں بتایا۔ پھر اس گروپ کے کئی اجلاس ہوئے اور آخر

کار10 دسمبر1980ء کو یہ گروپ باقاعدہ طور پر رجسٹر کر لیا گیا۔ یہ اس علاقے کا دوسرا گروپ تھا۔

شماری گروپ اور سنٹر کے قواعد وضوابط خوب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ لہٰذا پہلے تو اس کو گروپ کی چیئر مین منتخب کر لیا گیا اور بعد ازاں اس کو چار کھت گاؤں کی بے زمین عورتوں کی تنظیم کی مرکزی لیڈر بنا دیا گیا۔ یوں بھی اس میں قائدانہ صلاحتیں موجود ہیں۔ گروپ اور سنٹر کی تمام عورتیں اس کی بات مانتی ہیں اور اس کے مشوروں پر عمل کرتی ہیں۔

گروپ کی ارکان میں سے سب سے پہلے تہمینہ بیگم اور پیال بیگم کو گرامین بنک نے قرضہ دیا۔ پرچون کی دکان کھولنے کے لیے تہمینہ کو ایک ہزار روپے اور دھان کے کاروبار کے لئے پیال کو اٹھ سو روپے ملے۔ دکان چلانے کے کام میں مدد دینے کے لیے تہمینہ کو چھوٹا بھائی موجود تھا۔ جب کہ پیال دھان کو صاف کرنے اور چاول کا کام گھر پر ہی کرتی تھی۔ اس کی چھوٹی نند اس کام میں مدد دیتی تھی۔ دو ماہ بعد ان دونوں ارکان کی کامیابی کے بعد بنک سے ایک بچھڑا خریدنے کے لیے شماری کو سات سو روپے بطور قرض دے دیئے۔ پہلی بار وہ زیادہ رقم حاصل کرنے کا خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی۔

شماری نے جب گروپ سازی کا عمل شروع کیا تھا۔ اور وہ اس مقصد کے لئے مختلف ارکان کے گھر جانے لگی تھی تو یہ بات اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں کو بری لگی۔ ان لوگوں نے باتیں بنانی شروع کر دی تھیں۔ بھائی قادر نے بھی ناک بھوں چڑھائی۔ اس کا کہنا تھا کہ ”عورتوں کو بنک سے رقم لینا زیب نہیں دیتا۔ اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔“ رقم سے تم کچھ نہ کر سکو گی۔ پیسے ادھر ادھر یونہی ضائع کر دوگی اور پھر جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔“ طاہر علی نامی ایک بااثر ہمسائے نے بھی اس کو بنک سے معاملہ نہ کرنے کی تنبیہہ کی۔ اس کا کہنا تھا کہ ”تم بنک سے رقم تو لے سکتی ہو مگر اس کا کیا کرو گی۔ سارے پیسے یونہی ضائع ہو جائیں گے۔ پھر تمہیں اپنی ہر شے بیچ کر رقم لوٹانی پڑے گی۔ یہ کھیل تمہیں فقیر بنا دے گا۔“

یہ باتیں سن کر شماری پریشان ہو جاتی، مگر اس کا جوش کم ہوا اور نہ ہی قدم ڈگمگائے۔ چنانچہ جب اس نے اولین قرضہ حاصل کیا تو وہ بڑی خوش تھی۔

پیسے آئے تو تشویش بڑھ گئی۔ شماری کو زیادہ تشویش اس امر کی تھی کہ اس رقم کو کیسے بہترین طور پر بروئے کار لاسکتی ہے۔ پھر اس نے اپنی قسطیں بھی باقاعدگی سے ادا کرنی

تھیں۔ معاشرے میں اپنا سر بھی اونچا رکھنا تھا!

چھ سو روپے کا شماری نے بچھڑا خرید لیا اور جو سو روپے باقی بچے، اس کی پانچ بطخیں لے لیں۔ ماں کی دی ہوئی چند مرغیاں اوربطخیں پہلے ہی اس کے پاس تھیں۔ بچھڑے سے فی الحال کوئی کام نہ لیا جا سکتا تھا لہٰذا شماری کو اپنی بطخوں اور تین مرغیوں پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔ جو مل کر آٹھ نو انڈے روزانہ دیتی تھیں۔ بعض اوقات ان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہو جاتی۔ وہ ایک روپے کا ایک انڈا بیچتی اور یہی اس کی آمدنی کا بڑا وسیلہ تھا۔ بنک کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کرنے کی خاطر شماری سبزیاں اگانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ چنانچہ اس نے جھونپڑی کے ساتھ خالی جگہ پر سبزیاں بیج دیں۔ وہ اپنی اقساط ادا کرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے قابل بھی ہو گئی۔ بلاشبہ اس کو بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور بہت کچھ قربان کرنا پڑتا تھا۔ وہ ایک ایک پائی سوچ سمجھ کر خرچ کرتی۔ اب وہ بھائی پر بوجھ نہ رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے اور بیٹی کے کھانے پینے کا انتظام علیحدہ کر لیا۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ اس کی آمدنی کا وسیلہ بن گیا تھا اور اب اس کو فاقوں کا ڈر نہ رہا۔ ہر روز وہ اپنی آمدنی میں سے تین روپے قسط کی ادائیگی کے لیے سنبھال لیتی۔ اس کی ہفتہ وار قسط چودہ روپے تھی اور وہ ہر جمعہ کو جمع کروائی جاتی تھی۔

چالیس ہفتوں میں شماری نے گرامین بنک کا سات سو روپے کا پہلا قرض ادا کر دیا۔ اس کامیابی پر وہ بے انتہا خوش ہوئی۔ اس کے منافع میں بچھڑا بھی شامل تھا جو اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔

سنٹر کے اجلاسوں میں شماری باقاعدگی سے شریک ہوتی ہے۔ اب تک وہ صرف دو بار غیر حاضر ہوئی ہے۔ پہلی بار وہ بیماری کے سبب نہ جا سکی تھی اور دوسری بار یہ ہوا کہ وہ ہاتو بانگا میں گرامین بنک کی طرف سے منعقد ہونے والی خواتین کی ورکشاپ میں شرکت کے لئے گئی ہوئی تھی۔

ان عورتوں کے گروپ فنڈ میں ایک ہزار روپے جمع ہو چکے ہیں۔ لیکن کوئی رکن اس رقم کو ذاتی کاموں کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شماری کی قیادت میں اس گروپ نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ گروپ فنڈ کی رقم سے دھان صاف کرنے والی ایک

مشین خرید لی جائے۔

جن دنوں شماری پہلا قرض اتار رہی تھی اور اس کی تاریک زندگی میں امید کی کرن جگمگانے لگی تھی، رمضان سائیکل رکشہ چلا کر زندگی کی بوجھل گاڑی کھینچ رہا تھا۔ وہ رکشہ کے مالک کو آٹھ روپے یومیہ ادا کرتا تھا۔ جو کچھ باقی بچتا، اس سے بیوی بچوں کی ضرورت پوری کرنا بے حد دشوار تھا۔ اس کی زندگی دکھ، مصائب اور سختیوں کا نشانہ بن گئی تھی۔ شانو نے انہی دنوں ایک بیٹے کو جنم دیا۔ چاند میاں اس کا نام رکھا گیا۔ جن دنوں شماری کا پہلا قرض ختم ہوا، تقریباً انہی دنوں رمضان اس کو واپس اپنے پاس لانے میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کام کے لئے اس نے اپنے باپ کے علاوہ گاؤں کے بزرگوں سے بھی مدد مانگی۔

یہ معاملہ ابھی چل رہا تھا کہ شماری کو دو ہزار روپے کا ایک اور قرضہ مل گیا۔ اس رقم میں سے اس نے سترہ سو روپے کی دودھ دینے والی ایک گائے اور ایک بچھڑا خرید لیا۔ تین سو روپے باقی بچ گئے تو شماری نے ان سے ایک بکری خریدی اور ان مویشیوں کے لئے ایک چھپر بنوا دیا۔ اس کی گائے دو اڑھائی سیر دودھ روزانہ دیتی جو آٹھ سے دس روپے تک میں فروخت ہو جاتا۔ وہ ارد گرد کے گھروں میں خود جا کر دودھ دے آتی۔ اب وہ بہت خوش تھی۔

ایک شام رمضان شماری کے ہاں گیا اور کہا کہ وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے۔ پہلے چند لمحوں تک تو شماری جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر اس کے اندر بیتے ہوئے برسوں کے سارے دکھ، سارا کرب، محرومیاں، ذلتیں اور پچھتاوے طوفان برپا کرنے لگے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کافی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر شماری نے خود کو سنبھالا اور بولی ''محض اس وجہ سے تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی کہ تم ایسا چاہتے ہو، جب میں فاقوں مر رہی تھی، جب میرے تن کے کپڑے تار تار تھے، جب میں اور صبور بیماری سے مر رہے تھے تو کسی نے ہم کو پوچھا بھی نہ تھا۔ اور اب تم لینے آ گئے ہو...... خیر میں ایک شرط پر واپس جاؤں گی اور وہ یہ ہے کہ میرا سسر مجھے لینے کے لئے آئے۔''

رمضان گھر لوٹ گیا اور اس بات کا ذکر اپنے باپ لالو فقیر سے کیا۔ دوسرے روز فقیر گاؤں کے چوہدری معتبر حسین اور بزرگ کرامت علی کو لے کر شماری کے گھر گیا۔ ان لوگوں نے شماری کو رمضان کے گھر واپس جانے پر رضا مند کرنے کی کوشش کی۔ ان کی درخواست پر شماری کی ماں نے اس کو سسرال واپس بھیج دیا۔ وہاں رمضان اور اس کی دوسری

MashalBooks.org

بیوی شانو نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ شاری نے بھی تمام زیادتیاں بھلا کر شانو کو چھوٹی بہن کے طور پر قبول کرلیا اور ایک نئی زندگی شروع کردی۔ دو روز بعد اس نے باپ کے گھر سے اپنے مویشی بطخیں اور مرغیاں منگوالیں۔

تقریباً چار برس تک سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد شاری اپنے شوہر کے گھر واپس گئی تھی۔ ان برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ اپنے شوہر کی کمائی کی محتاج نہ رہی تھی۔ گائے کے دودھ کی آمدنی پر وہ گزارا کرسکتی تھی۔ رمضان بھی پہلے جیسا نہ رہا تھا۔ اب وہ شاری کا احترام کرتا تھا اور اس کو چاہتا بھی تھا۔ گھریلو اخراجات وہ خود برداشت کرتا اور شاری سے کچھ نہ لیتا تھا۔ مگر شاری خود کچھ نہ کچھ دے دیتی۔ اس طرح کنبے کی مدد ہو جاتی۔

شوہر کے پاس واپسی کو ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ شاری کی گائے بیمار ہوگئی۔ وہ خود اس کو جانوروں کے ہسپتال لے گئی اور علاج کروایا۔ یوں اس کے تقریباً پچاس روپے خرچ ہو گئے۔ گائے البتہ تندرست ہوگئی۔ چنانچہ شاری اب اپنے گھر میں ہنسی خوشی دن گزار رہی ہے۔ جب اس کا دوسرا قرضہ اتر جائے گا تو وہ ایک اور گائے خریدنے کے لیے مزید قرضہ لینا چاہے گی۔ اس کا خیال ہے کہ گائیں پالنا بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

رمضان کا گھر تین جھونپڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک ٹین کا شیڈ ہے، ایک بھوسے کی جھونپڑی ہے اور ایک گائے کا چھپر ہے۔ شاری ٹین کے شیڈ میں رہتی ہے، بھوسے کی جھونپڑی کے ایک حصے میں شانو رہتی ہے جب کہ دوسرے حصے میں باورچی خانہ ہے۔ رہا رمضان تو اس کا وطیرہ یہ ہے کہ ایک ہفتہ وہ شاری کے پاس رہتا ہے اور ایک ہفتہ شانو کی جھونپڑی میں بسر کرتا ہے۔ کنبے میں بچے صرف دو ہیں۔ ایک شاری کی بیٹی ہے اور دوسرا شانو کا بیٹا ہے۔ گھر کے سارے افراد مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ شاری کا زیادہ وقت مویشیوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے جب کہ شانو گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ شاری بھی اس معاملے میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

MashalBooks.org

رمضان علی بھی گرامین بنک کے پراجیکٹ کا گروپ ممبر بن چکا ہے۔ اس نے بنک سے تین ہزار روپے قرض لئے ہیں اور ایک سائیکل رکشہ خرید لیا ہے۔ رکشہ وہ خود چلاتا ہے اور قسط ادا کرنے کی خاطر دس روپے روزانہ الگ کر لیتا ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ رمضان علی کے گھر والوں کو اب باقاعدگی سے کھانا ملتا ہے۔ وہ مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔

MashalBooks.org

ماریا کا حال

برسات کے دن تھے۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ ماریا خاتون کا گھر مرسارائے بازار سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ چند روز سے اس کا بڑا بیٹا رزاق بیمار تھا۔ بخار کم کرنے کے لئے وہ رزاق کے سر پر پانی ڈال رہی تھی۔ ماریا نے ہم کو آتے دیکھا تو بچے کو چھوڑ کر ہمارے استقبال کو بڑھی۔ ہم نے اس کو بچے کی نگہداشت کے لئے کہا مگر وہ ہمارے ساتھ باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔

اپنی زندگی کا قصہ سناتے ہوئے ماریا کو خود پر قابو نہ رہا اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ ہم نے مقدور بھر دلاسہ دیا۔ آہستہ آہستہ وہ سنبھل گئی۔ پھر وہ اپنی زندگی کے واقعات سنانے لگی۔

ماریا کا باپ، تاج الدین، ضلع چٹاگانگ کے تھانہ مرسارائے کے گاؤں نذیر پورہ میں رہتا تھا۔ اس نے چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور دوبارہ بیاہ رچایا تھا۔ اس کی پہلی بیوی دوسرے بچے کی پیدائش پر فوت ہوگئی تھی۔ ایک بچی اس کی نشانی رہ گئی تھی۔ بعد میں تاج دین نے ایک اور شادی کی جس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ ماریا یہی بیٹی تھی۔ ماں باپ ماریا سے بہت پیار کرتے تھے۔ تاج الدین اچھا خاصا کھاتا پیتا شخص تھا۔ باڑے کے علاوہ اس کے پاس تقریباً پانچ ہزار مربع گز اراضی تھی۔ وہ خود کھیتی باڑی کرتا تھا اور خاصی رقم کما لیتا تھا۔ گھر کے کام کاج میں ماریا ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کو مکتب بھیجا گیا تھا، مگر وہ قرآنِ مجید پڑھنا نہ سیکھ سکی۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کی بہن کی شادی ہوئی۔ اس موقع پر پورے خاندان نے خوشیاں منائی تھیں۔

1964ء میں جب ماریا کی عمر تیرہ سال تھی، تو اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ داماد

MashalBooks.org

کے معاملے میں تاج الدین بہت محتاط تھا۔ چنانچہ اس نے خوب دیکھ بھال کر اپنے ہی علاقے کے ڈوم خیلی گاؤں کے ضمیر الدین کو ماریا کے لئے منتخب کیا۔ ضمیر الدین کلکتہ کی بندرگاہ سے تعلق رکھنے والے ایک بحری جہاز پر ملاح ہوا کرتا تھا اور تقریباً ساٹھ روپے ماہوار کمایا کرتا تھا۔ اسی بنا پر تاج الدین نے اس کو دوسرے امیدواروں پر ترجیح دی۔ باڑے کے سوا ضمیر الدین کے پاس کوئی زمین نہ تھی۔ اس کی دو بہنیں، ایک چھوٹا بھائی اور ماں تھی۔ اس کی ماں بانس کی اشیا بنایا کرتی تھی۔

باپ جس قدر جہیز دے سکتا تھا وہ اس نے ماریا کو دیا۔ جہیز کے سامان میں سونے کی انگوٹھی رضائیوں کی جوڑی، گدے، دو تکیے، المونیم کے دو برتن، دو تھالیاں، چینی کی دو تھالیاں اور تانبے کا ایک گلاس شامل تھا۔ تاج الدین یہ چیزیں آسانی سے دے سکتا تھا۔ ان سے اس پر کوئی مالی بوجھ نہ پڑا۔ ماریا کے پاس کچھ پیسے تھے اور وہ کبھی کبھار اپنے شوہر کی مدد بھی کر دیا کرتی تھی۔ اس کا رنگ قدرے سیاہی مائل تھا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے خطے میں یہ رنگ لڑکیوں اور ان کے والدین کے لیے مسئلہ بن جایا کرتا ہے۔ چنانچہ تاج الدین بھی اپنے داماد کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تاج الدین اور ماریا کی طرف سے کبھی کوتاہی ہو جاتی تو ضمیر الدین غرانے لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ ماریا کو پیٹ بھی دیتا تھا۔ نئے گھر میں ماریا کا زیادہ وقت کھانے پکانے میں صرف ہوتا تھا۔ ساس بانس کی چیزیں بناتی رہتی تھی۔ خدا جانے کیوں ماریا اس کو پسند نہ آئی تھی۔ اس کے ہر کام میں کیڑے ڈالتی۔ وجہ بے وجہ اس کو کوستی تھی۔ ضمیر الدین کلکتہ سے آتا تو وہ بھی ماں کے ساتھ مل جاتا۔ یہاں تک کہ وہ مار پیٹ سے بھی گریز نہ کرتا۔ ایک بار تو اس نے ماریا کو اتنا مارا کہ نشان پڑ گئے۔ ماریا کے باپ کو اطلاع ہوئی وہ غریب بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے ڈاکٹر اور دوا دارو کا بندوبست بھی کیا۔ ماریا اس واقعہ کی تلخ یادیں آج تک نہیں بھلا سکی۔ وہ دن ایسے تھے کہ جب ضمیر الدین نوکری پر واپس چلا جاتا تو اس کی ماں اور بہن تڑپانے کو موجود ہوتیں۔ کئی کئی دن تک ماریا کو بھوکا رکھا جاتا۔ جب کبھی اس کا باپ ملنے کے لئے آتا تو وہ ماریا کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھ دیتیں۔ بے چارہ باپ کیا کرتا۔ وہ بھی اپنی بیٹی کو ہی کوستا۔ خانگی زندگی کے کئی برس اسی طرح بیت گئے۔ وہ خاموشی سے جور و ستم سہتی رہی۔ جب ضمیر الدین کوئی رقم نہ بھیجتا تو اس کے مصائب اور بھی بڑھ جاتے۔ کیونکہ پھر اس کو زندہ رہنے کی خاطر ساس کی آمدنی کا محتاج ہونا

پڑتا تھا، کئی بار یوں بھی ہوا کہ وہ کھانا تیار کرتی تو سسرال والے بیٹھ کر چٹ کر جاتے اور اس کو بھوکا رہنا پڑتا۔ بار ہا اس نے کھیتوں سے پتے توڑ کر ابالے اور ان سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

ماریا کا روگ صرف یہ نہ تھا کہ اس کا خاوند اور سسرال عزیز اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے، بلکہ دکھ اور بھی تھے۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا اور وہ چند روز بعد ہی مر گیا تھا۔ ساس نے اس کی ذمہ داری بھی بہو پر ڈالی اور پہلے سے بھی زیادہ برا سلوک کرنے لگی۔ ان ایام میں ضمیر الدین ملازمت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کی ماں کو اور بھی زیادہ کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

وہ ماریا کو روزانہ روٹی کا بس ایک ٹکڑا دینے لگی۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس کی صحت جواب دے گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعد میں بھی اس کو ماں بننے میں دشواری پیش آتی رہی۔ ہوتا یہ کہ اس کا بچہ مردہ پیدا ہوتا یا پھر پیدائش کے چند روز بعد مر جاتا۔

رزاق البتہ بچ گیا۔ اس کی پیدائش کے وقت ماریا اپنی ماں کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ ماں نے اس کی خوب دیکھ بھال کی۔ مگر رزاق کی پیدائش کے فوراً بعد ماریا قلت خون کے مرض انیمیا کی شکار ہوگئی۔ ماں ممکنہ حد تک اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ سسرال والوں سے کوئی بھی اس کو دیکھنے نہ آیا۔ خیر، ماریا نے بتایا کہ بعد کے بچے بھی اسی طرح پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کے وقت وہ ماں کے پاس آجایا کرتی تھی۔ مگر اس کی ساس کبھی بھی بچوں کو دیکھنے نہ آتی تھی۔ ماریا کی ماں نے بھی سخت محرومی اور مصائب کی زندگی بسر کی تھی۔ ماریا کا باپ ان بچوں کی پیدائش تک زندہ تھا۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور خاموش پڑا رہتا تھا۔

ماریا کے باپ تاج الدین، کی پہلی بیوی نے دو بیٹیوں کو جنم دیا تھا جن میں سے ایک پیدائش کے چند روز بعد ہی فوت ہوگئی تھی۔ اس سے کوئی بیٹا نہ تھا اور تاج الدین اس بات پر مغموم رہا کرتا تھا۔ اس کو اس بات کا گہرا رنج تھا کہ اس کا کوئی وارث نہیں۔ خاندانی ضروریات کے پیش نظر وہ اپنی زمین کا لگ بھگ چوتھا حصہ فروخت کر چکا تھا۔ اس کے بھانجے اس کا بہت خیال رکھا کرتے تھے او اس کو اکثر اپنے گھر کھانے پر بلایا کرتے تھے۔ وہ جب بھی بھائیوں کے گھر جاتا، وہ بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے۔ یہاں تک

انہوں نے ماموں کو بہلا پھسلا کر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی اراضی بھائیوں کے نام منتقل کر دے۔ بھائیوں نے وعدہ کیا کہ اس کے بدلے وہ ساری عمر ماموں اور اس کے گھر والوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔

تاج الدین جب اپنی اراضی بھائیوں کے سپرد کر چکا تو اس کی دوسری بیوی نے دو بیٹوں، شمس الحق اور عالمگیر کو جنم دیا۔ تاج الدین کے پلے اب سوائے باڑے کے کچھ نہ رہا تھا۔۔ بھانجے نذر الاسلام نے اسی اثنا میں تاج الدین کے کنبے کے اخراجات پورے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بجائے وہ دعویٰ کرنے لگا کہ ماموں نے اپنی مرضی سے اس کو زمین کا تحفہ دیا تھا۔

ماریا کا باپ سادہ لوح آدمی تھا۔ کلکتہ کی بندرگاہ میں اس کو ایک بار ملازمت مل گئی تھی مگر وہ چھوڑ کر گھر چلا آیا تھا۔ بھائیوں نے جب اس کے کنبے کی کفالت سے انکار کیا تو محنت مزدوری کرنے لگا۔ پہاڑیوں سے وہ جلانے کی لکڑیاں اکٹھی کرتا اور ان کو بیچ کر روزی حاصل کرتا۔ یوں اس کی آمدنی بہت قلیل تھی اور گھر میں غربت اور محرومی کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔

اسی دوران میں ماریا رفتہ رفتہ تندرست ہونے لگی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے شیر خوار بچے کو سسرال لے کر لوٹ گئی۔ مگر سسرال والے بچے کی خوراک کی پرواہ بھی نہ کرتے تھے اور وہ صرف ماں کے دودھ پر گزارا کرتا تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی ان لوگوں کا وطیرہ نہ بدلا تھا۔

1966ء میں ماریا کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے دو سال بعد ماریا کے بھائی شمس الحق کی شادی ہوئی۔ یہ شادی والدہ نے طے کی تھی۔ لیکن بہو گھر میں آئی تو ساس کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگی۔ ماریا کی ماں یہ بات برداشت نہ کر سکی اور اپنی موت سے ٹھیک ایک سال پہلے وہ بیٹے سے الگ ہو گئی۔ بڑھاپے میں اب اس کا کوئی سہارا نہ رہا تھا اور اس کو فاقوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی اس نے بھیک مانگ کر گزارا کرنے سے گریز کیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک ساہوکار عورت سے سولہ سیر چاولوں کے سود پر سو روپے حاصل کیے اور اس رقم سے روز مرہ استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر ارد گرد کے دیہات میں پھیری لگانے لگی۔ اس کی وفات 1970ء میں ہوئی۔

ماریا کی ماں اور بھائی جب الگ ہوئے تھے تو ماریا کی پھوپھی زاد بہن نے بوڑھی عورت کو اپنے ہاں رہنے کی دعوت دی تھی۔ ماریا وہاں اپنی ماں سے ملنے جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی اس عزیزہ کو شوہر کی مار سے پڑنے والے نشانات دکھائے۔ اس پر اس عورت نے اور اس کے کنبے کے دوسرے افراد نے ماریا کو مشورہ دیا کہ وہ ضمیرالدین سے الگ ہو جائے۔ ماریا فی الحال یہ قدم اٹھانے پر تیار نہ تھی۔

چند ماہ بعد بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ شروع ہوگئی۔ تقریباً ایک سال تک جاری رہنے والی اس جنگ کے بعد ماریا شوہر کو ساتھ لے کر اپنی اس پھوپھی زاد کے پاس آگئی۔ ضمیرالدین نے وہاں گھر بنا لیا۔ ملازمت وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا اور اب روزانہ اجرت پر مزدوری کرنے لگا تھا۔ تاہم بیوی کو پیٹنے کی عادت اس نے نہ چھوڑی تھی۔ ماریا کی پھوپھی زاد اور دوسرے لوگ خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ کئی سال گزر گئے مگر ضمیرالدین کا چلن نہ بدلا۔ ماریا ان سے تنگ آ چکی تھی۔ چنانچہ مایوس ہوکر اس نے ضمیرالدین سے الگ ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یوں گاؤں کے بزرگوں کی مداخلت سے دونوں میں طلاق ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد ماریا نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ اب وہ بڑا تکیہ میں رہتی ہے۔

طلاق 1974ء میں ہوئی تھی۔ ماریا کو اب اپنے علاوہ تین بچوں کا بوجھ بھی اٹھانا تھا۔ بچے بہت چھوٹے تھے اور محنت مزدوری کر کے کچھ کمانے کے قابل نہ تھے۔ ماریا خود بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ پھر بھی روزی کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ڈھونڈنا ہی تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کو کوئی ملازمت دینے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا۔ یوں بالآخر بھکارن بن گئی۔

ماریا مرسارائے تھانے کے دیہات میں خوشحال لوگوں کے گھروں کے چکر لگاتی اور بھیک مانگتی۔ سارے دن کی اس مشقت سے اس کو تھوڑے بہت چاول مل جاتے جو کنبے کی ضرورت پوری نہ کر سکتے۔ اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے علاوہ اب ایک چھوٹے بھائی کی ذمے داری بھی اس کے ناتوان کندھوں پر آ گئی تھی۔ ماریا کو اپنے اس بھائی سے بہت محبت تھی او وہ اس کو پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ گاؤں کے لوگ عام طور پر ماریا کو اچھا سمجھتے تھے اور گاؤں کے بزرگ کبھی کبھار اس کی مدد کرنے لگے تھے۔ عید کا تہوار آتا تو گاؤں کے لوگ اس کو خیرات اور فطرانہ دیتے۔

بھیک مانگتے مانگتے ایک روز ماریا کی ملاقات ایک عورت سے ہوگئی جو بانس کی ٹوکریاں اور دوسری چیزیں بنایا کرتی تھی۔ ماریا نے اس سے خیرات مانگی،مگر اس عورت نے کہا کہ وہ پہلے یہ بتائے کہ اس نے کتنے چاول اکٹھے کئے ہیں۔ اس روز ماریا کو چاولوں کی خیرات بہت کم ملی تھی۔ یوں اس عورت کو بہت ترس آیا۔ وہ ماریا سے پوچھنے لگی کہ اتنے کم چاولوں سے وہ پانچ افراد کا پیٹ کیسے بھرے گی۔ ماریا نے جواب دیا۔''میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔شاید خدا کبھی ہم لوگوں کی بھی سن لے گا۔''

ماریا کی بات سے وہ عورت مطمئن نہ ہوئی۔اس نے کہا''تم بھیک مانگنا چھوڑ دو۔ اس کے بجائے میری بنائی ہوئی چیزیں بازار میں بیچا کرو۔ اس طرح تمہیں روزی مل جایا کرے گی۔'' ماریا کو معلوم تھا کہ اس قسم کے کام کے لیے تھوڑے بہت سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے پلے کچھ نہ تھا۔لیکن اس عورت نے ماریا کو پندرہ روپے قرض کے طور پر دے دیئے۔ ان روپوں سے اس نے اسی عورت کی بنائی ہوئی بانس کی چیزیں خریدیں اور پھر اس دستکار عورت کے مشورے کے مطابق ان کو بیچنے روانہ ہوگئی۔ ماریا کو اس پہلی کوشش میں دس روپے کا منافع ہوا۔ اگلے ہفتے کے روز ماریا اس دستکار عورت کے پاس گئی اور اس کے پندرہ روپے واپس کر دیئے۔منافع کی رقم سے اس نے چار روپے کے ایک سیر چاول لئے اور نمک مرچ اور دوسری ضروری گھریلو اشیا خریدیں۔

ضمیرالدین کے ساتھ شادی کے بعد سے ماریا دکھ بھری زندگی بسر کرتی چلی آئی تھی۔ شوہر کی مار پیٹ، تکلیف دہ حمل اور پھر بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ، جس کے دوران اس کو بہت سی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، ان سب باتوں نے ماریا پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ جنگ کے دنوں میں فوج نے اس کا گھر جلا دیا تھا اور یوں ماریا کو پہاڑیوں میں چھپ کر جان بچانی پڑی تھی۔ کئی مہینوں تک وہ اسی علاقے میں رہی تھی۔ضمیرالدین جب محنت مزدوری کی تلاش میں جایا کرتا تھا تو اس کو واپسی میں دیر ہو جایا کرتی تھی۔ اس دوران ماریا اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ تنہا پہاڑوں میں رہتی اور زندگی کی سختیاں برداشت کرتی تھی۔

1974ء کے قحط نے اس غریب پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیئے تھے۔ روٹی کے چھوٹے موٹے ٹکڑے کے سوا اس کو کسی شے کی امید نہ ہوتی تھی۔ کئی کئی دن اس کے خاندان

کا گزارا اس طرح ہوتا کہ وہ پانی میں آٹا گھول کر کھاتے۔ کئی بار ان لوگوں کو فاقے کرنے پڑتے تھے۔1978ء میں ایک اور بلا طوفان کی صورت میں نازل ہوئی جس نے اس کا گھر تباہ کر ڈالا۔ ماریا اس وقت گھر کے اندر موجود تھی۔ تاہم وہ کسی چوٹ سے محفوظ رہی۔

یہ بلا ٹلی تو1980ء میں دریاؤں کے پانی بھر گئے۔ ایک بڑا سیلاب آیا جس نے چاروں طرف تباہی مچا دی۔ لوگ بدحال ہو گئے۔ کھانے کو کچھ رہا اور نہ ہی محنت مزدوری کا کوئی وسیلہ بچا۔

اس تباہی سے پہلے،1979ء کے اواخر میں، ماریا کا گرامین بنک سے تعلق بن گیا تھا۔ اس نے بنک سے پانچ سو روپے کا قرضہ لیا تھا۔ ماریا نے اس رقم سے بانس کی بنی ہوئی مختلف اشیاء گردو پیش کے دیہات میں فروخت کرنے کے لئے خریدی تھیں۔ مگر اس کو منافع بہت کم رہا تھا۔ یوں قرضے کی اقساط واپس کرنے میں اس کو کڑی دشواریاں پیش آئی تھیں۔

گرامین بنک سے امداد حاصل کرنے سے پہلے ماریا نے اس بنک کے بارے میں خوف زدہ کرنے والی بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ لوگوں نے اس کو ڈرایا تھا کہ اگر وہ قرض لے کر واپس نہ کر سکی تو پھر پولیس اس کو گرفتار کرنے آجائے گی اور اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوئی تو پولیس اس کے بچوں کو پکڑ کر لے جائے گی۔ اور ان کو جیل میں بند کر دے گی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ بنک اصل میں حکومت نے لوگوں کی پکڑ دھکڑ کے لئے بنایا ہوا ہے۔ وہ بنک سے قرض لے گی تو اس کا نام اس فہرست میں درج ہو جائے گا جو حکومت گداگروں کو ختم کرنے کے لئے بنا رہی ہے۔ چنانچہ گرامین بنک تو غریبوں اور محتاجوں کو ختم کرنے اور ٹھکانے لگانے کا بہانہ ہے۔ یہ اور ایسی کئی دوسری کہانیاں پورے علاقے میں گردش کر رہی تھیں۔ مگر ماریا نے ان کو کوئی وقعت نہ دی اور بنک سے تعلق جوڑنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

بنک کا ذکر ماریا نے گاؤں کے بزرگوں سے سنا تھا۔ وہ خود کہتی ہے کہ ''ان لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بنک کے افراد سے ملوں اور ان کے ساتھ اپنے مسئلے پر گفتگو کروں۔ لیکن میں بنک کے کسی ملازم کو نہ جانتی تھی۔ چنانچہ ایک دوست کے ساتھ میں اس علاقے کے بے کسان افراد کی سوسائٹی کے صدر عمر کے پاس گئی۔ عمر نے ہم کو گرامین بنک کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یوں بنک میں ہماری دلچسپی شروع ہو گئی۔ عمر نے بنک کے فیلڈ مینجر سے ہمارا ذکر کیا جو چند روز بعد ہمیں ملنے آیا اور اس نے ہمیں بنک کے قواعد وضوابط سے آگاہ

MashalBooks.org

کیا۔ ماریا کے بقول پھر اس نے اپنا گروپ بنانے اور قرضے کے لئے درخواست دینے کا ارادہ کر لیا۔ شروع میں علاقے کی دس عورتوں نے گروپ بنانے میں دلچسپی ظاہر کی۔ تاہم آخر کار ان میں سے پانچ ہی رکن بنیں۔ یہ اس گاؤں کا پہلا گروپ تھا اور ماریا اس کی سیکرٹری بن گئی تھی۔

ہم نے اس گرامین بنک کے گروپ اور سنٹر کے قواعد وضوابط کے بارے میں پوچھا تو اگرچہ بعض باتیں اس کو یاد نہ رہی تھیں، مگر گروپ اور سنٹر کے بارے میں اس کے خیالات بالکل واضح تھے۔ گروپ سازی میں اس کو کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ گروپ بننے کے لگ بھگ ایک مہینہ بعد اسے اور گروپ کی ایک اور رکن محرم بی بی کو قرضے مل گئے تھے۔

قرضہ ملنے سے پہلے ماریا بازار میں بانس کی بنی ہوئی اشیا فروخت کر کے روزی کما رہی تھی۔ یہ چیزیں وہ ایک مہربان عورت سے ادھار پر حاصل کرتی تھی۔ بعد میں جب ادھار اشیا ملنی بند ہو گئیں تو ماریا ایک بار پھر گداگری پر مجبور ہو گئی۔ مگر اس کاروبار میں اس کی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر کہیں سے پیسے ہاتھ آ جائیں تو وہ دوبارہ یہی کام شروع کر دے گی۔ گرامین بنک کے سہارے اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ اس نے پانچ سو روپے کے قرضے کے لئے درخواست دی تھی۔ جب یہ رقم مل گئی تو اس نے ایک بار پھر یہی کاروبار شروع کر دیا۔

ماریا نے پانچ سو روپے اس لئے چاہے تھے کہ دکاندار پیشگی ادائیگی کا تقاضہ کر رہے تھے۔ خیر، پیسے تو مل گئے، مگر ماریا کے تمام مسئلے حل نہ ہو سکے۔ لوگ اب بھی اس کو بنک کے بارے میں من گھڑت قصے سنا کر ڈرا رہے تھے۔ وہ ماریا سے کہتے کہ بنک سے تم نے رقم تو لے لی ہے لیکن واپس کیسے کرو گی۔ یہ بنک والے تو بڑے ظالم لوگ ہیں۔ تمہیں کچا ہی چبا جائیں گے۔" بہر حال ماریا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اپنے کام میں مگن رہی۔ اس نے تھوک کے ایک بیوپاری کو دوسو روپے پیشگی ادا کر کے تقریباً ستر روپے کی چیزیں خرید لیں۔ واپسی پر وہ روزمرہ استعمال کی ایسی چیزیں بھی لیتی آئی جن کی گاؤں میں مانگ تھی۔

ہر ہفتے اور منگل کے روز ماریا تھوک کی دکان سے چیزیں خریدتی ہے اور باقی دنوں میں ارد گرد کے دیہات میں پھیری لگا کر فروخت کرتی ہے۔ دھان کی کٹائی کے دنوں میں کسانوں کے پاس نسبتاً زیادہ پیسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ماریا کا منافع بھی بڑھ جاتا ہے چنانچہ وہ

کہتی ہے کہ بسا اوقات سو روپے کی چیزیں پر وہ سو ڈیڑھ سو روپے بھی منافع حاصل کر لیتی ہے۔ باقی دنوں میں اس کا منافع بیس بائیس روپے تک ہی رہتا ہے۔ برسات کے مہینوں میں کمائی بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ دو سو روپے کی چیزیں بیچ کر بھی اس کے ہاتھ دس گیارہ روپے ہی لگتے ہیں اور کبھی کبھی ان سے بھی محروم رہنا پڑتا ہے۔ گویا معاملہ یوں ہے کہ کٹائی کے ایک مہینے میں ماریا کو اچھا منافع مل جاتا ہے جب کہ باقی مہینوں میں اس کا منافع اوسطاً پندرہ روپے یومیہ ہوتا ہے۔

چیزیں خریدنے کے لئے ماریا قریبی قصبے میں جاتی ہے۔ لہٰذا اس کو آنے جانے کے لئے ریل کا ٹکٹ بھی خریدنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی جب ٹرین پر جانچ پڑتال سخت ہو جاتی ہے تو ماریا کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ ریلوے کے قواعد کے مطابق مسافروں کے ڈبے میں بانس کی اشیا لانے کی اجازت نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس صورت میں ماریا کو گھاٹا بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ماریا کو چار افراد کے پیٹ کی آگ بجھانا ہوتی ہے۔ اس کو ڈیڑھ سیر چاول روزانہ درکار ہوتے ہیں، ان کی قیمت آٹھ روپے بنتی ہے۔ جب کہ نمک مرچ، خورنی تیل اور مٹی کے تیل کے لیے بھی اس کو تین روپے درکار رہوتے ہیں، گویا اس کے روزانہ اخراجات گیارہ روپے کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔

بیٹا اور بھائی ماریا کی مشقت میں شریک ہو سکتے ہیں، مگر وہ تنہا ہی کام کرنا پسند کرتی ہے۔ ویسے بھی وہ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے جائے تو اس کے لئے بھی ریل کا ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔ یوں اس کا منافع کم ہو جائے گا۔ اس لئے وہ کسی کو ساتھ نہیں لے جاتی اور سارا بوجھ خود ہی اٹھاتی ہے۔

جہاں تک قرضے کی واپسی کا تعلق ہے، ماریا کی کارکردگی قابل تعریف رہی ہے۔ وہ پانچ سو روپے کا پہلا قرض مکمل طور پر اتار چکی ہے۔ اس کی ہر قسط دس روپے کی تھی، مگر اس نے واپسی میں ایک بار بھی کوتاہی نہیں کی۔ پانچ سو روپے کی علاوہ اس نے 38 روپے سود اور 19 روپے کا ہنگامی فنڈ بھی ادا کیا ہے۔

ماریا آج کل پندرہ سو روپے کا دوسرا قرضہ اتار رہی ہے۔ اب تک اس سے دو قسطوں کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی ہے۔ (اس کی موجودہ قسط تیس روپے ہفتہ ہے) کبھی کبھی

وہ تیس روپے کا انتظام نہیں کر سکتی تو بیس روپے ہی جمع کروا دیتی ہے۔ اس کے گروپ کی دیگر ارکان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ گروپ کے اجلاسوں کے معاملے میں ماریا بہت باقاعدہ ہے۔ پہلے یہ اجلاس ہر جمعے کے روز ہوا کرتے تھے۔ اور ہر مہینے ماریا ایک اجلاس سے غیر حاضر رہا کرتی تھی۔ اب یہ اجلاس ہر جمعرات کو صبح سات بجے ہوتے ہیں اور ماریا کو ان میں شرکت کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مجموعی طور پر وہ صرف پانچ اجلاسوں سے غیر حاضر رہی ہے۔

ماریا نے ہم کو بتایا کہ پہلا قرض ادا کرنے پر اس کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اس کامیابی پر اس کو ناز تھا۔ جب اس نے دوسرا قرضہ لیا تو اس کے پاس پہلے قرضے سے شروع کئے جانے والے کاروبار سے ساڑھے چار سو روپے کی بچت ہو چکی تھی۔ بعدازاں اس نے یہ رقم اپنے کنبے کی ضرورتیں پوری کرنے پر خرچ کر دی۔

دوسرا قرضہ ماریا کو 25 دسمبر 1980ء کو ملا۔ وہ یہ رقم بانس کی بنی ہوئی اشیا کے کاروبار میں لگانا چاہتی تھی۔ چنانچہ قرضہ ملنے پر اس نے یہی کام کیا۔

زمین داروں کو یومیہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ مگر اب مزدور پہلے سے زیادہ منظم ہو چکے ہیں وہ گرامین بنک سے قرض لیتے ہیں اور انہوں نے اپنے کئی کام شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اب وہ پہلے جیسی بڑی تعداد میں دستیاب نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں یومیہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی کمی ہو گئی ہے اور جو وہ زیادہ اجرت طلب کرنے لگے ہیں۔

ماریا کا بیٹا اور بھائی دونوں یومیہ اجرت پر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ بعض زمین دار گرامین بنک سے خوش نہیں اور ساہوکار بھی اس کے مخالف ہیں کیونکہ اس بنک کی وجہ سے ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے۔ گرامین بنک نے بہت سے بے زمین افراد کو رکشے خریدنے کے لئے بھی امداد دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غریب لوگ اپنے رکشے خرید کر چلانے لگے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ بھی بنک سے خوش نہیں رہے۔ جنہوں نے رکشے خرید رکھے تھے اور کرائے پر دوسروں کو دیا کرتے تھے۔

خیر، ہم ماریا کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس کا اپنا کوئی باڑہ ہے اور نہ ہی زمین۔ وہ اپنے ایک عزیز کی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ اس کے گھر میں فرنیچر کی چند ایک چیزیں ہی

MashalBooks.org

ہیں۔ وہ عام طور پر روٹی کھاتی ہے، کیونکہ چاول سے سستی ہوتی ہے۔ تاہم وہ چاول بھی استعمال کرتی ہے۔عموماً وہ دن میں ایک کھانا کھاتی ہے، اس طرح اس کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں۔ کنبے کا ہر رکن ایک دو روٹیاں ہی کھاتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔

کاروبار سے ماریا کو جو منافع ہوا ہے، اس سے اس نے چند گھریلو چیزیں اور کپڑے وغیرہ خریدے ہیں۔جھونپڑی کی چھت کی مرمت کے لئے اس نے دوسو روپے کا سامان خریدا ہے۔ مرمت کا یہ کام ایک مزدور نے کیا تھا جس کو ماریا نے اجرت ادا کی۔

ماریا سے ہم نے اس کے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں دریافت کیا تو وہ پر اعتماد لہجے میں کہنے لگی کہ دوسرا قرضہ اتارنے کے بعد وہ ایک اور قرضے کے لئے درخواست دے گی۔ تیسرے قرضے کی رقم وہ دھان کی صفائی کے کام میں لگانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بات یہ ہے کہ پہلے قرضے کی ادائیگی سے اس میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ اب وہ نئے خواب دیکھ رہی ہے اور ان کی تکمیل کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔

ماریا کا بیٹا رزاق پندرہ برس کا ہو چکا ہے۔ مگر وہ بہت کمزور دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اس کو مزدور نہیں رکھتے اور رکھیں تو نصف اجرت پر ٹرخا دیتے ہیں۔ ماریا کا کہنا ہے کہ وہ کمزور ہے اس لئے لوگ اس کو کام نہیں دیتے۔ گزشتہ ایک ماہ سے وہ محض بیکار ہے۔

جہانگیر ماریا کے بھائی کا نام ہے اور وہ اچھا خاصا صحت مند ہے۔ وہ تقریباً بیس روپے روزانہ کما لیتا ہے۔ اپنی خوراک کا خرچ وہ خود برداشت کرتا ہے۔ البتہ پکاتی ماریا ہے۔ اکثر اوقات وہ اپنے مالک کے گھر پر ہی کھانا کھاتا ہے۔ جب اس کو مزدوری نہ ملے تو وہ ایندھن اکٹھا کرنے کے لئے پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ لکڑیاں چن کر وہ بنڈل بناتا ہے اور بنڈل دس پندرہ روپے میں بک جاتا ہے۔ بارش کے دنوں میں البتہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ برسات میں دوسرا کام بھی عموماً ٹھپ ہو جاتا ہے اور پھر جہانگیر کو ماریا پر ہی اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کو کھانا دیتی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ جہانگیر سے اس کو بیٹے جیسی محبت ہے۔

MashalBooks.org

جمنا کے انداز

جمنا خاتون 1947ء کے لگ بھگ چٹا گانگ ضلع کے میر سرائے تھانہ کے علاقہ کے کرکا نامی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا نام عبدالقادر تھا۔ اس کا دادا زیادہ خوش حال آدمی نہ تھا۔ جو تھوڑی بہت زرعی جائیداد اس کے پاس تھی وہ اس نے موت سے کچھ عرصے پہلے فروخت کر دی تھی۔ یوں اس کے کنبے کے پاس صرف باڑہ ہی رہ گیا تھا۔ عبدالقادر اور اس کے دونوں بھائی، غازی میاں اور باچو میاں، محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے تھے۔ قادر کی قلیل آمدنی میں خاندان کا گزارہ بہت مشکل سے ہوا کرتا تھا۔

قادر نے 1941ء میں شادی کی تھی۔ دو سال بعد اس کے ہاں پہلی بچی، جمنا کی بڑی بہن، پیدا ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد قادر کا باپ فوت ہو گیا تو اس کی دو بہنوں نے جائیداد میں سے اپنا حصہ قادر کو فروخت کرنا چاہا۔ مگر اس کی جیب خالی تھی۔ جمنا کی ماں ذہین عورت تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر دونوں نندوں نے اپنا حصہ بیچ ڈالا تو جو معمولی زرعی زمین خاندان کے پاس ہے، وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کے پاس ایک گائے تھی۔ گائے بیچ کر اس نے قادر کی بہنوں کو رقم دے دی۔ یوں تقریباً تین مرلے زمین قادر کے خاندان کے پاس رہ گئی۔

عبدالقادر کے نو بچے تھے، جن میں سے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ پانچوں بیٹے تین چار سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ چار بیٹیاں البتہ بچ گئیں۔ جمنا ان میں سے تیسرے نمبر پر ہے۔ اس کی بہن امیہ خاتون کی شادی میرا سرائے تھانہ کے جنوبی مگدیہ گاؤں کے ایک شخص سے ہوئی تھی۔ اس کو کوئی جہیز نہ دیا گیا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جہیز کا زیادہ رواج نہ تھا۔ دوسری بیٹی زرینہ امیہ سے دو سال چھوٹی ہے۔ اس کی

شادی اسی علاقہ کے گاؤں ملنگا کے ایک شخص سے ہوئی۔ بالی سب سے چھوٹی ہے۔ وہ جمنا سے تین سال چھوٹی ہے۔ وہ اپنے ہی گاؤں میں بیاہی گئی تھی۔

بچپن میں جمنا کو گھر کا کام کاج نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی ماں اور بہن ہی سارے کام کیا کرتی تھیں۔ جمنا قرآن مجید پڑھنے کے لئے ہر روز مکتب جانے لگی تھی۔

جمنا کا بچپن محرومیوں میں بسر ہوا تھا۔ اس کا باپ کنبے کے چھ افراد کا واحد کفیل تھا۔ اس کی ماں کے رشتہ دار نسبتاً خوش حال تھے، مگر انہوں نے ان لوگوں کی کبھی مدد نہیں کی تھی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد قادر کو جو اجرت ملتی، وہ چھ افراد کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی نہ ہوتی۔ یوں ان لوگوں کو نیم فاقے کا شکار رہنا پڑتا تھا۔ ایسے دن بھی آجاتے، جب انہیں کھانے کے لئے کچھ نہ ملتا۔ جمنا کے والدین آپس میں اکثر لڑتے جھگڑتے رہا کرتے تھے۔ اس کی ماں نہ تو خود گھر سے باہر کوئی کام کرنے پر تیار تھی اور نہ کسی بیٹی کو مزدوری کے لئے جانے کی اجازت دیتی تھی۔ یوں پورے خاندان کو صرف قادر پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ عید تہوار کے موقع پر بھی ان لوگوں کو اچھی خوراک یا لباس میسر نہ آتا تھا۔

جمنا نے جوانی میں پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی دونوں بڑی بہنوں کی شادی ہو گئی۔ خود جمنا سروقد، پتلی دبلی خوبصورت دوشیزہ کے روپ میں جوان ہوئی۔ مگر وہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی۔ زندگی میں کوئی اچھی چیز اس کو حاصل نہ تھی۔ بچپن میں وہ پھٹے پرانے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنا کرتی تھی۔ جوان ہوکر وہ ماں یا بڑی بہن کے کپڑے پہننے لگی۔ جب کبھی وہ پڑوسیوں کے ہاں جاتی تو کئی نگاہوں کا مرکز بن جاتی۔

جمنا کے پڑوسیوں میں سے ایک تارکل تھا جو گوبانیہ گاؤں کے رہنے والے کالو حسین کا برادر نسبتی تھا۔ کالو اکثر اس کے گھر آیا کرتا تھا اور کبھی کبھی اس کا سامنا جمنا سے ہو جاتا۔ کئی بار تارکل نے کالو کو جمنا کے خاندان اور گھر بار کے بارے میں سب کچھ بتایا اور کالو نے جمنا سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پر تارکل نے کالو کے باپ سے اس بات کا ذکر کیا اور رضامند ہوگیا۔ یوں بات چل نکلی۔ کالو کی طرف سے تارکل اور جمنا کے خاندان کی طرف سے عزیز الرحمان نامی ایک شخص تقریباً ایک ماہ تک اس معاملے کی تفصیلات طے کرتے رہے آخر کار شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔

MashalBooks.org

مذاکرات کے ایک ماہ کے عرصے میں دونوں خاندانوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے گھر نہیں گیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ شادی کے جملہ اخراجات لڑکے کا خاندان برداشت کرے گا۔ کالو کا باپ اس شادی میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ بالآخر 1961ء میں شادی ہوگئی ۔اس وقت دلہن کی عمر چودہ سال تھی۔ برات بہت مختصر تھی۔صرف آٹھ افراد جمنا کو بیاہنے آئے تھے۔ جمنا کے سسر نے شادی کے اخراجات کے طور پر ساٹھ روپے ادا کئے۔ اس نے بہو کو سونے کے کانٹے دیئے جن کی مالیت 180 روپے تھی۔ علاوہ ازیں ایک ہار، ایک لاکٹ اور دو تعویذ بھی اس کو دیئے گئے۔ چاندی کی چوڑیاں بھی جمنا کو پہنائی گئیں۔

جمنا کا دولہا یومیہ اجرت پر مزدوری کرتا تھا۔ اس کا سسر بھی کوئی کھاتا پیتا شخص نہ تھا۔ سوائے باڑے کے اس کے پاس کوئی زرعی جائیداد نہ تھی۔ کالو کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ان کا دادا مرنے سے پہلے اپنی ساری زمین فروخت کر گیا تھا۔ اس لئے گزارے کے لیے پانچوں بھائی بہنوں نے کو دوسروں کے لیے محنت و مشقت کرنی پڑتی تھی۔ حال ہی میں البتہ اس کنبے کے حالات قدرے بہتر ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے شراکت پر دوسروں کی زمین پر کھیتی باڑی شروع کی ہے۔ یوں ان کی آمدنی پہلے سے بڑھ گئی ہے اور ان کی زندگی کسی قدر آسان ہوگئی ہے۔ کالو کا معاملہ البتہ مختلف ہے وجہ یہ ہے کہ وہ عام طور پر بیمار رہتا ہے اور اس کا اپنا کنبہ بھی بڑھ گیا ہے۔ بیوی کے علاوہ اب چار بچے بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہو گئے ہیں۔ جمنا کی شادی کے وقت کالو اور اس کے بہن بھائی سب مل کر رہا کرتے تھے اور وہ سب جمنا کو بہت چاہتے تھے۔ کالو کا باپ تو اس کا بہت ہی خیال رکھتا تھا اور کالو کے دونوں چھوٹے بھائی اس کو سگی بہن کی طرح سمجھتے تھے۔ شادی کے بعد دو سال تک جمنا ان سب کے ساتھ رہی۔ پھر ستمبر 1963ء میں خاندان میں بٹوارہ ہو گیا۔ کالو اور جمنا الگ سے رہنے لگے۔ ان دنوں ان کی پہلی بیٹی صرف تین ماہ کی تھی۔

بٹوارے سے پہلے جمنا گھر کے کام کاج اور کھانے پکانے میں اپنی ساس کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ گھر کے سبھی افراد اس کی کارکردگی سے مطمئن تھے اور کبھی کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ کالو شروع ہی سے خاصا کاہل تھا اور شادی کے بعد بھی اس کی کاہلی قائم رہی۔ جب اس کا جی چاہتا کام پر جاتا، وگرنہ گھر میں ہی بیٹھا رہتا۔ وہ اپنی آمدنی کا حساب دینا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اس بات پر اکثر بھائیوں کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوجایا کرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے

ان کے باپ نے بیٹوں کو الگ الگ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اس کا فیصلہ منصفانہ نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس نے کالو کو الگ کیا اس کو کچھ بھی نہ دیا۔ یہاں تک کہ کالو کے پاس ایک وقت کے کھانے کے پیسے بھی نہ تھے۔

کالو کے خاندان کے بٹوارے کا سن کر جمنا کی ماں بیٹی کے پاس آئی۔ اس نے بیٹی اور داماد کی تھوڑی بہت مدد کی۔ اس نے چند ضروری برتن، رضائیاں اور کھانے پینے کی اشیاء ان کو دیں۔

علیحدگی کے وقت جمنا کی جو بیٹی تین ماہ کی تھی، وہ اب اٹھارہ برس کی ہے۔ اس کا نام کلثوم خاتون ہے۔ وہ خوبرو اور صحت مند ہے، قد البتہ اس کا چھوٹا ہے۔ کلثوم، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اپنے دادا کے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ کلثوم کی پیدائش کے بعد جمنا روزانہ تین وقت چاول کھایا کرتی تھی اور چائے بھی پیا کرتی تھی۔ چاولوں کے ساتھ اس کو جلی ہوئی مرچیں کھانے کو دی جاتی تھیں کیونکہ ان لوگوں کو خیال تھا کہ ان سے معدے کی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح چائے میں چینی کے بجائے اس کو نمک دیا جاتا تھا تاکہ اس کا معدہ ٹھیک ہو سکے۔ اس زمانے میں ساس اور دوسرے سسرالی عزیز اس کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔

کلثوم کے چار سال بعد اس کا بھائی خیرالاسلام پیدا ہوا۔ وہ اب چودہ برس کا ہے۔ جمنا کا دوسرا بیٹا فاروق 1972ء میں پیدا ہوا تھا اور وہ اب دس سال کا ہے۔ جن دنوں بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ شروع ہوئی تھی تو فاروق ماں کے پیٹ میں تھا۔ جمنا آٹھ ماہ کی حاملہ تھی اور اس حالت میں بھی وہ اکثر اوقات فاقہ کشی پر مجبور ہوتی تھی۔ جنگ کے دنوں میں مہنگائی بہت ہوگئی تھی۔ غریب لوگوں کے مصائب بہت بڑھ گئے تھے۔

عزیز جمنا کا آخری بچہ ہے۔ وہ 1974ء کے اواخر میں پیدا ہوا۔ اب اس کی عمر آٹھ سال ہے۔ یوں اس کے چار بچے ہیں جن میں سے ایک لڑکی ہے اور تین لڑکے۔ ان کو بڑوں جتنی خوراک درکار ہوتی ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ابھی کمائی نہیں کرتا۔ کلثوم البتہ دھان کی چھان پھٹک اور گھر کے کام کام میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ لڑکے پہاڑیوں سے لکڑیاں چن کر لاتے ہیں۔ یوں جمنا کو ایندھن خریدنا نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی یہ لڑکے نہر یا دلدل سے ایک آدھ مچھلی پکڑ لاتے ہیں اور جمنا کو مہینے میں ایک دو بار ہی بازار سے مچھلی خریدنی پڑتی

ہے، جمنا کے خاوند کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں، لیکن اس کو چھ افراد کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ ان پڑھ ہے۔ اس لئے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ صرف یومیہ اجرت پر مزدوری ہی اس کے مقدر میں لکھی ہے، کاروبار کی اس کو تھوڑی بہت سوجھ بوجھ البتہ ہے۔ لیکن اس کا کیا فائدہ۔ اس کے پاس سرمایہ تو ہے نہیں جس سے کاروبار کر سکے۔ کالو کو جب کوئی کام نہیں ملتا تو اس کے کنبے کی حالت اور بھی خراب ہو جاتی تھی۔ تب وہ کام ملنے کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ برسات اور خشک سالی کے دنوں میں حالات اور بھی اسی قسم کے رہا کرتے تھے اور جمنا کے بچوں کو اکثر اوقات بھوکا رہنا پڑتا تھا۔

جمنا کے اہل خانہ کی زندگی محض محرومی اور مصیبت سے عبارت تھی۔ لیکن وہ شاذ و نادر ہی شوہر سے اس بات کا ذکر کرتی تھی۔ وہ اپنے دکھ اپنے دامن میں ہی سمیٹے رکھتی۔ اسی طرح وہ کسی سے مدد مانگنے پر بھوکے رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس کی ساس ابھی تک زندہ ہے اور اب وہ کالو کے چھوٹے بھائی کے پاس رہا کرتی ہے۔ وہ کبھی کبھار جمنا کو چاول دے دیتی یا اس کے دیور بچوں کو تھوڑے بہت پیسے دے دیتے۔ جمنا کے اپنے رشتے دار بھی اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ کون ایک پورے خاندان کا بوجھ زیادہ عرصہ تک اٹھا سکتا ہے۔ غریب اور بھوک کے سبب جمنا مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے کچھ مانگا تھا اور نہ ہی دوسروں کے گھروں میں کبھی نوکری کی تھی۔ اصل میں عزت نفس کا مادہ اس میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ گاؤں کے بزرگوں کو اس بدقسمت خاندان سے ہمدردی تھی۔ صرف ساس اور دیور ہی کبھی کبھی مدد کر دیا کرتے تھے۔

کالو کی چھوٹی بہن محرم بی بی جمنا کی شادی کے دو سال بعد بیاہی گئی تھی۔ تب اس کی عمر سولہ سال تھی۔ اس کا سسرال گوبانیہ نامی گاؤں میں ہے اور وہ اب وہاں کی محلّہ سمیتی کی سنٹر لیڈر ہے۔ محرم بی بی کی جب شادی ہوئی تھی تو اس کے والدین کے حالات اچھے تھے۔ گھر میں کھانے والے کم تھے اور کمانے والے زیادہ تھے۔ چنانچہ باپ نے شادی کے موقع پر اس کو تھوڑا بہت زیور بھی دیا تھا۔

جمنا کے شوہر نے ایک دو بار کسی سے قرض لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے پاس زمین ہی نہیں، اس لئے کون اس کا اعتبار کرتا اور قرض اس کو دیتا۔ چنانچہ کالو کو کہیں سے کوئی قرض نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ شدید ضرورت کے وقت بھی ماں اور بھائیوں کے علاوہ کوئی اس

کو پوچھتا تک نہ تھا۔ جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو جمنا اپنا زیور بیچنے پر مجبور ہوگئی۔ کنبے میں صرف اس کا شوہر روزی کمانے والا تھا۔ باقی تمام افراد کو کچھ مل جاتا، وگرنہ فاقے کرنا پڑتا۔ مصیبت صرف یہ نہ تھی کہ وہ واحد کمانے والا تھا یا یہ کہ اس کی کمائی بھی یقینی نہ تھی بلکہ بلائیں اور بھی تھیں۔ قدرتی آفات، طوفان اور خانہ جنگی جیسی مصیبتیں اس خاندان کو نڈھال کرتی رہی ہیں۔

1971ء کی جنگ کے زمانے میں آٹھ ماہ کی حاملہ جمنا کو بہت سی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ اس نے سال کے پہلے چند مہینے سسرال کے ساتھ گزارے۔ لیکن ایک دن فوج نے ان کا گھر جلا ڈالا۔ ان لوگوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہی۔ یہ بھی ہے کہ ان کا گھر ڈھاکہ چٹا گانگ ٹرنک روڈ کے قریب واقع تھا۔ فوج کسی وقت بھی ان کو دبوچ سکتی تھی۔ ان حالات میں ان کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خطرے سے خالی نہ رہا تھا۔ بہت سی بھاگ دوڑ کے بعد ان لوگوں نے مگدیہ میں قاسم مودی کے مکان میں پناہ لی جو کالو کا رشتے دار تھا۔ مگر یہ مکان بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ کے قیام کے بعد یہ لوگ کرکا چلے گئے جہاں جمنا کے والدین رہتے تھے۔ جمنا البتہ مگدیہ میں اپنی بڑی بہن کے پاس ٹھہر گئی اور چند مہینے وہیں گزار دیئے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو جمنا نے مرغیاں بیچ کر کچھ رقم بچانی شروع کی تھی۔ اس کے پاس 80 روپے جمع ہو گئے تھے۔ کالو حسین محنت مزدوری کرتا تھا۔ جب فوجی حملے کا خطرہ ہوتا یا کالو کو کوئی خطرہ ہوتا یا کوئی کام نہ ملتا تو جمنا کی معمولی بچت میں سے آٹا یا چاول خرید لیا کرتی۔ جنگ کے دنوں میں ان لوگوں کو دن میں دوبارہ کھانا نصیب ہوتا تھا۔ وہ ایک بار چاول اور ایک بار روٹی کھاتے تھے۔ کرکا جانے کے بعد جمنا تقریباً ڈیڑھ ماہ تک اپنی ماں کے پاس رہی۔ چنانچہ ان کو ایک ماہ تک لاڈو نامی پڑوسی کے ہاں پناہ لینی پڑی۔ اس دوران کالو نے دن رات محنت مزدوری کر کے چند پیسے اکٹھے کئے اور ان سے جھونپڑی ڈالنے کے لئے بانس خرید لایا۔ چھپر تو اس نے بنا لیا۔ مگر اس کی دیواریں غائب تھیں۔ تین ماہ بعد وہ دیواریں بنانے میں کامیاب ہوا۔

کالو کے دن سخت مشقت اور مصیبت میں گزر رہے تھے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے ابتدائی ایام میں مہنگائی زیادہ نہ تھی، چاول اور روز مرہ استعمال کی دیگر اشیاء خاصی سستی مل جاتی تھیں۔ پھر بھی گھریلو ضرورتیں پوری کرنے میں کالو کو بڑی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ اس

MashalBooks.org

کے بعد مہنگائی شروع ہوگئی۔ چیزیں، دیکھتے ہی دیکھتے مہنگی ہونے لگیں، لیکن اجرتوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ چنانچہ ایک سیر چاولوں کی قیمت چار روپے سے بڑھ کر آٹھ روپے ہوگئی۔ مگر مزدور کی اجرت پہلے کی طرح دس روپے روزانہ ہی رہی۔ چار افراد پر مشتمل کالو کے کنبے کو روزانہ دو سیر چاول درکار ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنا بے حد دشوار ہوگیا تھا۔ اسی ہولناک غربت میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ پھر 1974ء میں بنگلہ دیش میں مہیب قحط شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشیائے خوردنی نایاب ہوگئیں۔ ان کی قیمتیں بے پناہ بڑھ گئیں اور دوسری طرف مزدوری ڈھونڈنا پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا۔ کالو کے خاندان کے حالات پہلے سے بدتر ہوگئے۔ یہ لوگ دن میں صرف ایک بار آٹا گھول کر کھانے پر مجبور ہوگئے۔

1980ء میں مزید بلائیں نازل ہوئیں۔ اس سال بنگلہ دیش کی حالیہ تاریخ کا بدترین سیلاب آیا۔ سیلاب کی پھیلائی ہوئی تباہ کاری کے دنوں میں کالو کے لئے کوئی روزگار نہ رہا۔ فاقوں پر فاقے شروع ہوگئے اور یہ کنبہ زندہ رہنے کی خاطر دوسروں سے مانگنے پر مجبور ہوگیا۔ تھوڑے عرصے بعد اس کو چند روز کے لیے کام مل گیا اور یوں اس نے قرضہ اتار دیا۔ کالو کے دن اب یوں گزر رہے تھے کہ کبھی کام مل جاتا اور کبھی وہ کام کی تلاش میں رہتا۔ اس کے گھر والوں کو کبھی کھانا مل جاتا اور کبھی ان کو بھوکے رہنا پڑتا۔

1980ء کے سیلاب سے پہلے غربت اور بے روزگاری کے ہاتھوں کالو شدید پریشانی کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک روز اس نے خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر جانے کا ارادہ کیا جہاں مرد رضا کاروں کا راشن کارڈ اور ماہانہ امداد دی جایا کرتی تھی۔ کالو کو اپنے کنبے کی خاطر امداد کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے جوراج گنج کے خاندانی منصوبہ بندی کے مرکز نس بندی کا آپریشن کروالیا۔ یہ 1978ء کی بات ہے۔ اس آپریشن کے بدلے میں اس کو پندرہ روپے کی امداد تو مل گئی مگر اس کی صحت بتدریج خراب ہونے لگی۔ اس پر شدید تھکاوٹ طاری رہتی۔ کمزوری کے دورے پڑنے لگے اور وہ بدحال ہوجاتا۔ اب وہ زیادہ کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا اور ہفتے میں بمشکل دو دن کام کرسکتا تھا، جب کہ باقی روز وہ آرام کرتا۔ برسات اور خشک سالی کے ایام میں کام کرنا اس کے لئے بے حد دشوار ہوگیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگ اس کو کام دینے سے گریز کرنے لگے تھے اور اگر کوئی کام دیتا تو اس کو تمیں

MashalBooks.org

روپے یومیہ اجرت کے بجائے محض بیس روپوں پر ٹرخا دیتا۔ کالو حسین زندگی کی تمام بازیاں ہار رہا تھا۔ اور تو اور خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر نے اس کو ابھی تک راشن کارڈ بھی نہیں دیا جس کا وعدہ تین سال پہلے کیا گیا تھا۔ کالو کی حالت اب یہ ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر تک کام کرے تو بیمار پڑ جاتا ہے، یوں اس کو کام چھوڑ کر گھر بیٹھنا پڑتا ہے۔

یہی وہ دن تھے کہ جب گرامین بنک نے اس علاقے میں کام شروع کیا۔ ابتدائی ایام میں بنک کے منصوبے پر علاقے میں بہت سی بحث ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ علاقے کے مختلف دیہات میں بے زمین کسان منصوبے سے فائدہ اٹھانے کے لئے گروپ بنانے لگے۔ گوبانیہ سبزیاں پیدا کرنے والا گاؤں ہے۔ اس لئے یہاں کے کسان قدرے خوش حال نہیں۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ بے زمین دیہاتیوں کی حالت ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس گاؤں میں گروپ 15 مئی 1980ء کو وجود میں آیا۔ اب اس مرکز میں چھ گروپ شامل ہو چکے ہیں۔ سنٹر کی تشکیل سے گاؤں میں بہت سے اثرات پیدا ہوئے ہیں۔ گوبانیہ گاؤں کے تمام صحت مند اور غیر صحت مند بے زمین کسان گرامین بنک کے منصوبے سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے گروپ بنا لئے۔ چنانچہ ان گروپوں کو بنک کی طرف سے قرضے ملنے لگے اور ان کے ارکان اپنا اپنا کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو گئے۔

جمنا کا خاوند کسی گروپ کا رکن بننا چاہتا تھا۔ لیکن اول تو کوئی اس پر اعتماد نہ کرتا تھا اور دوسرے اس کا اپنا ارادہ بھی کمزور تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہ رہتی تھی۔ چنانچہ کوئی گروپ اس کو شامل کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ تھک ہار کر کالو نے اب یہ آس لگائی کہ علاقے میں عورتوں کا کوئی گروپ بن جائے تو اس کی بیوی کو بھی شاید رکنیت مل جائے گی۔ گوبانیہ میں عورتیں اپنا گروپ بنانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس گاؤں کی بے زمین کسانوں کی تنظیم کا ایک رکن، قربان علی، عورتوں کو بنک کے منصوبے کی بابت معلومات فراہم کرتا رہتا تھا اور گروپ سازی میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ ایک روز اس نے گاؤں کی عورتوں کو بتایا کہ بنک کے فیلڈ مینجر نے اس امر کا وعدہ کیا ہے کہ اگر گاؤں میں عورتوں کے دو گروپ بن جائیں تو وہ وہاں عورتوں کا مرکز قائم کر دے گا۔

قربان علی کی کوششیں رنگ لائیں۔ سب سے پہلے محرم بی بی آگے بڑھی۔ وہ دو بچوں کی ماں اور بیوہ تھی۔ اس نے گروپ سازی کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ اب وہ بے

زمین عورتوں کی سوسائٹی کی سربراہ ہے۔ قربان محرم بی بی کا کزن ہے اور یہ تو ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ محرم بی بی کالو حسین کی بہن ہے۔ محرم بی بی نے تین عورتوں کا تعاون حاصل کر لیا۔ اس نے جمنا کو بھی گروپ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمنا نے اس میں اپنے شوہر سے مشورہ کیا۔ لیکن اس کو ارادہ باندھتے ایک مہینہ لگ گیا۔ جمنا خود بھی اس بارے میں سوچتی رہی۔ کبھی وہ سوچتی کہ بنک سے ملنے والی رقم کا کیا کروں گی۔ اس کو کہاں لگاؤں گی اور کیا بنک کی ہفتہ وار اقساط باقاعدگی سے ادا کر پاؤں گی۔ یہ اور اس قسم کے کئی اور سوال اس کے ذہن میں ابھرتے رہے۔ بالآخر جمنا اور اس کے شوہر نے آپس میں معاملات طے کر لئے اور بنک سے امداد لینے کا ارادہ کر لیا۔

تھوڑے دن بعد جمنا محرم بی بی کے گروپ میں شامل ہوگئی۔ کسی نے اس کی شمولیت پر انگلی نہ اٹھائی۔ بنک کے کارکنوں نے گروپ کی ارکان کو سات روزہ تربیت دی۔ پھر خود فیلڈ مینجر دو دنوں تک ان کو بنک کے قواعد وضوابط بتاتا رہا۔ گروپ کی ہر رکن نے سات سات روپے بچت کے طور پر جمع کروا دیئے اور یوں فیلڈ مینجر نے گروپ کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔ بعد ازاں 17 نومبر 1980ء کو، یعنی گوبانیہ کے بے زمین افراد کی سوسائٹی کی تشکیل کے چھ ماہ بعد گاؤں میں عورتوں کا سنٹر قائم کر دیا گیا۔ سنٹر میں عورتوں کے دو گروپ شامل تھے۔ جمنا اس سنٹر کے پہلے گروپ کی پانچویں رکن تھی۔ بنک کے کارکنوں نے اس کو اپنے دستخط کرنے سکھا دیئے تھے۔ وہ اپنی رکنیت پر فخر کرتی تھی۔

میں نے جمنا سے پوچھا تھا کہ آیا اس کو گرامین بنک کے تمام قواعد وضوابط یاد ہیں۔ اس نے جواب دیا: ''ایک زمانے میں وہ سب مجھے یاد تھے، لیکن اب یاد نہیں رہے۔ ہاں اگر کوئی ایک بار پھر مجھے بتا دے تو فوراً ہی مجھے یاد آ جائیں گے'' جمنا کو اس بارے میں واضح علم نہیں ہے کہ گروپ کیسے بنایا جاتا ہے۔ تاہم مالی امور کے بارے میں تمام قواعد سے وہ آگاہ ہے۔ بنک سے ملنے والی رقم کے متعلق وہ بہت محتاط ہے اور سمجھتی ہے کہ اس رقم کو نہایت سلیقے سے بروئے کار لانا چاہئے۔ چنانچہ وہ کہتی ہے کہ ''اب تک کسی نے ہمیں قرضہ نہ دیا تھا۔ اب ہمیں رقم مل گئی ہے تو ہمیں اپنی قسطیں نہایت احتیاط سے واپس کرنی چاہئیں۔ ایسا نہ ہوا تو پھر ہمیں مزید قرض نہ مل سکے گا۔''

گروپ کی تشکیل کے تقریباً دو ہفتے بعد گروپ کی چیئر مین نے جمنا اور گروپ کی

سیکرٹری لدھیانی کا نام قرضے کے لئے سنٹر لیڈر کو بھیجا۔ قرضے کے لئے درخواست دینے سے پہلے جمنا اور اس کے شوہر نے قرضے کی حد اور اس کے مقصد کے بارے میں ایک بار پھر آپس میں غور وفکر کیا۔ آخر کار انہوں نے پانچ سو روپے کا قرضہ حاصل کرنے پر اتفاق کیا۔ وہ اس رقم سے ایک گائے خریدنا چاہتے تھے۔ آخر کار درخواست موصول ہونے کے دس روز بعد دسمبر 1980ء میں جمنا بنک کے قاعدے کے مطابق رقم وصول کرنے کے لئے خواتین کے مرکز گئی اور فیلڈ مینجر سے رقم حاصل کر لی۔ اس رقم میں سے اس نے رقم کا پانچ فی صد حصہ، یعنی پچیس روپے گروپ فنڈ میں جمع کروائے۔ لدھیانی نے بھی اسی قدر رقم کا قرضہ حاصل کیا۔

رقم ہاتھ آنے پر جمنا کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ مگر وہ کسی قدر فکر مند بھی تھی۔ اس نے گائے خریدنے کے لئے قرضہ لیا تھا۔ مگر کوئی اچھی گائے 475 روپے میں نہ مل سکتی تھی۔ اس رقم سے وہ صرف کوئی بچھڑا ہی خرید سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ غلطی اس سے ہوگئی ہے اس کو زیادہ رقم طلب کرنی چاہئے تھی۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ سات روز کے اندر رقم کو استعمال کرنا ضروری تھا۔ تذبذب کے عالم میں رہنے کے بعد جمنا نے بالآخر مینجر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

مینجر کو جمنا نے اپنی الجھن بتائی اور قرضے کی رقم گائے خریدنے کے بجائے دھان کا کام شروع کرنے پر خرچ کرنے کی اجازت چاہی۔ مینجر نے اجازت دے دی۔ چنانچہ کالو اپنی بیوی کے لئے دھان خریدنے کی خاطر میر سرائے بازار روانہ ہوگیا۔ وہاں سے اس نے 465 اڑی دھان خریدا (اڑی تقریباً چار پونڈ کے برابر وزن کو کہتے ہیں) دس روپے اس نے کٹائی کے لئے رکھ لئے۔ دھان کی صفائی کے لئے جس قدر ایندھن درکار تھا وہ جمنا کے بیٹے پہاڑیوں سے اکٹھا کر کے لے آئے۔ یوں سارا سامان اکٹھا ہو گیا۔ یہ جمنا کی جدوجہد کی زندگی کا آغاز تھا۔ گرامین بنک کے ساتھ معاملہ کرنے سے پہلے تمام رشتہ داروں اور واقف کاروں نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا اور کسی طرف سے اس کو مشکل پیش نہ آئی تھی۔ ساس اور دیور پڑوس میں ہی رہتے تھے اور انہوں نے بھی ہمت بڑھائی تھی۔ یہاں تک کہ گاؤں کے بزرگوں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

یہ ماگھ کا مہینہ تھا جب جمنا کو قرض ملا۔ اس مہینے میں موسم بہت اچھا ہوتا ہے۔

چنانچہ بارشیں تھیں اور نہ ہی طوفان کا خدشہ تھا۔ گویا تسلسل سے کاروبار کیا جا سکتا تھا۔ جمنا نے جو کام شروع کیا تھا، اس کے لئے اچھا موسم بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ موسم کافی عرصے تک برقرار رہا۔ تقریباً ساڑھے چار مہینوں میں جمنا نے پہلا قرض واپس کر دیا۔

مرزا سرائے بازار میں ہر منگل اور ہفتے کے روز جمنا چاول بیچتی ہے۔ باقی دنوں میں وہ یہ کاروبار گھر بیٹھ کر ہی کرتی ہے۔ گھر رہتے ہوئے وہ تقریباً چار سیر چاول روزانہ فروخت کر لیتی ہے۔ دھان کی ایک اڑی سے وہ تقریباً آٹھ کلو چاول حاصل کر لیتی ہے اور دھان اس نے تیس روپے فی اڑی کے حساب سے خریدا تھا۔ ان چاولوں کے علاوہ ایک اڑی سے تقریباً دو سیر ٹوٹا چاول بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چاول وہ پانچ روپے سیر کے حساب سے بیچتی ہے۔ جب وہ مرزا سرائے بازار میں بیٹھتی ہے تو تقریباً چوبیس سیر چاول ایک دن میں بیچ لیتی ہے۔ مرزا سرائے بازار میں اس کی ہفتہ وار فروخت تقریباً 48 سیر چاول ہوتے ہیں جو وہ اچھا اڑی دھان سے حاصل کرتی ہے۔

مرزا سرائے میں ہفتہ میں دو دن بازار لگتا ہے اور جمنا ان دونوں دنوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے بتایا کہ وہ ایک اڑی دھان تیس روپے میں حاصل کرتی ہے اور ان سے آٹھ سیر چاول حاصل ہوتے ہیں جو چالیس روپے میں بک جاتے ہیں۔ بازار میں یوں ایک دن کے کاروبار سے اس کو 120 روپے کی بکری ہوتی ہے۔ دھان سے اس کو دو سیر ٹوٹا چاول بھی حاصل ہوتے ہیں جو تین روپے فی سیر کے حساب سے بک جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین روپے اڑی دھان وہ 90 روپے میں خریدتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والے چاول 126 روپے (6,120) میں بکتے ہیں۔ یوں اس کا منافع 36 روپے بنتا ہے۔ بازار میں وہ ہفتے میں دو دن کاروبار کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا منافع 72 روپے بن جاتا ہے۔ ہفتے کے باقی دنوں میں اس کے منافع کی اوسط چھ روپے رہتی ہے۔ گویا یوں کہئے کہ مجموعی طور پر ہفتے میں اس کو (30,72)، 102 روپے منافع ہوتا ہے اور منافع کی روزانہ اوسط ساڑھے چودہ روپے بنتی ہے۔ اس حساب سے جمنا کی ماہانہ آمدنی 437 روپے بن جاتی ہے۔

جمنا کا خاندان چھ افراد پر مشتمل ہے۔ یعنی وہ خود ہے، اس کا شوہر ہے، تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اس گھرانے میں سے وہ تنہا کمائی کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے

MashalBooks.org

لوگوں کی دال روٹی کے علاوہ دوا دارو اور دوسری ضرورتیں بھی پوری کرنی ہوتی ہیں۔

جمنا دن میں دوبار، یعنی دوپہر اور رات کو کھانا پکاتی ہے۔ صبح کے وقت یہ لوگ رات کے بچے کھچے چاولوں پر گزارہ کرتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ان کو ڈیڑھ سیر چاول درکار ہوتے ہیں اور رات کو چوتھائی حصہ زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جمنا کے بیٹے تالابوں اور نہروں سے مچھلیاں پکڑ لاتے ہیں۔ لہٰذا ان کو کبھی کبھار مچھلی خریدنی نہیں پڑتی ہے۔ چاولوں کے ساتھ ان کو سبزی اور لون مرچ کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ خیر، جہاں تک سبزیوں کا تعلق ہے، وہ بازار سے نہیں خریدتے۔ بلکہ کھیتوں اور سڑکوں کے کنارے اگی ہوئی جنگلی سبزیوں پر گزارا کرتے ہیں۔ اگر آپ ان لوگوں کے ایک روز اخراجات کا حساب لگانا چاہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ دوپہر کے کھانے کے لئے وہ سوا چھ روپے اور رات کے کھانے کے لیے ساڑھے سات روپے کے چاول خریدتے ہیں۔ ایک روپیہ آپ لون مرچ وغیرہ کے لئے شامل کر لیجئے۔ اس طرح ایک دن کے کھانے پینے کا خرچ تقریباً پندرہ روپے بن جاتا ہے۔

دھان کے کاروبار میں قرض کی رقم لگانے کے بعد منافع ملنے لگا تو جمنا کا حوصلہ بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے مزید قرضہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ تاہم دوسرا قرضہ پہلے قرض کی ادائیگی کے بعد ہی مل سکتا تھا۔ اپنے جوش وخروش میں جمنا نے بنک کی مقرر کردہ قسط سے دوگنی رقم ہر ہفتے واپس کرنا شروع کر دی۔ اس کی قسط دس روپے تھی، مگر وہ بیس روپے ہر ہفتے واپس کرنے لگی۔ اپریل 1981ء میں اس نے آخری قسط کے طور پر گرامین بنک کے منیجر کو ایک سو چالیس روپے ادا کئے اور ساتھ ہی دوسرے قرضے کے لئے درخواست بھی تھما دی۔

جمنا کا شوہر، کالوحسین، بھی قرض کی ادائیگی کے بارے میں بہت محتاط رہا۔ ہفتہ وار قسط جمع کروانے کے لئے وہ تو فاقے بھی برداشت کر لیتے تھے۔ کالو بھی تھوڑا بہت کام کر کے کچھ رقم لانے لگا تھا اور یہ رقم بھی قسط کی ادائیگی کے کام آتی تھی۔ رقم کی واپسی میں جمنا خود بھی بہت محتاط رہی اور اس نے ایک قسط کی بے قاعدگی بھی نہ پیدا ہونے دی۔

جس سنٹر سے جمنا کا تعلق ہے وہ بھولا میاں کے مکان میں واقع ہے۔ یہ شخص جمنا کا پڑوسی ہے اور اس کے گھر کے مشرق کی طرف رہتا ہے۔ یہاں ہم یہ بتادیں کہ پہلے قرض کی مکمل ادائیگی سے پہلے جمنا کے دل میں دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے اس پر کوئی بھاری بوجھ پڑ گیا ہے۔ چنانچہ پہلے قرض سے فراغت ملی تو جمنا اور کالو بہت خوش ہوئے۔

سکون سا ان کو مل گیا۔ اب زیادہ اعتماد کے ساتھ انہوں نے دوسرے قرضے کے لئے درخواست دی تھی۔

گروپ فنڈ سے قرض لینا جمنا کو پسند نہیں، کیونکہ اس کی ادائیگی بہت مشکل ہوگی۔ جن دنوں وہ پہلے قرضے کی قسطیں ادا کر رہی تھی، تو اس کا خاوند بیمار ہوگیا تھا۔ تقریباً تین ہفتے تک وہ بستر پر پڑا رہا تھا اور اس کے علاج معالجے میں جمنا کو اپنے سرمائے میں سے روپے خرچ کرنا پڑے تھے۔ خیر، جب دوسرے قرضے کی رقم ملی تو جمنا کے پاس پہلے کے سو روپے بچے ہوئے تھے جو اس کے گھر کی مرمت پر خرچ کر دیئے۔ اسی اثنا میں اس نے 104 روپے سے ایک بکری خریدی جس نے ایک بچہ بھی دیا ہے۔

دوسرے قرضے کے طور پر جمنا نے دو ہزار روپے مانگے تھے۔ اس رقم سے وہ ایک گائے خریدنا چاہتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دھان کا کاروبار بھی جاری رکھنے کی خواہش مند تھی۔ کالو کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی تاہم بٹائی پر زرعی کام کے لئے اس کو گائے درکار تھی۔ بہر حال ہوا یہ کہ گائے آ گئی مگر کالو کو بٹائی پر کوئی زمین نہ مل سکی۔ گائے اب اچھی بھلی اور صحت مند ہے۔ جمنا اپنا کاروبار بڑے اچھے انداز سے چلا رہی ہے تاہم برسات کے دنوں میں کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔ دوسری طرف کالو کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ آج کل جمنا کو چند اور مشکلات کا بھی سامنا ہے جو اس کے خیال میں کئی دنوں تک باقی رہیں گی۔ تاہم وہ قسطوں کی ادائیگی میں غفلت نہیں کر رہی۔ باقاعدگی سے ہفتہ وار قسطیں ادا کر رہی ہے اور سنٹر کے اجلاسوں میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتی ہے۔

پہلے قرض کی واپسی اور دوسرے قرض کے حصول سے جمنا کی خود اعتمادی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ابھی سے اس نے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ جب وہ دوسرا قرض بھی واپس کر دے گی تو گرامین بنک سے تیسری بار قرض لے گی۔ اس کا ارادہ ہے کہ آئندہ وہ دو ہزار روپے مانگے گی۔

جمنا گرامین بنک پراجیکٹ سے بہت خوش ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ''میرے خیال میں بنک کے قواعد وضوابط ہر لحاظ سے بہت معقول قسم کے ہیں۔ اگر قسط کی ادائیگی میں پانچ سات روز کی تاخیر ہو جائے تو بنک کے لوگ برا نہیں مانتے۔ ساہوکاروں کا رویہ تو اور ہی ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔''

MashalBooks.org

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب گرامین بنک نے اس علاقے میں کام شروع کیا تھا تو بہت سے سادہ لوح دیہاتی اس کو قاتل مشین کہا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بنک غریب دیہاتیوں کو تباہ کردے گا۔ یہ افواہ عام تھی کہ بنک سے قرضے لینے والوں کو آخر کار ہتھکڑیاں لگ جائیں گی اور جو قرض واپس نہ کرسکیں گے ان پر بہت سختی ہوگی۔ قرض لینے والے مرکھپ گئے تو بنک ان کے بیوی بچوں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ دیہاتی لوگ بنک کو ''کابلی والا'' سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ کابلی والا سے مراد ایسے افراد ہیں جو چھوٹی سی رقم دے کر قرضداروں کا ساری عمر خون چوستے رہتے ہیں۔

ان افواہوں کی فضا میں جو لوگ ہمت کر کے بنک سے قرضے کے لئے رابطہ کرتے تھے وہ بھی شروع شروع میں خوف زدہ سے رہتے تھے۔ لیکن صورت حال جلد ہی بدل گئی۔ بہت سے لوگوں نے قرضے لئے اور اپنے کاروبار شروع کر دیئے۔ اس طرح ان کی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ دوسرے دیہاتی پھر بھی وسوسوں کا شکار رہے۔ وہ کہنے لگے۔ ''بے زمین لوگوں نے قرضے لئے ہیں اور ان کے حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اب تو وہ منہ نہیں لگاتے۔ ان کی وجہ سے قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ آخر کب تک ان کو یونہی قرضے ملتے رہیں گے۔'' اس کو آپ دیہی لوگوں کا مخصوص ردعمل کہہ سکتے ہیں۔ خیر، بات یہ ہے کہ امیر اور متوسط طبقے کے لوگ اب بھی بنک سے خوش نہیں ہیں۔ اسی طرح ساہوکار بھی ناراض ہیں۔ لیکن ان سب سے بے نیاز ہو کر گرامین بنک نہایت مستعدی سے غریب اور بے سہارا لوگوں کی مدد کر رہا ہے اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا رہا ہے۔

MashalBooks.org

محنت کش گھریلو عورت

ممتاز بیگم 1948ء میں باشل تھانہ کے ماترہ نامی گاؤں کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔اس کے باپ کا نام کلیم الدین تھا۔ والدین کی وہ اکلوتی بیٹی تھی، البتہ اس کے بھائی چار تھے۔ دو اس سے بڑے تھے اور دو چھوٹے۔ خاندان میں اکلوتی بیٹی ہونے کے ناطے والدین اور بھائی سبھی کی وہ لاڈلی تھی۔دادی دادا بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ عید کا تہوار آنا تو سب اس کو تحفے تحائف دیتے۔کلیم الدین کے خاندان میں پورے پچیس سال بعد بیٹی نے جنم لیا تھا۔لہٰذا اس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی تھی اور وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی۔ ممتاز کا باپ زندگی میں اچھا خاصا کامیاب شخص تھا۔وہ کاروبار کرتا تھا اور اپنے گھرانے کا سربراہ تھا۔ وہ باشل کے علاقے سے پٹ سن خریدتا اور نارائن گنج لے جا کر فروخت کر دیتا تھا۔اس طرح وہ کافی منافع کما لیتا تھا۔اس کاروبار کے سلسلے میں جب کبھی وہ نارائن گنج جاتا تو بیٹی کے لئے نئے کپڑے خریدنا کبھی نہ بھولتا۔

کاروبار کے علاوہ کلیم الدین کی چار پانچ ایکڑ زرعی اراضی بھی تھی جس سے عموماً اچھی پیداوار مل جاتی۔ اس زمانے میں مہنگائی زیادہ نہ تھی۔لہٰذا کاروبار اور زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی پر یہ خاندان ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ مالی خوشحالی کے سبب گھر میں سکھ چین بھی تھا۔

ممتاز کا بچپن کسی بڑی بیماری سے محفوظ رہا تھا۔کبھی کبھار اس کی طبیعت خراب ہوتی تو گھر والے تمام لوگ پریشان ہو جاتے۔ دیہی حکیموں کا تانتا بندھ جاتا اور اس کی تندرستی کے

MashalBooks.org

لئے سوسو جتن کئے جاتے۔ بچپن کی یادوں میں ممتاز کو ایک واقعہ کبھی نہیں بولتا۔ وہ بیمار ہو گئی تھی۔ اس کے والدین، دادی دادا اور گھر کے دوسرے تمام لوگ بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے اور اس کو جو کی خوراک کھانے پر آمادہ کر رہے تھے۔ ممتاز بالکل نہیں مان رہی تھی۔ اس کو جو کا ذائقہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

بھائی ممتاز کے اپنے ساتھ سکول لے جایا کرتے تھے۔ بڑے بھائی منہاج الدین نے اس کو بنگالی پڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر باپ کو اس معاملے میں دلچسپی نہ تھی۔ باپ کا کہنا تھا کہ ''ممتاز ایک مسلمان کی بیٹی ہے۔ لہٰذا اس کو صرف قرآن مجید پڑھنا چاہئے۔ اس جیسی دیہاتی لڑکی نے سکولوں کالجوں سے کیا لینا ہے۔ وہ اپنے دستخط کرنا سیکھ لے گی۔ بس یہی کافی ہے۔''

منہاج بہن کے لئے چند کتابیں بھی خرید لایا تھا۔ لیکن باپ کے لاڈ پیار نے اس کو کتابوں سے دور ہی رکھا۔ منہاج کا کہنا تھا کہ ''ممتاز ہماری اکلوتی بہن ہے، ہم اس کو خوب پڑھائیں لکھائیں گے۔'' ممتاز ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اس زمانے میں بہت کم لڑکیاں سکول جایا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کے وارث ان کو بنگالی پڑھانے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ان حالات میں غنیمت تھا کہ ممتاز نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر لی اور تھوڑی بہت عربی بھی سیکھ لی۔

بچپن کے دن جلد ہی ختم ہو گئے اور ممتاز نے شباب کی منزل میں قدم رکھ دیا۔ ہمارے علاقے میں پھلتی پھولتی ہوئی لڑکی والدین کے لئے کئی پریشانیوں کا سبب بنا کرتی ہے۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں بیٹی کو بیاہے بغیر ماں باپ کو سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوتا۔

ممتاز جواں ہو رہی تھی تو گردوپیش کے دیہات سے اس کے لئے کئی رشتے آئے۔ لیکن کوئی بھی اس کے ماں باپ کو پسند نہ آیا۔ آخر کلیم الدین نے بیٹی کی شادی کے لئے رشتہ داروں سے صلاح مشورہ شروع کیا۔ انہی دنوں کلیم الدین اور اس کی بیوی پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کی بیٹی پڑوس کے ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ ان کے لئے یہ بہت ہی صدمے کی بات تھی۔ ماں کو جب پہلی بار یہ بات بتائی گئی تو اس کو یقین نہ آیا۔ اس نے خود اس امر کی تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم جلد ہی ممتاز کے ماں باپ کے بدترین خدشے

درست ثابت ہوگئے۔ وہ جان گئے کہ وہ ایک ایسے نوجوان کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے جس کے خاندانی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ چنانچہ کلیم الدین نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماتی میاں نامی اس نوجوان سے اپنی بیٹی کی شادی کسی قیمت پر بھی نہ ہونے دے گا۔ ممتاز کا ردعمل بھی شدید جذباتی قسم کا تھا۔ اس نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وارث اس کی شادی کہیں اور کرنے پر تل چکے تھے۔ چنانچہ باشل تھانہ کے برہمن پارل نامی گاؤں کے شیخ علی سے ممتاز کو بیاہ دیا گیا۔ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی اور طرفین نے اس پر دل کھول کر پیسہ لٹایا۔ لیکن ممتاز کا دل شوہر کے گھر میں بہل نہ سکا۔ اس نئی حقیقت کو قبول کرنے کی خاطر اس کو طویل وقت درکار تھا۔

ممتاز جب سسرال گئی تھی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ وہ اپنے شوہر شیخ علی کے ساتھ شاذ و نادر ہی بات چیت کرتی تھی اور عام طور پر اس سے پرے ہی رہتی تھی۔ تاہم شیخ علی کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ اس کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ممتاز میکے گئی تو گھر والوں کو اس میں نمایاں تبدیلی نظر محسوس ہوئی۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی اور دوسروں کے ساتھ پہلے جیسی بے تکلفی سے پیش نہ آتی تھی۔ خاندان کا ہر شخص اس تبدیلی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ مگر ممتاز نے گویا ہونٹ سی رکھے تھے۔ وہ خاموش رہی۔ دادی البتہ اس کے دل کا بھید سمجھتی تھی۔ چنانچہ ایک روز اس نے ممتاز کے ساتھ کافی دیر تک باتیں کیں اور اس کو چند مشورے بھی دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ علی جب ملنے آیا تو ممتاز کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ پہلی بار وہ اس کے پاس آ کر بیٹھی اور باتیں کرنے لگی۔ شیخ علی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ ایک خاموش طبع آدمی تھا، مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ اس تبدیلی سے اس کو خوشی ہوئی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ماتی میاں کی محبت ممتاز کے دل سے محو ہونے لگی۔ اب وہ شوہر اور اپنے نئے گھر میں دلچسپی لینے لگی۔ اس کا شوہر اپنے سب بھائیوں سے چھوٹا تھا اور سسرال میں ممتاز سب سے چھوٹی بہو تھی۔ وہ سب اس کو چاہتے تھے۔ شیخ علی پر چھوٹے ہونے کے ناطے گھر بار کی ذمہ داریاں بھی زیادہ نہ تھیں۔ وہ اپنا وقت عزیزوں سے میل ملاپ اور مختلف قسم کے کھیل تماشوں میں گزارتا تھا۔ بھائی اس پر زیادہ دباؤ نہ ڈالتے تھے۔ وہ اپنی زمین پر کاشت کرتے اور کاروبار بھی چلاتے تھے۔ شیخ علی پر چونکہ ذمہ داریوں کا بوجھ نہ تھا

اس لئے وہ کاشت کاری اور کاروباری امور کی سوجھ بوجھ سے محروم رہ گیا تھا۔

شادی کے پہلے چند مہینوں میں شیخ علی ازدواجی زندگی کے خوب مزے لوٹتا رہوا۔ وہ اکثر سسرال آتا جاتا اور پڑوسیوں کے ساتھ بھی اس کی خوب بن رہی تھی۔ بھائی کبھی کبھی اس کو گھر کا کوئی کام کاج سپرد کر دیتے۔ لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر پہلو بچا لیتا۔ چنانچہ جب بھی کسی کام کی خاطر اس کی ضرورت پڑتی، وہ کسی بہانے سے کھسک جاتا۔ بھائی پہلے تو اس بات پر ہنستے رہے، لیکن کچھ عرصے بعد انہوں نے اس بات کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اب ان کو شیخ علی کا یہ وطیرہ اچھا نہ لگتا تھا۔ بھائیوں نے اس کی شادی پر بھاری رقم خرچ کی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے شادی کی دعوت اور زیورات وغیرہ کے لئے کچھ رقم ادھار بھی لے رکھی تھی۔ لہٰذا اب وہ شیخ علی کی بہانہ بازیوں پر ناراض ہونے لگے۔

شیخ علی کو خاندانی ذمہ داریوں کی کوئی پرواہی نہ تھی اور نہ ہی وہ اپنا رویہ بدلنے پر آمادہ تھا۔ یوں رفتہ رفتہ اس کے اور بھائیوں کے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگے۔ بھائی اس کی شادی کے اخراجات اور اس کی سستی و کاہلی کا ذکر بار بار دہراتے۔ ان کا مشترکہ خاندان بھی خاصا بڑا تھا۔ خاندانی اخراجات بڑھتے چلے جا رہے تھے جب کہ آمدنی میں اس رفتار سے اضافہ نہ ہو رہا تھا۔ مہنگائی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک بار اس خاندان کی فصل بہت خراب ہوئی تو شیخ علی کے خلاف بھائیوں کا غم و غصہ بھی بہت بڑھ گیا۔ اب وہ اس امر کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے کہ شیخ علی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مزے سے گلچھڑے اڑاتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے الگ ہونے کا ارادہ کر لیا۔ تاہم اس سے پہلے انہیں ایک پرانے خاندانی قرضے کا مسئلہ حل کرنا تھا۔

بہت عرصہ پہلے شیخ علی کے باپ نے کرشی بنک سے ڈیڑھ ہزار روپے قرض لئے تھے۔ خاندانی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد چونکہ کوئی پیسہ نہ بچا تھا، لہٰذا اس قرض کی کوئی قسط بھی ادا نہ کی گئی تھی۔ بنک کی طرف سے قرضے کی واپسی کے لئے پے در پے نوٹس موصول ہونے لگے تھے۔ بھائیوں کے پاس اس قدر نقد رقم نہ تھی کہ وہ سود سمیت یہ قرض ادا کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے زمین کا ایک حصہ فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح قرض کی ادائیگی کے بعد بعض دوسری خاندانی ضرورتوں کے لئے کچھ رقم بچ بھی سکتی تھی۔ مگر اس تجویز سے صرف شیخ علی اور اس کے ایک بھائی کو اتفاق تھا۔ دوسرے بھائی اس کے حق میں نہ تھے۔ کافی بحث و

مباحثہ کے بعد دوسرے بھائی اس بات پر رضا مند ہوئے کہ زمین صرف قرض کی ادائیگی کے لئے بیچی جائے اور فروخت کی رقم سے خاندان کے دیگر اخراجات پورے نہ کئے جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنے کاروبار اور زرعی پیداوار کے بل بوتے پر وہ کسی نہ کسی طور اپنے خاندان کی گاڑی چلاتے رہیں گے۔ جب تک ان کے ہاتھ سلامت ہیں، وہ اپنی زمین کسی قیمت پر نہ بیچیں گے۔ لیکن کاروبار میں شیخ علی کا کوئی حصہ نہ تھا، چنانچہ اس کو آخر کار خاندان سے الگ کر دیا گیا۔ یوں خاندان تقسیم ہو گیا اور زمین بیچ کر قرض بھی ادا کر دیا گیا۔

مشترکہ خاندان سے علیحدہ ہونے کے بعد ممتاز اور اس کا شوہر ایک خاندان بن گئے۔ ممتاز ہمیشہ سے ہنستے کھیلتے خاندان کی خواہش کرتی چلی آئی تھی۔ ماں باپ کے گھر میں اس کی ساری زندگی فرائض اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد گزری تھی۔ مگر اب اس نے خود اپنے گھر اور اپنے خاندان کو بنانے سنوارنے کا بوجھ اٹھا لیا۔ شیخ علی البتہ پہلے کی طرح بے نیاز ہی رہا۔ مستقبل کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی خیالات نہ تھے۔ ممتاز اس کو بدلی ہوئی حقیقت کا احساس دلانے کے لئے روز اس سے بحث کرتی۔ آخر کار اس کی تگ و دو رنگ لائی اور شیخ علی کا رویہ بدلنے لگا۔ وہ گھریلو زندگی میں دلچسپی لینے لگا اور اس نے چھوٹا موٹا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ یوں اس کی آمدنی کا وسیلہ بن گیا جس سے گھریلو اخراجات پورے ہونے لگے۔

شادی کے دو سال بعد ممتاز نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اس پر وہ بے انتہا خوش ہوئی۔ بچے کی پیدائش کے دنوں میں ممتاز اور شیخ علی کو مشترکہ کوششوں سے گھر کا خرچ کسی نہ کسی طور پر چل رہا تھا۔ بچپن سے ممتاز کی صحت بہت اچھی تھی۔ لہٰذا بچے کی پیدائش کے دوران اس کو کوئی بڑا مسئلہ پیش نہ آیا۔ خیر، اس کی صحت تھوڑی بہت متاثر ضرور ہوئی۔ ماں باپ کی طرف سے اس کو کسی قدر مالی امداد بھی مل گئی۔ میاں بیوی دونوں بیٹے کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔ بچے کے لئے وہ نئے کپڑے خرید لائے۔ زچگی کے ایام میں باپ نے ممتاز کی صحت پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں وہ پھر سے بھلی چنگی ہو گئی اور اپنے خانگی امور پر توجہ دینے لگی۔ اس دوران میں اس کا شوہر بھی کافی بدل گیا تھا۔ اب وہ زیادہ وقت بیوی اور اپنے بچے کو دیتا تھا اور اس کا کاروبار بھی ٹھیک چل رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ممتاز نے ایک بچی کو جنم دیا۔ بیٹے کے بعد بیٹی آ گئی تو سب کو خوشی

MashalBooks.org

ہوئی۔لیکن اس بار ممتاز کی صحت پہلے سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ کنبے کے بارے میں اس کو زیادہ تشویش رہنے لگی تھی اور ہر وقت وہ حالات بہتر بنانے کے بارے میں سوچتی رہتی۔ ذہنی پریشانیوں اور جسمانی مشقت کا اثر اس کی صحت پر پڑنے لگا تھا۔ انہی دنوں شیخ علی بھی کچھ عرصہ بیمار رہا اور کاروبار پر پوری توجہ نہ دے سکا۔اس طرح خاندان کی آمدنی پہلے سے کم ہو گئی۔

شوہر کے علاج معالجے کے اخراجات کے بعد بچوں کی خوراک کے اخراجات پورا کرنا بھی ممتاز کے لئے مشکل ہو گیا۔ پہلے بچے کی پیدائش پر ماں باپ نے اس کو کچھ رقم دی تھی۔لیکن اس بار یہ امداد بھی نہ مل سکی۔ وجہ یہ تھی کہ ممتاز کا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ماں اس کی زندہ تھی مگر وہ کچھ دینے کی حالت میں نہ رہی تھی۔

ممتاز شیخ علی کی جیون ساتھی تھی۔ اس کے سکھ دکھ شوہر سے وابستہ تھے۔ بچوں نے اس کے بندھن اور بھی مضبوط بنا دیئے تھے۔مشکلوں اور سختیوں کے دن گزارتے ہوئے وہ اکثر اوقات ماضی کی یادوں میں کھو جاتی۔ ممتاز کے ساتھ اس کے شوہر کا رویہ ہمیشہ ہی اچھا رہا تھا۔کبھی اس نے لعن طعن بھی نہ کی تھی۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ ممتاز نے خود کو اس چھوٹے سے خاندان کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ گاؤں کے بزرگوں کے ساتھ بھی ممتاز کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔ وہ اپنے شوہر سے زیادہ تیز وطرار تھی اور ذمہ داریاں پوری کرنے میں پیش پیش رہتی تھی۔ بزرگوں کا وہ ہمیشہ سے احترام کرتی تھی۔ چنانچہ جب اس پر سخت دن آئے تو بزرگوں نے بھی ہر طرح سے اس کی مدد کی اور اچھے مشورے دیئے۔لیکن ظاہر ہے کہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ممتاز کا بھلا نہ چاہتے تھے۔ نہ ممتاز کو اس امر کا احساس تھا۔ پھر گاؤں میں ایسے بھی تھے جو اس کی مدد کرنے کے وسائل رکھتے ہوئے بھی مدد کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ممتاز نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ”وہ نہیں چاہتے کہ ہم اچھا کھائیں اور اچھی طرح جیئیں۔ وہ دوسروں کی خوشی برداشت ہی نہیں کر سکتے۔“ضرورت کے دنوں میں ممتاز دوسروں سے قرض لے لیا کرتی تھی۔مگر یہ رقم کوئی زیادہ نہ تھی، وہ چند دنوں کے لئے پندرہ بیس روپے ادھار لیتی اور وقت پر لوٹا دیتی۔

1974ء کے قحط کے ایام میں شیخ علی نے خانگی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اپنی زمین کا کچھ حصہ دو ہزار تین سو روپے کے عوض بیچ دیا۔ ان دنوں اشیائے صرف، خصوصاً

Mashalbooks.org

چاول کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ یہ رقم جلد ہی خرچ ہو گئی۔ ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ ان کا بیٹا بیمار ہو گیا۔ اب ممتاز کو ہر وقت یہ پریشانی رہتی تھی کہ وہ اپنے خاندان کے حالات کس طرح بہتر بنائے۔

1971ء سے اس خاندان کی مالی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ یہ وہ دن تھے کہ جب بنگلہ دیش کے قیام کے لئے جنگ شروع ہوئی تھی۔ شیخ علی سخی پور میں کمار چالا بازار میں صدریوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن جونہی اس نے دکان کھولی، رضا کار بازار میں آدھمکے۔ اس علاقے پر مکتی باہنی والوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے رضا کار مقامی لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ بازار میں داخل ہو کر انہوں نے لوگوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شیخ علی خوف زدہ ہو گیا۔ جان بچانے کی خاطر وہ دکان کو کھلا چھوڑ کر ہی بھاگ گیا۔ رضا کاروں اور فوج کے حامیوں نے بازار کی دوسری دکانوں کی طرح شیخ علی کی دکان بھی لوٹ لی۔ اس نقصان کو پورا کرنے کی خاطر شیخ علی اپنی زمین کا ایک اور ٹکڑا بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح جو رقم ملی، اس کا بڑا حصہ سوہوکار کا قرض اتارنے میں صرف ہو گیا۔ اس ساہوکار سے قرض لے کر ہی شیخ علی نے کاروبار شروع کیا تھا۔ جو تھوڑی بہت رقم بچی، اس سے شیخ علی نے دوبارہ کاروبار شروع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ اس کنبے کے تاریک دن شروع وہ گئے تھے۔ ممتاز بہت پریشان رہنے لگی۔ گھریلو اخراجات کی خاطر اس نے اپنے علاقے کے ایک شخص سے تھوڑی سی رقم قرض لی۔ لیکن اس کا دس فیصد ماہانہ سود ناقابل برداشت تھا۔ لہٰذا اس نے متبادل راہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔

شدید مالی مشکلات کے دنوں میں گرامین بنک کی ایک مقامی خاتون کارکن کی وساطت سے ممتاز کو اس بنک کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کو بتایا گیا کہ یہ بنک زمین سے محروم غریب لوگوں کو تیرہ فیصد سالانہ سود کی شرح سے قرض دیتا ہے۔ اس کو قرضہ حاصل کرنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر نے بڑی منت سماجت کے بعد ایک ساہوکار سے دس فیصد ماہانہ سود کی شرح پر قرض حاصل کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ بنک صرف تیرہ فیصد سالانہ سود پر قرض دے رہا تھا۔ چنانچہ بنک کی کارکن سے یہ معلومات حاصل کر کے ممتاز کو اپنی تاریک زندگی میں روشنی کی کرن دکھائی دینے لگی۔ اس نے سوچا کہ بنک سے قرضہ مل جائے تو وہ اپنے گھر میں ہی کوئی کاروبار شروع کر سکتی ہے۔ رات

MashalBooks.org

کو اس نے اپنے شوہر کے ساتھ اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی۔ ابتداء میں شیخ علی قدرے ہچکچا رہا تھا۔ تاہم ممتاز نے اس کو اپنے منصوبے کی تفصیلات بتا کر آمادہ کر لیا۔ بعدازاں ممتاز نے بنک کی کارکن سے رابطہ کیا اور بنک کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ یوں اس کو حوصلہ مل گیا۔ خود شیخ علی بھی اب پر جوش ہو گیا تھا۔ چنانچہ بعدازاں اس نے بھی بنک سے قرضہ لیا اور اپنا کاروبار دوبارہ شروع کیا۔

ممتاز اور اس جیسی دوسری خواہش مند عورتوں نے مل کر ایک گروپ بنا لیا۔ اس سلسلے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض عورتیں بنک سے قرضہ لینے سے ڈرتی تھیں۔ مگر ممتاز نے ان کے تمام وسوسے دور کر دیئے۔

گروپ سازی کے بعد چند روز بنک کے اصول وضوابط سیکھنے میں صرف ہو گئے۔ ممتاز کچھ عرصے تک گروپ کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہی۔ بعدازاں اس کو ایک ہزار روپے کا قرضہ مل گیا۔ اس رقم سے اس نے دھان صاف کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔ بازار سے وہ دھان خریدتی، چھان پھٹک کرتی اور پھر چاول بازار میں فروخت کر دیتی ہے۔ یوں اس کو کافی منافع مل جاتا۔ شیخ علی نے بھی بنک سے قرضہ لے لیا تھا۔ اس نے ہوزری کی دکان شروع کر دی تھی۔ میاں بیوی دونوں کمانے لگے تھے۔ ان کی مالی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی ہو گئی۔ ممتاز کبھی کبھی بچپن کی مسرتوں اور خوشحالی کو یاد کیا کرتی تھی۔ بلاشبہ وہ خوشیوں بھرے دن تھے۔ لیکن جو خوشی اس کو اب مل رہی تھی، وہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ تھی۔ فطری طور پر وہ اس پر نازاں تھی۔

میں ممتاز سے ملنے گیا۔ اس سے باتیں ہوئیں تو میں نے پوچھا کہ آیا اس کو گرامین بنک سے قرضہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری یا رکاوٹ تو پیش نہ آئی تھی؟ اس نے جواب میں کہا کہ مشکلات اس کو بنک میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں پیش آئی تھیں۔ ابتداء میں شیخ علی قرضہ لینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا بڑا بھائی ممتاز کے بنک جانے پر بھی رضا مند نہ تھا۔ اس کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ ممکن ہے کہ پڑوسیوں کو بھی یہ بات اچھی نہ لگتی ہو۔ لیکن ممتاز کو پڑوسیوں سے زیادہ شیخ علی کے بھائی کی فکر تھی۔ اصل میں لوگ اس قسم کی باتیں بنایا کرتے تھے کہ ”جو عورتیں بنک جاتی ہیں اور اجلاسوں میں شریک ہوتی ہیں، وہ عزت نفس سے محروم ہوتی ہیں۔“ باتیں بنانے میں ساہوکار سب سے آگے تھے جو ان لوگوں کو رقم دے کر ان کا خون چوسا

کرتے تھے۔

ممتاز خاموشی سے سب کچھ سہتی رہی۔ اس کو معلوم تھا کہ اگر اس نے ان لوگوں کی الزام تراشی کا جواب دیا تو بات بڑھ جائے گی۔ اس معاملے میں جو وہ بڑی محتاط اور معاملہ فہم تھی۔ پہلی بار جب وہ سنٹر لیڈر کے گھر میٹنگ میں شرکت کے لئے گئی تو پردے میں گئی تا کہ کوئی اس کو پہچان نہ سکے۔ یہ قصہ سناتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگی کہ ''میں اگر ان لوگوں کی باتوں میں آجاتی تو کبھی بھی یہ تھوڑا بہت پیسہ کمانے اور اپنے بچوں کے ساتھ مل کر باعزت زندگی گزارنے کے قابل نہ ہوتی۔

گرامین بنک سے قرض لینے کے لئے ممتاز نے سخت محنت کی تھی۔ خاندان اور معاشرے کی طرف سے پیدا کی ہوئی کئی رکاوٹیں اس کو پار کرنی پڑی تھیں۔ اب اسی جوش و ولولے کے ساتھ وہ قرض کی رقم کو استعمال کر رہی تھی۔ بنک فیلڈ مینجر اور دوسرے کارکنوں کی تمام ہدایات پر اس نے اچھی طرح عمل کیا تھا۔ کئی لوگ اس کی کاوشوں پر ہنستے تھے اور اس کے خلوص کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن جو اس کے دلی خیر خواہ تھے وہ اس کی ہمت بندھاتے تھے۔

آج کل ممتاز بیگم خوش باش زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے پاس دودھ دینے والی گائے ہے جو آمدنی کا اچھا وسیلہ ثابت ہو رہی ہے۔ یہ گائے اس نے دوسرے قرضے سے خریدی ہے۔ ایک ہزار روپے کا پہلا قرضہ وہ اتار چکی ہے۔ دوسری بار اس نے ڈھائی ہزار روپے قرض لئے ہیں۔ یہ ساری رقم اس نے گائے خریدنے پر صرف کر دی تھی۔ گائے دو سیر دودھ روزانہ دیتی ہے جس سے ممتاز کو دس بارہ روپے حاصل ہو جاتے ہیں۔ اوسطاً وہ ہر ہفتے ستر پچھتر روپے کا دودھ بیچ لیتی ہے۔ اس رقم کا بڑا حصہ قسط کی واپسی میں صرف ہو جاتا ہے۔ باقی رقم وہ اپنے کنبے پر خرچ کرتی ہے۔ دوسری طرف شیخ علی کا کاروبار بھی واقعی چمک اٹھا ہے۔ ان دونوں کی کمائی سے یہ لوگ اچھی بھلی زندگی گزار رہے ہیں۔ شیخ علی کا دل بھی کاروبار میں خوب لگ چکا ہے اور بیوی بچوں سے اس کی چاہت بھی بڑھ گئی ہے۔ ممتاز اس بات پر بھی بہت خوش ہے۔

مجھے ممتاز نے بتایا کہ اپنے گروپ میں سے اس کی آمدنی سب سے زیادہ ہے۔ وہ گروپ کے اجلاسوں میں بھی دوسروں سے زیادہ باقاعدگی سے شریک ہوتی ہے۔ صرف ایک

بار وہ غیر حاضر رہی تھی اور وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے والدین سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ پہلا قرضہ واپس کرنے پر اس کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی اور جدوجہد جاری رکھنے کا جذبہ بڑھ گیا تھا۔ اسی لئے اس نے دوسرے قرضے کے لئے درخواست دی۔ نئے قرضے کا ایک حصہ بھی وہ اتار چکی ہے۔ جب پوری رقم واپس کر دے گی تو وہ تیسری بار قرضہ لینے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں ممتاز نے بتایا کہ ''ہمارے علاقے میں چند ساہوکار ہیں جو بڑے بڑے سود پر لوگوں کو قرض دے کر مالدار ہو گئے ہیں۔ یہ ساہوکار گرامین بنک کی سرگرمیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس بنک کی وجہ سے گاؤں میں اب معمولی اجرت کے بدلے مشقت کرنے والے مزدور نہیں رہے۔ پہلے ہمارے ہاں بہت سے لوگ بے روزگار ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ اس بنک سے قرضے حاصل کر کے کوئی نہ کوئی کاروبار کرنے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غریب اور نادار لوگ اس بنک سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس سے نفرت کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ غریب بنک کے حامی ہیں اور اس کے قائم رہنے کی دعائیں مانگتے ہیں جب کہ ساہوکار چاہتے ہیں کہ یہ بنک ختم ہو جائے کیونکہ اس کی وجہ سے اب کوئی شخص ان سے دس فیصد ماہانہ سود پر رقم مانگنے نہیں آتا۔ لوگ تو اب ان کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ ممتاز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ '' اپنے خاندان کی بھلائی کے لئے جو امداد مجھے گرامین بنک سے ملی وہ کہیں اور سے نہ مل سکتی تھی۔ میں تو اس کی بہت ہی ممنون ہوں۔''

بارہا میں ممتاز کے گھر گیا ہوں۔ برہمن پارل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کی سطح کافی نیچی ہے۔ چنانچہ مون سون کے دنوں میں وہ ایک بڑی سی جھیل بن جاتا ہے۔ اس میں ایک بڑا سا باڑہ ہے جس میں کئی چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ شیخ علی کا کہنا ہے کہ اس میں 25 کنبے رہتے ہیں۔ گویا یہ شہری کچی آبادی جیسا ہے۔ البتہ گندگی اور تاریکی میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ تقریباً چھ سو افراد یہاں رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں تازہ ہوا اور روشنی کا گزر مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ صاف ستھرے ماحول کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس آبادی کے صرف چند گھرانے نسبتاً خوش حال ہیں اور وہ ٹین کی چھتوں والے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ممتاز بھی ایک ایسے ہی مکان میں رہتی ہے۔ اس کے پاس ایک اور جھونپڑی بھی ہے جس کو وہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتی ہے اور اپنی گائے بھی اسی میں رکھتی ہے۔ اس

جھونپڑی کے صرف دوطرف دیوار ہے۔ جب مینہ برستا ہے تو اندر کی ساری جگہ گیلی ہو جاتی ہے۔ یوں کھانے پکانے میں ممتاز کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ بھوسا مہنگا ہونے کے سبب وہ باقی دیواریں نہیں بنا سکی۔ تاہم اس کو امید ہے کہ جلد ہے وہ یہ کام کروالے گی۔

ٹین کی چھت والی جس جھونپڑی میں ممتاز اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس کے چاروں طرف دیوار ہے۔ کمرے کے ایک طرف بانس کا بنا ہوا تھڑا ہے جس پر ایک بانسی کی ٹوکری پڑی رہتی ہے۔ اس میں تقریباً آٹھ من دھان رکھا ہوا ہے جو شیخ علی کو شراکتی کاشت کاری میں حاصل ہوا تھا۔ کمرے میں ٹین اور مٹی کے چھوٹے موٹے برتن بھی ہیں۔ تیل اور دواؤں کی چند بوتلیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کونے میں مچھردانی بانس کے گرد لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ ممتاز فرش پر بچھی ہوئی تنکوں کی ایک چٹائی پر رات بسر کرتی ہے۔ تاہم اس نے چار پائی بنوانے کے لئے تھوڑی سی لکڑی خریدی ہے۔ کنبے کے اکثر کپڑے نئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع سے حال میں خریدے گئے ہیں۔ ممتاز نے چند مرغیاں اور بطخیں بھی پال رکھی ہیں۔

ان لوگوں کے پاس اب اس قدر وسائل ہیں کہ دن میں تین وقت چاول کھا سکیں۔ بسا اوقات وہ روٹی بھی کھاتے ہیں اور اکثر دودھ اور مچھلی استعمال کرتے ہیں۔ ممتاز کو خوردنی تیل، نمک اور مرچوں کے سوا کچھ خریدنا نہیں پڑتا۔ دھان کا سٹاک اس کے پاس موجود ہے۔ انڈے مرغیوں سے مل جاتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ دودھ بیچتے ہوئے اس کا کچھ حصہ اپنے کنبے کے لئے رکھ لیتی ہے اس کا بیٹا مچھلیاں پکڑ لاتا ہے اور سبزیاں وہ خود اگاتے ہیں۔

گزشتہ سال شیخ علی نے منافع کی رقم دھان کی کاشت پر صرف کی تھی۔ یوں اس کے حصے آٹھ من دھان آیا۔ ممتاز کے پاس کچھ نقد رقم ہے۔ کچھ اور رقم ہاتھ لگنے پر بڑی جھونپڑی بنوائے گی۔

مستقبل کے بارے میں ممتاز کے پاس کئی منصوبے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کو خوشی اور خوشحال دیکھنے کی آرزومند ہے اور اس مقصد کے لیے ہر ممکن جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے دو بچے اب تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اصل میں وہی اس کے مستقبل کے خوابوں کا محور ہیں۔

رابعہ کی زندگی

بھلوک کانڈی نامی گاؤں ٹنگائیل ضلع کے صدر تھانہ کی حدود میں واقع ہے۔ اس گاؤں کی ایک معمولی سی جھونپڑی میں رابعہ بیگم رہتی ہے۔ جنم سے اب تک اس نے بس رنج و الم ہی سہے ہیں۔ ہر گام پر اس نے مصیبتیں جھیلی ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طور زندہ رہنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس کی ساری زندگی دکھوں سے عبارت رہی ہے اور اب بھی دکھ ہی اس کا مقدر ہیں۔

رابعہ کی عمر چوبیس پچیس سال ہوگئی۔ دیکھنے میں ہوشیار اور پھرتیلی ہونے کا تاثر دیتی ہے۔ میرے ساتھ پہلی ملاقاتوں میں وہ شرماسی جایا کرتی تھی۔ بعد میں البتہ بے تکلف ہوگئی اور دل کی ساری باتیں سنا ڈالیں۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پان بھی چبایا کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ اس کی عادت ہے۔

رابعہ سنتوش کے قریب واقع رتھ باڑی نامی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ وہ 1957ء کا سال تھا۔ اس کے باپ عبدالعلی کی تھوڑی بہت زرعی زمین تھی۔ تاہم رابعہ کو صحیح طور پر علم نہیں کہ یہ زمین کتنی قدر تھی۔ عبدلعلی ایک بار شدید بیمار ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ علاج معالجے کے لئے اس نے اپنی ساری قابل کاشت زمین فروخت کر دی تھی۔ یہ بات بھی میں آپ کو بتادوں کہ عبدالعلی کو شادیوں کا بہت شوق تھا۔ یہ شوق پورا کرنے کے لئے اس نے دو چار نہیں بلکہ پوری سات شادیاں کی تھیں۔ اس کی پہلی تین بیویاں بے اولاد ہی مرگئی تھیں اور باقی تین کو اس نے طلاق دے دی تھی۔ رابعہ کی ماں عبدالعلی کی آخری بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے

MashalBooks.org

تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کو جنم دیا۔ رابعہ ان سب سے بڑی تھی۔ دوسرے نمبر پر حبیبہ ہے۔ بیٹا صغیر علی حبیبہ سے چھوٹا ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام خوشی ہے۔ خوشی جب ایک سال کی تھی تو عبدالعلی طویل عرصے تک تپ دق کا مریض رہنے کے بعد چل بسا۔ علاج کے لئے اس نے چونکہ ساری زمین بیچ ڈالی تھی، اس لئے آخری دنوں میں وہ بہت مفلس ہو چکا تھا۔ اس کی جائیداد میں سے بس ایک باڑی ہی بچی تھی۔

عبدالعلی کی وفات کے بعد سے اس کے بیوی بچوں کے لئے پوری دنیا اندھیری ہو گئی۔ مصیبتیں ہی مصیبتیں زندگی میں رہ گئیں۔ رابعہ کی ماں کی مدد کرنے والا کوئی خیر خواہ نہ تھا۔ عبدالعلی کا کوئی بھائی نہ تھا۔

دوسرے رشتے دار البتہ بہت سے تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی ان لوگوں کی خبر نہ لی۔ اس کے برعکس انہوں نے اس بیوہ کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ عبدالعلی گھر میں اتنی رقم بھی نہ چھوڑ گیا تھا جس سے ایک ہفتے کے اخراجات ہی پورے ہو سکتے۔ رابعہ کی ماں کو فاقے اور موت دکھائی دے رہی تھی۔ بھیک مانگ کر بھوکے بچوں کو دو وقت روٹی نہیں کھلائی جا سکتی۔ چنانچہ حالت یہ ہوگئی کہ کبھی اس کنبے کو نیم فاقے میں رہنا پڑتا اور کبھی دن میں ایک وقت کھانے پر گزارہ کرنا پڑتا۔ چھ ماہ اسی طور بسر ہو گئے۔ تب رابعہ کی ماں کو اچانک ہی احساس ہوا کہ لوگ اس کے خلاف سازش کا جال بن رہے تھے اور یہ سازشی عبدالعلی کے کزن تھے۔ انہوں نے گاؤں میں اس بیوہ کے بارے میں طرح طرح کے بے ہودہ قصے پھیلا رکھے تھے۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ تنگ آ کر یہ عورت گاؤں سے چلی جائے اور وہ اس کے باڑے پر قبضہ جما لیں۔ پہلے پہل تو وہ مقابلہ کرتی رہی۔ مگر اکیلی اور بے بس بیوہ ان شرارتی لوگوں کا آخر کتنی دیر سامنا کر سکتی تھی۔ چنانچہ جلد ہی وہ مجبور ہو کر بچوں کو ساتھ لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔

رابعہ کا ایک ہی ماموں تھا۔ وہ اپنی بہن کو دکھ درد میں مبتلا دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور اس نے اپنے گھر میں بہن اور بچوں کو رکھنے کا بندوبست کر دیا۔ لیکن اس کے اپنے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ وہ اس خاندان کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کی بیوی کو یہ بن بلائے مہمان ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ ہر روز رابعہ کی ماں کو برا بھلا کہتی۔ یہاں تک کہ ایک سال تک مسلسل لعن طعن سننے کے بعد وہاں رہنا ممکن نہ رہا اور رابعہ کی ماں نے وہ گھر

بھی چھوڑ دیا۔

بیوہ کے کنبے کے لئے یہ بہت ہی بے چارگی اور بے یقینی کے دن تھے۔ ان لوگوں کے پاس کوئی پناہ تھی اور نہ ہی کھانے کو کچھ تھا۔ جو تھوڑا بہت تحفظ پہلے حاصل تھا وہ بھی اب نہ رہا تھا۔ چنانچہ گلی گلی بھیک مانگ کر رابعہ کی ماں بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے جتن کرنے لگی۔ رات آتی تو وہ منتیں کر کے کسی کے باڑے میں پناہ لے لیتی۔ آخر کار اس کو کاگ ماری میں جگہ مل گئی۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی جس پر کوئی گھر تھا اور نہ ہی کوئی کمرہ۔ مگر یہ بھی غنیمت تھی۔ چنانچہ بچوں کے ساتھ مل کر بیوہ نے گھاس پھوس اکٹھی کی اور ایک جھونپڑی بنالی۔ اس میں وہ اپنی قابل رحم راتیں بسر کرنے لگی۔ دن کے وقت وہ بھیک مانگتی یا گاؤں والوں کے لئے دھان صاف کرتی۔ یوں اپنے دن کاٹنے لگی۔

اس مصیبت بھری زندگی میں ایک بار رابعہ شدید ٹائفائڈ بخار کی زد میں آگئی تھی۔ ان دنوں وہ اپنے ماموں کے ہاں رہ رہی تھی۔ سب لوگ اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، لیکن ماموں اس کو سنتوش کے ہسپتال میں لے گیا۔ کئی دن وہ ہسپتال میں رہی اور آخر کار تندرست ہوگئی۔

رابعہ نو سال کی ہوئی تو اس کی شادی ماموں زاد قدوس میاں سے کر دی گئی جو اس وقت اٹھارہ سال کا تھا۔ ماموں اب اس کا سسر بھی بن گیا تھا۔ اس کی کوئی زرعی جائیداد نہ تھی۔ وہ ایک غریب آدمی تھا اور شادی بھی بہت غریبانہ انداز میں ہوئی۔ شادی کے روز ماموں نے اس کو ایک معمولی ساڑھی دی اور اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا۔

شادی کے بعد تین سال تک رابعہ اپنے سسرال میں رہی۔ قدوس کوئی کام کاج نہ کرتا تھا۔ بس آوارہ گھومتا رہتا تھا۔ باپ نے اس کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قدوس کو اس کی پروا ہی نہ تھی۔ چنانچہ تنگ آ کر باپ نے اس کو علیحدہ کر دیا۔ قدوس کی عادتیں پھر بھی نہ بدلیں۔ کام اور محنت سے اس کی جان جاتی تھی اور گھر پر بھی وہ کم ہی رہتا تھا۔ یوں رابعہ بھوکوں مرنے لگی۔ ساس کبھی کبھار اس کو کھانے کے لئے کچھ دے دیتی، مگر اکثر اوقات اس کو بھوکا رہنا پڑتا۔ جب بھوک برداشت نہ ہوتی تو وہ رونے لگتی۔ سسرال جانے کے لئے ماں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ اس کے بدبختی کے دن ختم ہو گئے ہیں، لیکن ہوا یہ کہ اس کی حالت پہلے جیسی رہی۔ خوشیاں جیسے اس سے روٹھی رہ گئیں۔

MashalBooks.org

اب وہ ماں کے پاس واپس بھی نہ جا سکتی تھی۔ لہذا اس نے اسی گھر میں رہ کر سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کیا۔ کبھی کبھی وہ قدوس سے الجھ پڑتی۔ وہ پوچھتی ''تم روز کہاں جاتے ہو؟ اگر تم کھانے کو مجھے نہ دو گے تو اور کون دے گا؟'' قدوس کے پاس ان شکوؤں کا ایک ہی جواب تھا! ''تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں تو جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔''

اسی طور چھ ماہ گزر گئے۔ ایک روز قدوس رابعہ کو فلم دکھانے ٹنگائیل لے گیا۔ اس سے پہلے وہ اس قصبے میں کبھی نہ گئی تھی۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ قدوس اس کو فلم دکھانے لے آیا تھا۔ پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔

ٹنگائیل میں قدوس اس کو ایک بوڑھی عورت کے گھر لے گیا۔ رابعہ کے لئے یہ عورت بالکل اجنبی تھی۔ ایسی عورت اس نے زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ مگر وہ بوڑھی عورت مہربان اور ہمدرد تھی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ ''میرے ساتھ اس عورت کا سلوک بہت اچھا تھا۔ لیکن میرے دل میں کئی وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔'' چنانچہ رابعہ نے اپنے شوہر سے کہا ''اب چلیں۔ یہاں میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد اس عورت نے قدوس کو کچھ رقم دی رابعہ کو سارے معاملے کی کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ وہ کھوئی کوئی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھنے لگی۔ قدوس نے رقم جیب میں ڈالی اور باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے رابعہ سے کہا تم یہاں ٹھہرو۔ میں جا کر فلم کی ٹکٹ لے آتا ہوں۔ پھر تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔'' اس وقت کو یاد کرتے ہوئے رابعہ کہتی ہے کہ قدوس کے جانے کے بعد وہ خود کو بہت ہی بے بس محسوس کر رہی تھی۔ وہ خائف تھی اور پریشان بھی۔

تھوڑی دیر بعد وہی بوڑھی عورت آئی اور رابعہ سے کہنے لگی فکر نہ کرو اب تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔ رابعہ اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ وہ عورت سے پوچھنے لگی کہ اس کا شوہر کب تک واپس آ جائے گا۔ اس پر عورت نے جواب دیا ''تمہارا شوہر اب کیا لینے آئے گا؟ دیکھا نہیں کہ میں نے اس کو پیسے دے دیئے ہیں؟ میں نے یونہی اس کی مٹھی گرم کر دی ہے کیا؟'' رابعہ اب بھی کچھ نہ سمجھ سکی اس نے پوچھا۔ ''آپ نے اس کو پیسے کیوں دیئے ہیں؟''

بوڑھی عورت نے مختصر جواب دیا۔'' تم کچھ نہ سمجھو گی۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی اور باہر سے دروازے کو قفل لگا دیا۔

MashalBooks.org

آج بھی رابعہ ان واقعات کا ذکر روہانسی آواز میں کرتی ہے اور پھر آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتے ہیں۔ بولتے بولتے وہ چپ ہو جاتی ہے اور وقفے کے بعد پھر اپنی کہانی شروع کر دیتی ہے۔ خیر، جب دروازے پر تالہ ڈال دیا گیا تو رابعہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس نے دروازہ توڑ کر باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر یہ سب کچھ بے سود تھا۔ پھر وہ شوہر کو گالیاں دینے لگی۔ میں نے رابعہ سے اس بوڑھی عورت کی بابت پوچھا تو اس نے بتایا کہ جب وہ پہلی بار کمرے میں اس سے ملی تھی تو ملحقہ کمرے سے چند لڑکیاں اس کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے کچھ فحش اشارے کئے تھے۔ رابعہ نے پہلے کبھی کسی اچھی یا بری لڑکی کو اس قسم کے اشارے کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس نے جان لیا کہ یہ لڑکیاں واقعی بہت بری ہوں گی۔ تبھی وہ اس قسم کی حرکتیں کر رہی تھیں۔ بعد ازاں اس نے ایسی کئی اور لڑکیاں پڑوس میں دیکھیں۔ ان کے ناز و انداز اور گھٹیا اشاروں سے آخر کار رابعہ نے جان لیا کہ وہ سب طوائفیں ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی خوف کی ایک کپکپی اس کے بدن میں پیدا ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی اور اپنے مستقبل پر غور کرنے لگی۔

کافی دیر بعد وہی نائکہ چند لڑکیوں کے ہمراہ کمرے میں آئی۔ لڑکیاں بازاری قسم کی زبان میں اس سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ کہنے لگیں کہ ''پریشان ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ تمہارا شوہر تمہیں ہمارے ہاں بیچ گیا ہے۔ اب تمہیں یہیں رہنا ہے، کوئی تمہیں یہاں سے لے جا نہیں سکتا۔ اگر تم یہاں سے جاتی بھی ہو تو معاشرہ تمہیں کسی طور پر قبول نہ کرے گا۔ لہٰذا تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہمارے ساتھ رہنے پر تیار ہو جاؤ اور جو ہم کہتی ہیں وہی کرو۔''

ان بہت سی لڑکیوں نے رابعہ کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ ایک نے اسے دودھ کا کپ دیا۔ مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ وہ تو بس اس مکان سے نکلنا چاہتی تھی۔ بار بار ان کی منتیں کرتی۔ ''مجھے یہاں سے جانے دو۔'' اس پر بوڑھی عورت آگ بگولا ہو گئی۔ ''کس جہنم میں جانا ہے؟'' سیدھے منہ دودھ پی لو، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔'' رابعہ پر اس دھمکی کا اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے مزاحمت کی تو عورت اور لڑکیوں نے اس کو دبوچ لیا اور زبردستی دودھ اس کے منہ میں ڈال دیا۔ رابعہ کو اس کا ذائقہ عجیب سا محسوس ہوا۔ چند ہی لمحے بعد رابعہ کو اپنا سارا جسم بوجھل محسوس ہونے لگا۔ سر تیزی سے گھومنے لگا اور پھر اس کو یاد نہیں کہ بعد میں

کیا ہوا۔

ہوش آیا تو رابعہ نے دیکھا کہ اندھیرا ہو چکا ہے۔ رات آ چکی ہے۔ بوڑھی عورت نے لیمپ جلا رکھا تھا اور اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ایک آدمی اس عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ رابعہ کو ہوش میں دیکھ کر عورت نزدیک آئی اور بالوں سے پکڑ کر اس کو بستر سے گھسیٹ لیا۔ وہ اس کو دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں لڑکیاں نہاتی دھوتی اور بناؤ سنگھار کرتی تھیں۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ رابعہ نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ باہر اس کو نظر آیا کہ کئی لڑکیاں مردوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھیں۔ بعض جوڑے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ گانے بجانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر رابعہ زور زور سے رونے لگی۔ اس پر وہ عورت اندر آئی۔ اس نے پکڑ کر رابعہ کا منہ دھلوایا اور واپس کمرے میں لے گئی جہاں وہ مرد ابھی تک موجود تھا۔ عورت نے مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رابعہ سے کہا ''آج سے تم ان صاحب سے گانا اور ناچنا سیکھو گی۔''

اس واقعہ کے کئی روز بعد تک سادہ لوح رابعہ نے آس لگائے رکھی کہ قدوس لوٹ آئے گا اور ا کو ساتھ لے جائے گا۔ مگر اسے آنا تھا نہ آیا۔ اس کے دل میں شوہر کے خلاف نفرت پلنے لگی۔ وہ اپنے مقدر کو برا بھلا کہتی۔ لیکن اس نے حالات سے سمجھوتہ بھی شروع کر دیا تھا اور بوڑھی عورت کی ہدایات پر عمل کرنے لگی تھی۔

یوں رابعہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ دو ڈھائی مہینے میں اس نے چند رقص سیکھ لئے اور گانے بھی۔ اب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر پڑوس کے چکر لگانے لگی تھی۔ بوڑھی نائکہ نے اس کو اس نئے پیشے کے ضروری نکات بھی سمجھا دیئے۔ چنانچہ اب وہ گاہکوں کو خوش کرنے لگی تھی۔

ہر روز رابعہ کو مختلف قسم کے گاہکوں سے پالا پڑتا تھا۔ مجھے اس نے بتایا کہ جس روز اس کے پاس زیادہ گاہک آتے، اس کی کمائی بھی کافی ہو جاتی۔ اس روز نائکہ بھی زیادہ خوش ہوتی اور دوسروں سے زیادہ اس کا خیال رکھتی۔ وہ رابعہ کو زیادہ گاہک پھنسانے کے گر بتاتی۔ لیکن آمدنی کم ہوجاتی تو نائکہ کا موڈ بھی بگڑ جاتا اور جلی کٹی سنانے لگتی۔ میں نے رابعہ سے اس کے پیشہ کے بارے میں چند سوالات کیے۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے مجھے بتایا کہ اس پیشے کو کبھی اس نے دل سے قبول نہیں کیا۔ ہر لمحہ وہ اپنے آپ کو پنجرے میں

MashalBooks.org

بند پنچھی محسوس کرتی اور آزادی کی تمنا کرتی۔ مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالنے والا نہ تھا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں بھاگ جانے کا خیال آتا مگر اس کو خوب معلوم تھا کہ کوئی ایسی پناہ گاہ نہیں جو اس کی منتظر ہو۔ کوئی شخص یہاں سے نکلنے کے بعد اس کو قبول نہ کرے گا۔ یوں اس کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔

بازارحسن میں یونہی تین سال بیت گئے۔ تب نائکہ اچانک شدید بیمار پڑ گئی۔ رابعہ اس کو اماں، پکارا کرتی تھی۔ وہ گلہڑ کی پرانی مریض تھی اور اب مرض شدید ہو گیا تھا۔ پہلے اس کو معمولی علاج سے آرام آجایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار وہ بے حد لاغر اور بے بس ہو گئی۔ اس کو مرزا پور ہسپتال لے جایا گیا لیکن اس ہسپتال میں اس مرض کے علاج کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔ لہٰذا رابعہ اس کو گھر واپس لے آئی اور ایک ڈاکٹر کو بلایا، اس کے علاج سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ ایک روز اس نے رابعہ کو بلایا۔ اس وقت وہ رو رہی تھی۔ رابعہ آئی تو کہنے لگی ”میں جانتی ہوں کہ میں چند روز کی مہمان ہوں میں یہ وصیت کرنا چاہتی ہوں کہ مرنے کے بعد یہ باڑہ اور یہ جھونپڑی تمہیں مل جائے۔“ رابعہ نے فوراً ہی وصیت تیار کروا دی۔ بوڑھی عورت نے زندگی بھر کی بچت بھی رابعہ کے سپرد کر دی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ اگرچہ بوڑھی نائکہ کے پاس جو کچھ بھی تھا، وہ اس کو مل گیا تھا، پھر بھی اس کو بوڑھی عورت کی موت پر بہت افسوس ہوا اور وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر تنہا محسوس کرنے لگی۔ اس نے نائکہ کی آخری رسومات ادا کیں اور غریبوں میں خیرات بانٹی۔ ایک ہفتے تک وہ اس کا سوگ مناتی رہی اور اپنا کاروبار بند رکھا۔

ایک پولیس آفیسر اکثر رابعہ کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس کا نام حامد تھا۔ حامد نے کئی بار اس سے شادی کی درخواست کی، مگر وہ انکار کرتی رہی۔ وہ کئی بار رابعہ کو فریب دیا کرتا تھا۔ تاہم انکار کی وجہ محض یہ تھی کہ رابعہ کو مردوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اس کے میاں نے دھوکہ دے کر اس کو شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ کسی اور مرد پر اعتماد کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ رابعہ کو یہ احساس بھی تھا کہ حامد اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کا مال ہتھیانے کے لئے شادی کا ڈھونگ رچانا چاہتا ہے۔ وہ اس سے سب کچھ چھین کر اس کو باہر اٹھا کر پھینکے گا۔ یوں اس کو دوبارہ اسی گلی میں آنا پڑے گا۔

چند ماہ بعد ایک اور گاہک نے شادی کی پیش کش کی۔ وہ بھی ایک عرصے سے

باقاعدگی سے اس کے پاس آتا رہا تھا۔ وہ رابعہ سے باتیں کرتا اور اس کی زندگی کے بارے میں جاننے کا آرزومند رہتا تھا۔ پہلے پہل تو رابعہ نے اس کو کچھ نہ بتایا۔ اصل میں وہ اس گاہک کے بارے میں اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسی اثنا میں رابعہ نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں اور پھر ایک روز اپنے متعلق سب کچھ اسے سنا ڈالا۔ اس نے ایک بار پھر شادی کی پیش کش کی، مگر رابعہ نہ مانی۔ وہ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسے پتہ چلا کہ اس کا نام نورالحق ہے اور وہ کاگماری کالج میں طالب علم ہے۔ اب وہ روزانہ آنے لگا تھا اور شادی کے قصے چھیڑ دیتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا کہ ''لگتا ہے رابعہ تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ مگر خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔'' اس نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ اس کے بعد رابعہ انکار نہ سکی۔ چنانچہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ نورالحق اب اس کا شوہر ہے اور وہ شوہر کے ساتھ معمول کی ازدواجی زندگی گزار رہی ہے۔

مجھے رابعہ نے بتایا کہ نورالحق کے ساتھ شادی کے روز ہی بازارحسن سے اس کا دل بری طرح اچاٹ ہوگیا۔ وہ وہاں سے نکلنے کے لئے تڑپنے لگی۔ شادی کے تقریباً ایک ماہ بعد اس نے وہ گھر چھ ہزار روپے میں بیچ ڈالا۔ بوڑھی نائکہ سے اس کو ایک باڑہ بھی ورثے میں ملا تھا۔ رابعہ نے اس کا قصہ بھی نمٹا دیا اور قاضی پور میں اپنے شوہر کے گھر منتقل ہوگئی۔

نورالحق کے والدین، دادی اور دیگر اہل خانہ شادی کو قبول کرنے پر راضی نہ تھے۔ لیکن گاؤں کے دوسرے لوگ نورالحق سے بہت ڈرتے تھے۔ چنانچہ چند دوستوں کی مدد سے وہ اپنی دلہن کو گھر لے گیا اور گاؤں کے کسی شخص نے زبان کھولنے کی جسارت نہ کی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ چند سال پہلے وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل رہا تھا۔ تب سے دیہاتی اس سے ڈرا کرتے تھے۔

نورالحق کے گھر میں ایک ماہ رہنے کے بعد میاں بیوی نے قاضی پور میں زمین کا ایک پلاٹ خرید لیا۔ نورالحق کا باپ اپنے رشتے داروں کی وجہ سے اب اس کو مزید برداشت کرنے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے بیٹے اور بہو کو گھر چھوڑنے کو کہہ دیا تھا۔ ان دونوں نے پلاٹ پر اپنی جھونپڑی ڈال لی اور وہیں رہنے لگے۔ رابعہ جن دنوں اپنے سسرال میں رہی تھی پولیس نورالحق کو قابو کرنے کے لئے اکثر چھاپے مارا کرتی تھی۔ وہ ہاتھ نہ آتا تو پولیس اس

کے باپ، دادا اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بدسلوکی کرتی۔ اس وجہ سے بھی نورالحق کے باپ نے اس کو نکالا تھا۔

رابعہ اور اس کا میاں نئی جگہ منتقل ہو گئے تو چند روز بعد پولیس نے چھاپہ مار کر نورالحق کو گرفتار کر لیا۔ اس کو بری طرح پیٹا گیا۔ رابعہ نے پولیس کو ایک ہزار روپیہ رشوت دے کر شوہر کو چھڑایا پولیس افسر حامد چند روز بعد دوبارہ آ گیا اور اس نے نورالحق سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ رابعہ کو طلاق نہ دے گا، اس کو نجات نہیں ملے گی۔ نورالحق ہٹ کا پکا تھا۔ اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس بار بھی پولیس سے چھڑوانے کے لئے رابعہ نے تقریباً ایک ہزار روپے خرچ کر ڈالے۔ اب گاؤں والے دلیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے نورالحق کے باپ سے کہا کہ وہ پولیس کے پے در پے چھاپوں اور رابعہ کے اکیلے تھانے جانے کے سبب اپنے بیٹے کو عاق کر دے اور گاؤں سے نکال دے۔ یوں باپ اور دادا نے مجبور ہو کر نورالحق اور رابعہ کو گاؤں سے نکال دیا۔ رابعہ کے لئے یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس پر پھر سے مایوسی طاری ہونے لگی تھی اور زندگی میں سیاہی پھیلتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس عالم میں دونوں میاں بیوی نے کاگ ماری میں رابعہ کی ماں کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

اسی اثنا میں رابعہ کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ نیا شوہر رابعہ کے باپ کا دور کا رشتے دار تھا۔ نورالحق اور رابعہ تقریباً دو ہفتے ماں کے پاس رہے۔ پھر رابعہ کی سوتیلے باپ سے ان بن ہو گئی۔ اس نے رابعہ کی ماں کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ رابعہ اور اس کے شوہر کو گھر سے نکالنا چاہتا تھا لیکن ماں رکاوٹ بنی رہی تھی۔ رابعہ اور اس کے شوہر سے یہ بات برداشت نہ ہوئی کہ ان کے سبب اس غریب عورت کی شامت آئے۔ لہٰذا انہوں نے کاگ ماری سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

بعد ازاں نورالحق نے بھلوک کانڈی نامی گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ رابعہ سے میں نے پوچھا کہ انہوں نے گھر کیسے خریدا۔ اس نے جواب دیا کہ شادی کے بعد جب وہ قاضی پور روانہ ہوئی تھی۔ تو اس کے پاس کل پندرہ ہزار روپے تھے۔ اس نے اس رقم میں سے قاضی پور میں زمین خریدی تھی اور گھر بنوایا تھا۔ پولیس کو رشوت بھی وہ اسی رقم سے دیتی رہی تھی۔ تین ہزار روپے کا اس نے شائیکل رکشہ خرید لیا تھا تا کہ کرائے پر دے کر آمدنی کا وسیلہ بن سکے۔ اس آمدنی پر آج کل وہ گزارہ کر رہے ہیں۔

کانڈی میں گھر بنانے کے لئے انہوں نے ٹین کی پانچ چادریں پانچ سو روپے میں خریدیں۔ دروازے کھڑکیاں دونوں نے مل کر خود ہی لگالی تھیں البتہ دیواریں کھڑی کرنے کے لئے انہوں نے ڈیڑھ سو روپے مزدوری ادا کی تھی۔ یوں یہ جھونپڑی مکمل ہوگئی اور دونوں اس میں منتقل ہو گئے۔

مجھے رابعہ نے بتایا کہ اس نئے گھر میں دونوں ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ ان کو یہ دھڑکا نہیں ہے کہ کوئی ان کو یہاں سے نکال دے گا۔لیکن مصیبتیں زندگی میں اور بھی ہیں۔ چنانچہ رابعہ اوراس کے میاں کو یہاں آئے ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ نورالحق معدے کی بیماری میں مبتلا ہوگیا۔شروع میں گاؤں کے حکیم نے اس کا علاج کیا۔مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ مرض بڑھتا ہی گیا۔ رابعہ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھی، مگر جیب خالی تھی۔ روز بروز نورالحق کی حالت بگڑنے لگی۔ آخر کار رکشا دو ہزار سات سو روپے میں بکا اور اس رقم سے نورالحق کا علاج شروع ہوا۔ ایک ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا اور ڈیڑھ ماہ بعد اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ چھ ماہ اور گزر گئے اور کوئی راہ ان کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ ان کے لئے روزمرہ کے اخراجات پورا کرنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ اس عالم میں نورالحق نے بہت کام تلاش کیا۔مگر کہیں بات نہ بنی۔تنگ آ کر اس نے سائیکل رکشہ چلانے کا فیصلہ کر لیا۔مگر رابعہ اس پر راضی نہ تھی۔ اس نے میاں سے کہہ دیا کہ ’’تمہارے رکشہ چلانے سے بہتر ہے کہ میں بھوکی مر جاؤں۔‘‘ غفور میاں نامی ایک ہمسائے سے رابعہ کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ ٹھیکیدار تھا اور رابعہ اس سے نورالحق کو ملازمت دلوانے کو کہا کرتی تھی غفور میاں نے وعدہ کیا تھا کہ جونہی اس کو موقع ملا وہ نورالحق کو ملازمت دلوا دے گا۔

رابعہ نے فریدہ نامی ایک بچی کو گود لے رکھا تھا۔ چنانچہ اب خاندان تین افراد پر مشتمل تھا اور تینوں فاقے کر رہے تھے۔ رابعہ کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔فریدہ اس کو گلی میں پڑی ملی تھی۔ اس نے فریدہ کو قبول کر لیا تھا اور اپنی بیٹی کی طرح پرورش کرنے لگی۔ بھوک اور افلاس کے ان دنوں میں چھ سات سالہ فریدہ بھی بھوک سہ رہی تھی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ اس کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ یہ بچی بھی مصیبت میں مبتلا تھی اور دو وقت کا کھانا بھی اس کو میسر نہ تھا۔ خیر روکھی سوکھی اور فاقوں پر وہ لوگ گزارا کرتے رہے۔کوئی رشتہ دار ان کا ایسا نہ تھا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں ان کی مدد کرتا یا جس سے وہ کچھ ادھار

لے سکتے۔

دکھ درد کے ایسے ہی ایام میں ایک پڑوسی کی وساطت سے رابعہ کو گرامین بنک کے بارے میں علم ہوا۔ بعد میں وہ بنک کی چند خاتون کارکنوں سے ملی جنھوں نے اس کو بنک کے قواعد وضوابط اور پالیسیوں کے متعلق بتایا۔ شروع میں رابعہ کو اس امر کا یقین نہ آرہا تھا کہ حکومت غریب لوگوں کو بھی قرضے دے سکتی ہے۔ چنانچہ خود کو یقین دلانے کی خاطر اس نے بنک کے افراد سے ایک بار پھر رابطہ کیا۔ جب اس کو پوری طرح یقین ہو گیا تو اس نے گروپ بنانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ جلد ہی اس کی کوششیں رنگ لائیں اور اس کا گروپ وجود میں آ گیا۔ لیکن گروپ کی ہفتہ وار بچت میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے رابعہ کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ تین دن وہ فاقے سے رہی۔ پھر اس نے ناک کا چھلا تیس روپے میں بیچ ڈالا۔ اس رقم سے اس نے تھوڑا سا آٹا اور چاول خریدے اور سات روپے گروپ فنڈ میں دے دیئے۔

گاؤں کے بعض بزرگوں کو رابعہ کا بنک آنا جانا پسند نہ آیا۔ انہوں نے رابعہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہنے لگے ''بے شرم عورت تم کو حیا بالکل نہیں آتی۔ تم نے دوسری معصوم لڑکیاں بھی خراب کر دی ہیں۔ اب تم نے بنک کا رخ کیا تو ہم تمہیں گاؤں سے ہی نکال دیں گے۔''

رابعہ کو اس روز کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ بھوکی شیرنی کی طرح وہ ان لوگوں کے سامنے ڈٹ گئی۔ کہنے لگی، ''تم معاشرے کے چوہدری بنے ہوئے ہو، لیکن جب میں اور میرا کنبہ بھوک سے بلبلاتا ہے تو تم کہاں ہوتے ہو، کیا تم نے کبھی ہماری خبر لی ہے۔ میں صبح سے بھوکی ہوں لیکن تمہیں اس سے کیا۔ میری بات غور سے سن لو، جب میں بنک جاتی ہوں، تو تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہارے خلاف کوئی جرم کیا ہے۔ لیکن دوسرے دیہات کی عورتیں بھی بنک جانے لگی ہیں۔ تو پھر میرا قصور کیا ہے۔''

رابعہ سارا دن روتی رہی۔ مگر ہار اس نے نہ مانی۔ اس واقعہ کے دو ہی روز بعد وہ اپنے گروپ کے ساتھ بنک گئی۔ گروپ کی ارکان نے اس کو اپنا چیئر مین بنالیا تھا اور گروپ سازی کی تمام شرائط پوری ہو گئی تھیں۔

چند روز بعد رابعہ کو پندرہ سو روپے کا قرض مل گیا۔ اس رقم سے اس نے فوراً ہی

MashalBooks.org

چاول کا کاروبار شروع کر دیا۔ نورالحق ٹنگائیل جا کر اس کے لئے چاول خرید لاتا اور وہ گھر بیٹھ کر چاول بیچنے لگی۔ ہر ہفتے وہ سات آٹھ من چاول بیچ لیتی ہے اور یوں اس کو تقریباً ڈیڑھ سو روپے کا منافع مل جاتا۔

رابعہ نے مجھے بتایا کہ تمام پڑوسی اس سے چاول خریدتے ہیں۔ گاؤں میں وہ پہلی تھی جس نے یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ ہفتے میں سات آٹھ من چاول فروخت کرنے کے علاوہ اس کو تین خالی بوریاں بھی مل جاتی تھیں جس کو وہ بیچ دیتی تھی۔ یوں وہ اپنی ہفتہ وار قسط سے دگنی رقم واپس جمع کروانے لگی۔ اس طرح اپنا قرض اس نے 52 ہفتوں کے بجائے صرف 26 ہفتوں میں لوٹا دیا۔

رابعہ نے مجھے بتایا کہ اس کاروبار کے سبب اب وہ اپنے کنبے کے لئے روزانہ چاول اور مچھلی خرید سکتی ہے۔ تاہم وہ ایسا نہیں کرتی اس کا استدلال یہ ہے کہ بنک کی رقم واپس کرنے کے بعد ہی وہ خوراک پر زیادہ رقم خرچ کیا کرے گی، تب تک وہ روکھی سوکھی پر ہی گزارہ کرے گی۔

پہلا قرض لے کر رابعہ نے جو کاروبار شروع کیا تھا، اس سے حاصل ہونے والے منافع سے اس نے سات سو روپے کی ٹین کی چادریں خریدیں۔ خالی بوریاں بیچ کر اس کو پانچ سو روپے ملے اور اس رقم میں سے اس نے ساڑے چار سو روپے کا ریڈیو خرید لیا۔ بڑے فخر کے ساتھ اس نے مجھے ریڈیو دکھایا۔ علاوہ ازیں اس نے ایک ساڑھی اپنے لیے اور فریدہ کے لئے چند کپڑے بھی خریدے ہیں۔

ٹین کی چادریں اس نے اپنی جھونپڑی کشادہ کرنے کی خاطر خریدی تھیں۔ کاروبار چونکہ وہ گھر پر ہی کرتی تھی، اس لئے زیادہ گنجائش کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں وہ ہفتے بھر کے چاول کا سٹاک نہیں رکھ سکتی تھی۔

نئی چادریں نصب کرنے کے بعد رابعہ کے پاس اب کافی جگہ بن گئی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ اب اس کے پاس دو کمرے ہیں۔ ایک کو وہ سونے کے کمرے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اس میں ایک چارپائی ہے۔ میاں بیوی اسی چارپائی پر سوتے ہیں جب کہ فریدہ تنکوں کی بنی ہوئی چٹائی پر سوتی ہے۔ چارپائی کے ساتھ ہی ایک میز رکھی ہوئی ہے۔

اس پر چند خالی بوتلیں اور ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ فرش پر چند برتن بھی دکھائی دیتے

MashalBooks.org

ہیں۔ ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا ٹرنک پڑا ہے۔ اس میں ایک پرانی ساڑھی ہے اور چند دوسرے کپڑے بھی ہیں۔

رابعہ نے جو دوسرا قرضہ گرامین بنک سے لیا ہے، وہ تین ہزار روپے کا ہے۔ یہ رقم اس نے چاول کے کاروبار میں لگائی ہے۔ تاہم منافع کی شرح پہلے جیسی نہیں رہی۔ بات یہ ہے کہ اس گاؤں کی کئی عورتوں اور مردوں نے بھی بنک سے قرض لے لیا ہے اور ان میں سے کئی لوگوں نے یہی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ رابعہ کی فروخت کم ہو گئی ہے اور منافع بھی۔

دوسرا قرضہ ملنے سے پہلے ہی رابعہ کے شوہر نورالحق کو غفور میاں ٹھیکیدار نے ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ ہر ہفتے پچاس ساٹھ روپے لے آتا ہے، یوں آمدنی کا ایک اور وسیلہ بن گیا ہے اور ان لوگوں کی تکالیف قدرے کم ہو گئی ہیں۔

رابعہ مجھ سے کہنے لگی کہ اب وہ اچھی بھلی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو روٹی کپڑے کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ دوسرے قرضے کی وہ سات اقساط واپس کر چکی ہے اور کہتی ہے کہ قسطوں کی ادائیگی اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرے قرضے کی ادائیگی کے بعد وہ مزید قرضہ لینے کے خواب دیکھ رہی ہے اور کہتی ہے کہ تیسرے قرضے سے وہ دودھ دینے والی گائے خریدے گی۔ میں نے گائے کی دیکھ بھال کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ خود دیکھ بھال کرے گی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ ”گائے کے لئے میں اپنے ہاتھوں سے گھاس کاٹ سکتی ہوں۔“

ایک سوال میں نے ازدواجی زندگی کے بارے میں کر دیا۔ پل بھر کے لئے رابعہ شرما سی گئی۔ پھر اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کیفیت میں کہنے لگی کہ ان کی ازدواجی زندگی پہلے خوشیوں سے بھرپور ہوا کرتی تھی۔ میاں اس سے بہت پیار کرتا تھا اور ہر وقت اس کا خیال رکھتا تھا۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس کے رویے بدل رہے ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے اب وہ ہاتھ بھی اٹھانے لگا ہے۔ نورالحق کا دادا بھی زندہ ہے۔ سنا ہے کہ وہ لوگوں سے کہتا پھرتا ہے کہ اگر نورالحق رابعہ کو طلاق دے کر واپس آ جائے تو وہ اس کی شادی کروا دے گا اور تھوڑی بہت زمین بھی دے گا۔

اس بات نے رابعہ کا سکھ چین چھین رکھا ہے۔ وہ کئی وسوسوں کا شکار ہے۔ ڈرتی

ہے کہ کسی روز شوہر اس کو چھوڑ جائے گا۔ گہرے تاسف کے ساتھ اس نے کہا کہ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ باقی ماندہ زندگی اس کے ساتھ گزار دیتی۔ بیٹا حاصل کرنے کی خاطر وہ مقامی حکیم سے علاج کروا رہی ہے اور آپریشن کروانے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔ ساتھ ہی وہ ملامت کے انداز میں یہ بھی کہتی ہے کہ ''اگر نورالحق مجھے چھوڑ گیا تو میں اپنی بد بخت زندگی خود ہی ختم کر دوں گی۔''

خیر، بدقسمتی کے یہ سائے زندگی کے ایک رخ کو پیش کرتے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ سنٹر لیڈر کی حیثیت سے رابعہ تمام ارکان کے ساتھ باقاعدہ رابطے رکھتی ہے۔ خیر و عافیت پوچھنے کے لئے وہ ان کے ہاں جاتی رہتی ہے۔ ارکان کو ہفتہ وار اقساط یاد دلاتی ہے اور اس بات کا دھیان رکھتی ہے کہ کسی کی قسط رہ نہ جائے۔ سنٹر کی ارکان اس سے ڈرتی ہیں۔ مگر اس سے محبت بھی کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شروع میں گاؤں کے جن بزرگوں نے قرضے مسئلے پر ناک بھوں چڑھائی تھی، ان کی کئی رشتہ دار عورتوں نے بھی قرضے کے لئے درخواستیں دیں اور رابعہ نے ان کی مدد کر کے ان کو قرضے دلوائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ان بزرگوں کا رویہ بدل جائے گا۔

رابعہ محض اپنی خوشیوں کی متمنی نہیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن حبیبہ اور بھائی صغیر علی کا بھی خاص خیال رکھتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے رابعہ اور اس کے شوہر نے حبیبہ کی شادی ایک سائیکل رکشا چلانے والے سے کروادی تھی۔ صغیر علی بھی ان دنوں ایسا ہی رکشا چلاتا ہے۔ اس نے رابعہ یا اس کے شوہر کو بتائے بغیر ہی اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ رابعہ کو اس بات کا بہت دکھ ہوا تھا۔ رابعہ کی سب سے چھوٹی بہن خوشی سے اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ رابعہ اس کی شادی کرنے کی فکر میں ہے۔ وہ اکثر اپنی ماں سے ملنے بھی جایا کرتی ہے۔

میں نے گروپ فنڈ کی بابت پوچھا تو رابعہ نے بتایا کہ یہ رقم ہنگامی ضروریات کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ وہ اس رقم کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ تاہم جب یہ رقم کافی ہو جائے گی تو وہ اس کو کسی کاروبار لگا دے گی۔

رابعہ سے مل کر میں واپس آنے لگا تو اس نے کہا کہ ''اب مجھے کھانے اور دوسری چیزوں کی فکر نہیں رہی۔ گاؤں میں ہر کوئی مجھے اچھا سمجھتا ہے۔ البتہ شوہر کی طرف سے مجھے خدشہ ہے'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔

MashalBooks.org

دکھوں کی بیٹی

کوثری کی ساری زندگی رنج والم سے عبارت ہے۔کبھی اس نے خوشی اورمسرت کا ذائقہ نہیں چکھا۔اب بھی اس کا کوئی گھر نہیں اور وہ اپنے باپ عظمت علی کے ساتھ چٹ واڑی میں رہتی ہے۔ یہ ٹنگائیل ضلع میں مرزا پور تھانہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔عظمت علی کا باڑا اٹھائیس مرلے پر پھیلا ہوا ہے۔ دور سے دیکھئے تو یہ باڑہ مزاروں کی کچی آبادی نظر آتا ہے۔ اس میں کئی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ہیں ان جھونپڑیوں میں کوثری کا بوڑھا باپ،سوتیلی ماں، تین سوتیلی بہنیں، دو بھائی اور ان کی بیویاں،کوثری کی پانچ سگی بہنیں اور وہ خود رہتی ہے۔ شوہر نے جب اس کو طلاق دی تھی تو وہ سیدھی یہاں چلی آئی تھی۔ باپ کی زمین کے ایک کونے میں اس نے تقریباً پندرہ فٹ لمبی جھونپڑی ڈالی اور پھر وہیں رہنے لگی۔

یہ مٹی اور تنکوں کی بنی ہوئی جھونپڑی ہے، آپ اندر جائیں تو کوئی فرنیچر دکھائی نہ دے گا۔ جب میں پہلی بار اس سے ملنے گیا تو کوثری نے میرے لئے زمین پر کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھائی ۔کمرے کے ایک کونے میں ایک چٹائی پڑی تھی۔اور پر دوگندے سے لحاف اورایک میلا چکنا تکیہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں تین بڑے تھیلے دکھائی دیئے۔جن میں دھان بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں چند برتن بکھرے ہوئے تھے۔لکڑی کے ایک ٹکڑے پر ایک چوبی بکس او ر پولی تھین میں لپٹے ہوئے چند لحاف پڑے تھے۔ایک ساڑھی اور بلاوز دیوار سے لٹک رہا تھا۔ یہ کوثری کی کل کائنات تھی۔

32سالہ کوثر کی زندگی دکھ درد او رذلت کی کہانی ہے۔ ایک افلاس زدہ گھرانے

میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور غربت اس کی دائمی ساتھی بن گئی تھی۔ عظمت علی نے خود بھی کبھی اچھے دن نہ دیکھے تھے۔ یہی حال کوثری کے دادا عبدالعلی کا تھا۔ وہ اسی علاقے کے ٹالینا نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ عظمت ابھی چار سال کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یوں بچپن سے ہی اس کی مصیبتیں شروع ہو گئیں۔ سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی ڈولاں سے ہو گئی جو اس وقت دس کی تھی۔ وہ چٹ واری گاؤں کے شرافت علی کی بیٹی تھی۔ شادی کے بعد عظمت سسرال میں رہنے لگا۔ مرتے وقت اس کا سسر تھوڑی سی زمین چھوڑ گیا اور جب عظمت علی کو سسر کی جگہ لینی پڑی تو چاروں طرف مایوسی کے اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی تمام چیزیں ساٹھ روپے میں اپنے بھائیوں کے پاس فروخت کر دیں اور اس رقم سے پرچون کا کاروبار کرنے لگا۔ وہ گلی گلی پھیری لگاتا اور کسی نہ کسی طور دال روٹی کے پیسے کما لاتا۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ پھر 1949ء میں اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ یہی کوثری بیگم تھی جسے باپ کے دکھوں کا وارث بننا تھا۔ عظمت علی کے گھر چھ اور بچے پیدا ہوئے جن میں دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ اس کے گھر کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، لیکن آمدنی وہیں کی وہیں تھی۔ چنانچہ حالات بدتر ہوتے چلے گئے۔ کبھی ایک وقت کھانے کو مل جاتا اور کبھی پورا دن فاقہ میں گزرتا تھا۔ تنگ آ کر عظمت علی نے اپنی آدھی زمین فروخت کر دی۔ اب اس کے پاس صرف 28 مرلے اراضی رہ گئی تھی۔

کسی کو معلوم نہیں کہ آیا بچپن میں کوثری غربت کا رونا رویا کرتی تھی یا نہیں تاہم مجھے اس نے بتایا کہ ہوش سنبھالنے پر اس نے اپنی محرومیوں کو مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ جس عمر میں کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے سکولوں کا رخ کرتے ہیں، کوثری اس عمر میں پڑوسیوں کے کام کاج کر کے اپنی روزی حاصل کرنے لگی تھی۔ اس کے افلاس زدہ گھر میں تعلیم کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ پھر بھی اس نے ماں سے قرآن مجید پڑھنا سیکھ لیا۔ اس کے بہن بھائی بھی تعلیم سے محروم رہے تھے۔ البتہ کوثری کی بہن ماں سے قرآن مجید پڑھا کرتی تھیں۔ جب کہ بیٹوں نے باپ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ اب وہ دستخط کر سکتے ہیں اور تھوڑی بہت بنگالی بھی پڑھ لیتے ہیں۔

کوثری کی چار اور بہنیں ہیں۔ والدین ان سب کی شادیوں اور جہیز کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ کوثری کا باپ اکثر آہ بھر کر کہا کرتا تھا ''خدا ہی جانتا ہے کہ میری بیٹیوں کے

مقدر میں کیا لکھا ہے۔'' کبھی کبھی وہ خاصا پر امید ہو جاتا اور کہتا ''ہاں خدا کبھی تو مہربان ضرور ہوگا۔'' چنانچہ ایک بار جب عظمت علی کی ایک دور کی رشتہ دار عورت کا خاوند کوثری کے لئے رشتہ لایا جس نے جہیز کی مانگ نہ کی تھی تو عظمت علی نے خدا کی رحمت خیال کیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس غریب کو کیا خبر تھی کہ یہ رشتہ اس کی بیٹی کے لئے دائمی عذاب بن جائے گا۔

کوثری کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اس کا شوہر جلال بیس برس کا جوان تھا۔ جلال کہارنا گاؤں کا رہنے والا تھا جو چت سواری گاؤں سے تقریباً چار میل دور واقع ہے۔ جلال کا باپ عبدالعلیم کھاتا پیتا آدمی تھا۔ سات ایکڑ سے زیادہ اس کی زرعی اراضی تھی۔ ایک زمانے میں وہ بڑی خوش باش زندگی گزار رہا تھا۔ مگر اس کی خوشیاں عارضی تھیں۔ اس کی بیوی دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ کر اس جہاں سے کوچ کر گئی تھی۔ یوں عبدالعلیم کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس نے دوبارہ شادی کر لی اور اس سے خاندانی امن چین لٹ گیا۔ عبدالعلیم کی نئی بیوی بڑی لڑاکا تھی۔ گھر میں ہر وقت جھگڑا فساد رہنے لگا۔ مجبور ہو کر جلال باپ سے الگ ہو گیا اور گزارے کے لئے تیس روپے ماہوار پر ہمسایوں کے گھر نوکری کرنے لگا۔ چار سال اس نے یونہی دوسروں کی خدمت میں گزار دیئے۔ اس دوران پانچ سو روپے اس نے جمع کر لئے۔ تب اس نے اپنے گھر کے لئے زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا۔ بعد میں اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ اپنی زمین پر ایک جھونپڑی ڈالی اور اجرت پر مزدوری کرنے لگا۔ باپ کی طرف سے اس کو زمین میں کوئی حصہ نہ ملا۔

گھر بنانے کے بعد جلال شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ عظمت علی کا سالا جو رشتہ لے کر آیا تھا وہ جلال کا ہی تھا۔ چنانچہ عظمت علی اور جلال کے باپ کے درمیان صلاح مشورے ہوئے اور طے یہ پایا تھا کہ آئندہ سوموار کو کوثری کو جلال کے گھر لے جایا جائے گا، جہاں دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ اس مقررہ دن کو جلال کا باپ چچا، بہنوئی اور اس کے دو دوست کوثری کے گھر آئے اور اس کو ساتھ لے گئے، کوثری کا کوئی بہنوئی نہ تھا، لہٰذا اس کا ایک بھائی اور ایک بہن اس کے ساتھ گئے۔ شام کے تقریباً آٹھ بجے وہ لوگ جلال کے گھر پہنچے۔ پھر شادی کی رسمیں ادا کی گئیں اور رات گیارہ بجے تک یہ رسمیں ختم ہو گئیں۔ کوثری کو اب تک یاد ہے کہ اس رات چاروں طرف گلابی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

شادی کی خوشی میں جلال کے دوست پٹاخے چلا رہے تھے۔ پیا کے گھر پہنچ کر تیرہ

سالہ دلہن خوشیوں بھرے مستقبل کے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ 1962ء کا واقعہ ہے۔ لیکن ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ یہ سارے خواب بکھر گئے۔ بے عزتی اور تشدد اس کا مقدر بن گئے۔ کوثری کی شادی کے نو ماہ بعد اس کی ماں مرگئی تھی اور اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ جلال جب بھی سسرال جاتا، وہ محسوس کرتا کہ وہاں اس پر توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عزت کی جاتی ہے۔ اس بات پر وہ سخت ناراض ہوتا اور کسی نہ کسی طور کوثری کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا۔ چنانچہ وہ بیوی کو پیٹنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اس کو مجبور کرتا کہ وہ باپ سے جا کر جہیز لائے۔ شادی کے مذاکرات کے وقت جلال کی طرف سے جہیز کا کوئی مطالبہ نہ کیا گیا تھا۔ اب وہ ایک دستی گھڑی۔ ایک بائیسکل اور ایک ریڈیو کا مطالبہ کرنے لگا تھا۔ کوثری باپ کے گھر جاتی مگر ہر بار خالی ہاتھ لوٹ آتی۔ اس پر جلال کا غصہ بڑھ جاتا۔ وہ پہلے سے زیادہ تشدد پر اتر آتا۔

روتے ہوئے کوثری نے مجھے یہ سارا قصہ سنایا۔ وہ کہتی ہے کہ ''خدا نے بڑا کرم کیا ہے۔ اب میں پہلے سے زیادہ خوش ہوں'' کوثری کی ازدواجی زندگی کے چار سال اسی طور گزر گئے تھے۔ پھر 1966 میں اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام باچومیاں رکھا گیا۔ اس بچے کی پیدائش سے پہلے یا بعد میں کوثری کسی جسمانی مسئلے کا شکار نہ تھی۔ تاہم شوہر کا تشدد جاری تھا۔ جب وہ پانچ ماہ کی حاملہ تھی تو جلال نے اس کو چھڑی سے پیٹا تھا۔ مار اس قدر شدید تھی کہ وہ برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہوگئی تھی۔ پھر اس کے سر پر کافی دیر پانی ڈالا گیا تو اس کو ہوش آیا۔

ان دنوں کوثری کا خیال تھا کہ جب وہ ماں بن جائے گی تو اس کے مصائب ختم ہو جائیں گے۔ جلدی وہ ماں بن گئی۔ مگر اس کی آس پوری نہ ہوئی۔ اس مایوسی کے عالم میں چھ ماہ اور بیت گئے۔ پھر ایک روز جلال نے کوثری کے بچے سمیت جہیز مانگنے کے لئے باپ کے گھر بھیج دیا۔ جاتے ہوئے اس نے تنبیہ کر دی ''کہ بائیسکل، ریڈیو اور گھڑی کے بغیر یہاں واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔'' غریب عظمت علی اپنے داماد کی یہ فرمائشیں پوری نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بیٹی کو پاس رکھ لیا۔ چھ ماہ اور گزر گئے تو لوگوں کی لعن طعن سے مجبور ہو کر جلال بیوی بچے کو لینے آ گیا۔ یہاں ہم یہ بتا دیں کہ سسرالی عزیزوں کے ساتھ کوثری کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مگر وہ لوگ الگ رہتے تھے۔

جلال نے اب ایک نئی فرمائش شروع کر دی تھی۔ اب وہ کوثری سے کہنے لگا کہ اس کی ماں جو زمین کا ٹکڑا چھوڑ گئی ہے۔ وہ کوثری کو ملنا چاہئے۔ کوثری اس پر رضا مند نہ تھی۔ چنانچہ جلال کو مارنے پیٹنے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ یہاں تک کہ کوثری کے جسم پر تشدد کے اب تک بعض نشان موجود ہیں۔ 1968ء میں کوثری نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام مامون رکھا گیا۔

جلال کی عمر بڑھتی گئی مگر اس کے رویے جوں کے توں رہے۔ وہ بیوی کو دو وقت اچھا کھانا تو نہ دے سکتا تھا، مگر مارتا پیٹتا بری طرح تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ درشت ہوتا جا رہا تھا اور کوثری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

جلال ایک دن کام پر جاتا اور پھر تین دن گھر بیٹھا رہتا۔ کئی بار کوثری اور اس کے بچوں کو کھانے کے لئے کچھ بھی نہ ملتا۔ تنگ آ کر وہ جلال کے چچا کے گھر ملازم ہو گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ وہ ابوالحسین کے گھر کا سارا کام کرتی۔ یوں اس کو دو وقت کی روٹی اور ایک سیر چاول معاوضے کے طور پر مل جاتے۔ اس طرح وہ اپنے گھر کا نظام چلانے لگی۔ جلال البتہ اب بھی خوش نہ تھا۔ بغیر سبب کے ہی وہ چھڑی سے بیوی کو پیٹتا، دو تین طمانچے مار دیتا، اور کچھ نہیں تو گالیاں ہی بکنے لگتا۔ آخر کار 1971ء میں کوثری نے اس ذلت ناک زندگی کو مزید برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس نے شوہر کا گھر چھوڑ دیا اور باپ کے پاس چلی گئی۔ تقدیر کی سختی پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ کوثری اور اس کے بچوں کو دیکھ کر اس کی سوتیلی ماں آگ بگولہ ہو گئی۔ وہ اپنے خاندان پر مزید تین افراد کا بوجھ برداشت کرنے پر ہرگز آمادہ نہ تھی۔ ذلتیں اور لعن طعن کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ صرف ساتھ روز بعد کوثری اس گھر کو بھی خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئی۔

یہی وہ موڑ تھا جہاں سے کوثری کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ وہ بے بس تھی اور خوف زدہ بھی۔ مگر اس نے تمام مصیبتوں کا جرات مندی سے مقابلہ کرنے اور اپنے حالات بہتر بنانے کا تہیہ کر لیا۔ وہ امیر پڑوسیوں کے گھروں میں طرح طرح کے کام کرنے لگی کہیں وہ دھان صاف کرتی، کہیں مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی اور دوسری گھریلو خدمات سرانجام دینے لگی۔ بدلے میں اس کے بچے پلنے لگے۔ کوثری باقی زندگی بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بھائیوں نے مداخلت کی۔ انہوں نے بچوں کو جلال کے پاس واپس بھیجنے کا

مشورہ دیا۔ وہ کہتے کہ ان بچوں کو پالنا تیری حماقت ہے، کیونکہ جونہی وہ ہوش سنبھالیں گے باپ کے پاس بھاگ جائیں گے۔ کوثری نے بھائیوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بچوں کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان کو ظالم اور بے پروا باپ کے پاس بھیج سکتی ہے۔

دو ماہ بعد کوثری کے چھوٹے بھائی بچوں کو زبردستی باپ کے پاس چھوڑ آئے۔ دوسری طرف ہوا یہ کہ اس دوران میں جلال نے دوسری شادی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کی نئی زندگی میں ان بچوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

باپ کے گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جلال کی بے رحمی تہذیب وشائستگی کی تمام حدود پار کر گئی تھی۔ ایک دن وہ چھوٹے بچے کو ساتھ لے کر مرزا پور گیا اور اس کو وہیں ایک گلی میں بے یارومددگار چھوڑ آیا۔ کوثری سے بھی اس نے اپنی اس ظالمانہ حرکت کا ذکر نہ کیا۔ بعد میں سنا گیا کہ ایک سائیکل سوار بچے کو گلی سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ کوثری نے یہ بات دوسروں کی زبانی سنی تھی۔ بڑے بیٹے کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی برتاؤ کیا۔ مگر کسی کو معلوم نہیں کہ وہ اس بچے کو کہاں پھینک آیا تھا۔ پوچھنے پر وہ مختلف لوگوں کو مختلف باتیں بتاتا۔

کوثری پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹی۔ پاگلوں کی طرح وہ دو سال تک اپنے بچوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔ علاقے کا کونہ کونہ اس نے چھان مارا۔ اپنی زندگی کی اس بدترین بدقسمتی کا مجھ سے ذکر کرتے ہوئے وہ زاروقطار رونے لگی۔ میں نے تسلی دینا چاہی۔ مگر الفاظ اتنے مہیب دکھوں کے روبرو بے معنی ہوا کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگی کہ ''آپ میرا دکھ کیسے محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر کہ ماں سے بچے بچھڑ جائیں تو اس پر کیا گزرتی ہے؟'' ہمارے ملکوں میں بھوک اور غربت سے عاجز آ کر بچوں کو بیچ ڈالنا کوئی انہونی بات تو نہیں، مگر جلال کو کیا مجبوری تھی؟ وہ اپنے ہی بچوں کے ساتھ اس قدر بے رحمی سے کیونکر پیش آ سکتا تھا؟ دو برس تک بچوں کی تلاش میں ماری ماری پھرنے کے بعد ایک روز کوثری اپنے باپ کے گھر لوٹ آئی۔ وہ پھر سے پڑوسیوں کی خدمت کرنے لگی۔ پہلے کی طرح دوبارہ اس کو دو وقت کی روٹی اور ایک سیر چاول ملنے لگے۔ چاول وہ گھر لے جاتی اور سنبھال کر رکھنے لگی، چھ ماہ بعد اس نے چاول فروخت کئے اور پھر ہاتھ آنے والی رقم سے دوسو روپے خرچ

کر کے باپ کی زمین پر اپنے لئے ایک جھونپڑی بنوالی۔مٹی کی دیواریں اس نے خود بنائی تھیں جھونپڑی بن گئی تو وہ اس میں رہنے لگی۔

اب کسی اور شے کی کوثری کو پروانہ رہی تھی۔مستقبل اس کے لیے تاریک تھا۔لہٰذا اس نے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی ترک کر دیا تھا۔بہنیں اور بھائی اس کی تھوڑی بہت مدد کرنے لگے تھے۔بچت کی تھوڑی سی رقم اس کے پاس تھی جو ایک سال میں ختم ہوگئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ قحط کے برسوں میں اس کو بہت سی تکالیف سہنی پڑیں۔خاص طور پر 1974ء کے قحط کے دن بہت بھاری گزرے۔پورا گاؤں ہی اس ہولناک قحط سے متاثر ہوا تھا۔کوثری کو کہیں کو کام نہ مل رہا تھا اور ان دکھ بھرے دنوں میں کام دینے والا رہا بھی کون تھا۔یوں اکثر اوقات کوثری کو فاقے سے رہنا پڑتا۔وہ جنگلی سبزیاں اور بوٹیاں لے آتی اور ان پر گزارہ کرتی۔کبھی کبھی سرکاری امدادی مراکز سے تھوڑا بہت آٹا بھی مل جاتا،مگر وہ ضرورت کے مقابلے میں بہت کم ہوتا تھا۔وہ پورا سال کوثری کے لئے ایک ڈراؤنے خواب جیسا تھا۔

اپنی تمام تر محرومیوں اور ضرورتوں کے باوجود کوثری نے کبھی کسی سے سود پر قرض نہ لیا تھا۔اور نہ کبھی تین سیر سے زیادہ چاول ادھار لئے تھے البتہ گرامین بنک کا رکن سے پہلے اس نے اپنے گاؤں کے مرزا نامی ایک شخص سے دھان کی فصل اگانے کے لئے دوسو روپے قرض لئے تھے اس رقم کا سود دس روپے ماہوار تھا۔تین ماہ میں اس نے یہ قرض سودسمیت ادا کر دیا تھا۔اس کے چھوٹے بھائی قدوس نے بھی مرزا سے اسی سود پر قرض لیا تھا۔دو ماہ بعد اس نے بھی قرض بمعہ سود ادا کر دیا۔گرامین بنک کے کسی افسر یا اہل کار کو اس بات کی خبر نہ ہوئی۔

1979ء کے اواخر میں گرامین بنک پراجیکٹ کی ایک برانچ ہاتو بانگا میں قائم ہوئی۔کوثری کے گاؤں کے رہائشی قاسم ماسٹر نے اس کے متعلق کوثری کو بتایا کہ ''گرامین بنک نے ہاتو بانگا میں ایک شاخ کھولی ہے۔یہ بنک غریبوں کو قرضے دیتا ہے۔'' کوثری اس روز اپنے گھر میں دھان صاف کر رہی تھی وہ کہنے لگی مگر مجھے کون قرضہ دے گا؟ میرا شوہر ہے نہ بچے ہیں میں سرکاری قرض کیسے واپس کر پاؤں گی۔'' چنانچہ اس روز کوثری نے یہ خبر نظرانداز کر دی۔لیکن جب گاؤں میں تین ماہ کے عرصے میں عورتوں کے تین گروپ بن گئے تو کوثری بھی قرضہ لینے کے بارے میں سوچنے لگی۔وہ تذبذب کے عالم میں تھی اور کوئی فیصلہ نہ کر پاتی

تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ رقم اس سے گم ہوسکتی ہے یا پھر غلط طور پر استعمال بھی ہوسکتی ہے۔ لوگ بھی اس کو ڈراتے تھے۔ وہ کہتے کہ اگر تم قرض واپس نہ کر سکیں تو بنک والے تمہیں جیل میں ڈال دیں گے۔

اس قسم کے خوف کوثری کو اپنا کوئی گروپ بنانے سے روکتے رہے۔ انہی ایام میں زبیدہ نامی گاؤں کی ایک عورت اس کے پاس آئی اور تجویز پیش کی کہ اگر کوثری اس کا ساتھ دے تو وہ گروپ بنا سکتی ہے۔ زبیدہ اور اس کی ساتھیوں نے کوثری کی ہمت بڑھائی اور اس کو بتایا کہ بنک سے قرضہ لے کر وہ ایک بکری خرید سکتی ہے اور یہ کہ یہ اس روپے کی ہفتہ وار قسطوں میں رقم واپس کر سکتی ہے۔ تب کوثری نے اس سارے معاملے پر اپنے باپ سے بات کی۔ بھائیوں اور چند پڑوسیوں کے ساتھ بھی اس نے مشورہ کیا۔ سب نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈر پھر بھی اس کے دل سے نہ نکلا۔

ایک روز پڑوس کے ایک گھر میں گروپ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ زبیدہ کوثری کو اجلاس میں شرکت کے لئے لینے آئی۔ مگر وہ ہچکچا رہی تھی۔ زبیدہ نے ہمت نہ ہاری اور وہ زبردستی اس کو وہاں لے گئی۔ اس اجلاس میں زبیدہ اور کوثری کے علاوہ رابعہ، رضیہ اور زرینہ بھی موجود تھیں۔ دوسرے روز رضیہ کے باپ نے اس کو آئندہ کسی اجلاس میں جانے سے منع کر دیا۔ باپ کا کہنا تھا کہ اجلاسوں میں جانے والی لڑکیاں پردے کا خیال نہیں رکھتیں اور یہ بہت بری بات ہے۔ رضیہ کے نکلنے کے بعد مریم، زیتون، چن خاتون، عذرا بیگم اور شاہدہ کو گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ان سب نے مل کر گروپ بنا لیا اور کوثری کو اس کی چیئر مین منتخب کر لیا۔ مقامی سکول میں ان عورتوں کو سات روزہ تربیت دی گئی اس دوران ان کو بنک کے طریقے کار اور اصولوں سے اگاہ کیا گیا اور اپنے دستخط کرنا بھی سیکھایا گیا۔ 21 مارچ 1980ء کو بنک نے اس گروپ کو منظور کر لیا اور اس کے ایک ماہ بعد کوثری کو ڈپٹی سینئر لیڈر منتخب کر لیا گیا۔

ان عورتوں کی تربیت سات روز تک جاری تھی۔ لیکن کوثری بنک کے قواعد وضوابط جلد ہی بھولنے لگی اور بعد میں اس نے ایک ورک کیمپ میں ٹریننگ سیشن میں شرکت کی یوں اس کی قواعد وضوابط پر گرفت مضبوط ہوگئی۔ اب وہ ان کو خوب سمجھتی ہے۔ سینئر لیڈر کی غیر حاضری میں وہی اجلاسوں کو کنڈکٹ کرتی ہے۔ وہ گروپ کی دیگر ارکان کے اخراجات پر نظر

رکھتی ہے اور دیکھتی ہے کہ کہیں وہ رقم ضائع نہ کر دیں۔ نئے قرضوں کی تجاویز تیار کرنے میں کوثری سینٹر لیڈر کی معاونت کرتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے سے متعلقہ قرضوں کی تجاویز خود ہی تیار کرتی ہے۔ اگر کوئی گروپ شیڈول کے مطابق قرضوں کی واپسی میں ناکام رہتا ہے تو وہ اس کے ارکان کو وقت کی پابندی کرنے کو کہتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ کوثری جو ایک زمانے میں بے بس عورت تھی، ہر کوئی اس پر ترس کھاتا تھا، وہ اب ایک کامیاب دیہی خاتون لیڈر بن گئی ہے۔ وہ خود اس شاندار تبدیلی سے کافی حد تک بے خبر ہی ہے۔

کوثری کو اس کے گروپ میں سب سے پہلے قرضہ ملا تھا۔ چونکہ اس کو خدشہ تھا کہ وہ زیادہ رقم واپس نہ کر سکے گی اور یوں اس کے لئے مصیبتیں اٹھ کھڑی ہوں گی لہٰذا اس نے صرف تین سو روپے کا قرض مانگا تھا۔ اس رقم سے وہ ایک بکری خریدنا چاہتی تھی۔ یہ قرض اس کو مل گیا تھا۔ گروپ بنانے کے دوران یا بعد میں قرضہ لینے پر کوثری کو گاؤں کے بزرگوں کی طرف سے کسی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی جب رقم اس کے ہاتھ میں آئی تو دل دھڑکنے لگا اور کئی وسوسے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ چنانچہ اس نے رقم اپنے پاس رکھنے کے بجائے باپ کے پاس رکھوا دی تھی۔ تین روز بعد اس کا باپ ہاتو بانگا بازار گیا تھا اور وہاں سے بکری اور اس کا بچہ 275 روپے میں خرید لایا تھا۔ باقی رقم اس نے کوثری کو دے دی۔ بکری کے آجانے سے کوثری کے روز مرہ معمولات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ بدستور پڑوسیوں کے گھروں میں کام کاج کرتی رہی۔ کام پر وہ بکری کو ساتھ لے جاتی اور اس کو کسی قریبی درخت کے ساتھ باندھ دیتی۔ کبھی کبھی بکری کو گھاس کے میدان میں لے جاتی کام کے دوران وقفہ ملتا تو وہ خود سبز پتے اکٹھے کر کے اپنی بکری کو کھلاتی۔ یوں وہ اس کی خوب دیکھ بھال کر رہی تھی۔ روزانہ مشقت کے بعد عام طور پر اس کو سیر چاول ملا کرتے تھے۔ وہ ان کو بیچ کر قسط ادا کرنے کے لئے رقم جمع کر لیتی۔ بنک سے تعلق بننے کے بعد کوثری نے بچت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ پھر یہ ہوا کہ اس کی بکری بیمار رہنے لگی۔ ان دنوں وہ اپنے جانور کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کر سکی۔

میں نے کوثری سے سوال کیا تھا کہ اس نے بڑی رقم قرض لے کر، دوسروں کی ملازمت کرنے کے بجائے، خود اپنا دھان صاف کرنے کا کاروبار شروع کیوں نہیں کیا۔ وہ کہنے لگی کہ وہ یہ کام کر تو سکتی تھی، لیکن اس کے لئے دھان خرید کر کون لاتا اور کون اس کے

MashalBooks.org

لئے چاول بیچا کرتا؟ خیر جب بکری تندرست نہ ہوئی تو کوثری نے ڈیڑھ سو روپے میں اس کو بیچ ڈالا۔ اس کو یاد ہے کہ یہ واقعہ جولائی کے مہینے میں پیش آیا تھا۔ بکری کا بچہ ابھی اس نے اپنے پاس ہی رکھا۔ پھر اس نے محفوظ الدین سے زمین کا ایک ٹکڑا پٹے پر لیااور ڈیڑھ سو روپے میں بانس خرید کر اس کے گرد جنگلا بنوایا۔ اس زمین میں اس نے لیما پھلیوں کے پودے لگائے۔ جب یہ فصل تیار ہوئی تو ساڑھے چھ سو روپے میں بک گئی۔ ایک سیر پھلیاں دو سے پانچ روپے تک بک رہی تھیں۔

اس تجربے سے کوثری کے دل میں کئی آرزوئیں پیدا ہوگئیں اور نئے امکانات سامنے آئے۔ اس نے تھوڑی بہت زمین خریدنے کے ارادے باندھنے شروع کر دیئے چنانچہ اس نے بکری کا بچہ بھی ڈیڑھ سو روپے کے عوض بیچ دیا اور گروپ فنڈ سے دو سو روپے ادھار لئے۔ اس ماہ زرینہ اور زبیدہ نے بھی اس فنڈ سے دو دو سو روپے ادھار لئے تھے، خیر، کوثری کے پاس اب ایک ہزار روپے اکٹھے ہو گئے تھے، چھ سو پچاس روپے کے پھلیوں کی فروخت سے ڈیڑھ سو روپے بکری کے بچے کے عوض اور دو سو روپے گروپ فنڈ سے ملے تھے۔ اس رقم سے اس نے جبار نامی ایک ہمسائے کی زمین گروی پر حاصل کر لی۔ ایک ٹیوب ویل کے پانی سے اس زمین کو سیراب کرنے کا بندوبست کیا۔ اس زمین پر کاشت کاری کے مجموعی اخراجات 254روپے ہوئے۔

زمین گروی پر حاصل کرنے کے بعد کوثری کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ گروپ فنڈ سے اس کو مزید ادھار مل سکتا تھا اور نہ ہی گرامین بنک سے فوری طور پر دوسرا قرضہ حاصل ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں کوثری نے دھان کی فصل اگانے کی خاطر گاؤں کے ایک ساہوکار سے دو سو روپے ادھار لئے اس پر سود کی شرح دس فی صد ماہوار تھی۔ اس رقم سے اس نے ایک دستی ہل، بیج اور کھاد خریدی۔ تقریباً تین ماہ بعد اس کو اس زمین سے تقریباً ساڑھے پانچ من دھان حاصل ہوا جس میں سے دو من اس نے 208 روپے کا فروخت کر دیا۔ پھر اس نے ساہوکار کو تین ماہ کے سود کے ساتھ پوری رقم ادا کر دی۔ اس اثناء میں وہ گرامین بنک کا قرضہ بھی اتار چکی تھی۔ جب اس نے خاصا منافع کمایا تو اس کو احساس ہوا کہ اس بنک سے قرضہ لینے والے جیل نہیں جاتے بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ کوثری نے دوسرے قرضے کے لئے درخواست دی۔ 5 فروری 1981ء کو اس کو سات سو روپے مالیت کا

دوسرا قرضہ مل گیا۔ اس رقم سے اس نے 670 روپے کا بچھڑا خریدا۔ گھروں میں محنت مزدوری کر کے اس نے جو بچت کی تھی، اس میں سے سو روپے وہ قسط کے طور پر ادا کر چکی ہے۔

کوثری گروپ کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے جاتی ہے۔ گروپ اور سنٹر کے ساتھ اس کے تعلقات بہت ہی اچھے ہیں۔ البتہ ایک بار اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا اور وہ تین ہفتوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ ان ایام میں وہ تین اجلاسوں سے بھی غیر حاضر رہی تھی۔ وہ دو ہفتے کی قسطیں بھی ادا نہ کر سکی تھی۔ تاہم اس نے تیسرے ہفتے کی قسط زبیدہ کے ہاتھ بھجوادی تھی۔

میں نے کوثری سے پوچھا کہ اگر کوئی گرامین بنک کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو اس کو ساتھیوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ کہنے لگی کہ ''ہم آٹھ سو عورتوں نے اس بنک سے امداد لی ہے۔ ہم سب مل کر ایسی کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ ہم حکومت سے بھی درخواست کریں گی کہ اس بنک کی حفاظت کی جائے۔'' میں نے دوبارہ اس سے پوچھا کہ کسی ایسی کوشش کو روکنے کی خاطر وہ لوگ کیا قدم اٹھائیں گی۔ اس نے جواب دیا کہ ''ہم سب سنٹر کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوں گی۔ سنٹر کی اقساط واپس کریں گی اور اس بات کو یقینی بنائیں گی کہ سنٹر کی ارکان بنک کے مفاد کو نقصان نہ پہنچنے دیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب اس معاملے میں پرخلوص ہیں۔ اس لئے بنک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔'' قدرے توقف کے بعد کوثری نے دوبارہ کہنا شروع کیا کہ ''اس بنک کے قرضوں سے ہمارا مقدر سنور گیا ہے۔ جن کے پاس پہلے ایک بھی مویشی نہ تھا، اب ان کے آنگن میں دو دو جانور بندھے ہیں۔ جن کو پہلے ایک وقت کی روٹی نصیب نہ تھی۔ وہ اب دو وقت عزت کی روٹی کھا رہے ہیں اور اپنے اپنے گھر بنا رہے ہیں۔'' میں نے کوثری سے ایک اور سوال یہ کیا کہ آیا وہ کسی ایسے شخص کو جانتی ہے جو گرامین بنک سے نفرت کرتا ہو؟ اس نے جواب دیا ''ابتداء میں لوگ سہمے ہوئے تھے۔ لیکن اب ان کو حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ ہاں جب کبھی مزدوروں کی قلت ہو جاتی ہے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں یہ قلت بنک کی پیدا کی ہے۔''

کوثری کو کھانے پکانے کا کام خود نہیں کرنا پڑتا۔ وہ جن گھروں میں کام کرتی ہے، وہیں اس کو کھانے کو مل جاتا ہے۔ جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو کئی دن سے اس نے کھانا نہیں پکایا تھا۔ گزشتہ ایک سال میں اس نے اپنے منافع سے دو ساڑھیاں خریدی ہیں۔ ایک

کی قیمت 150 روپے ہے اور دوسری کی 80 روپے ہے۔ اس نے 30 روپے کا ایک بلاوز خریدا تھا اور 20 روپے کا ایک پیٹی کوٹ بھی بنوایا تھا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ گرامین بنک کے قرضے سے کوثری کی صرف مالی حالت تبدیل نہیں ہوئی بلکہ اب اس کے رویے بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے وہ ہر وقت سہمی سہمی سی رہا کرتی تھی۔ اس کا شوہر تھا نہ بچے اور نہ ہی کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا تھا۔ وہ بیمار پڑتی تو کوئی دوا دارو لانے والا اور تیمار داری کرنے والا نہ تھا۔ لیکن اب وہ خود کے بے بس اور غیر محفوظ محسوس نہیں کرتی۔ گروپ کی ارکان اس کی ہمدرد ہیں اور وہ اس کا خیال رکھنے والی ہیں۔ پہلے وہ دوسروں کی نوکری کرتی تھی اور دوسرے لوگ بھی اس کو ملازمہ ہی خیال کرتے تھے۔ لیکن اب اس کے پاس پیسے ہیں۔ ضرورت کے وقت لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں اور وہ ان کے کام آتی بھی ہے۔ بنک سے قرضہ لئے بغیر وہ یہ مقام کسی طور حاصل نہ کرسکتی تھی۔

کامیابیوں کی بنا پر کوثری نے مستقبل کے لئے ایک شاندار منصوبہ بنایا ہے۔ ہر سال وہ اپنی جھونپڑی کی مرمت پر رقم خرچ کرتی رہی ہے، لیکن اب وہ ٹین کی چھت والا مکان بنانے کا ارادہ کر رہی ہے جس میں وہ باقی ماندہ زندگی چین سے گزار سکے گی۔ وہ تھوڑی بہت زرعی زمین خریدنے کا بھی سوچ رہی ہے تا کہ بڑھاپے میں اس کو خوراک کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کوثری کا ارادہ یہ ہے کہ جب موجودہ قرض اتر جائے تو وہ بنک سے ڈھائی ہزار روپے کا ایک اور قرضہ لے گی اور اس سے ایک گائے خریدے گی۔ اپنے موجودہ منافع سے وہ رہن پر مزید زمین حاصل کرنے کا بھی سوچ رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا اب اس کا نیا گھر بسانے کا کوئی ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ''جب پہلے شوہر نے ہی ساتھ نہ دیا تو پھر دوسری شادی کا کیا کروں گی۔ میرا شوہر میری پرواہ نہ کرتا تھا۔ میرے بچے خدا جانے کہاں ہیں۔ ان کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔ میرے لئے موجودہ کیفیت ہی بہتر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

کوثری کے ان کہے رنج والم اور خوف بنگلہ دیش کی دیہی ان پڑھ عورتوں کی بے بسی کی تصویر ہیں۔ ان کو محسوس کر کے دل بھر آتا ہے۔ سماجی برائیاں ایک ہنستے ہنستے گھر کو برباد کر سکتی ہیں مگر وہ ان عورتوں میں امید کا گلا نہیں گھونٹ سکتیں۔ جدوجہد ان کے دلوں میں امید کا چراغ روشن رکھتی ہے۔ کوثری کی دکھ بھری داستان سننے کے بعد یہ میرا حتمی تاثر تھا۔

تارا

تارہ بیوہ کا تعلق ٹنگائیل ضلع کے کالی ہٹی تھانہ کے گاؤں نیا کادم سے ہے۔ گرامین بنک کی مقامی شاخ اس کے گھر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک کچی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی وہاں تک جاتی ہے۔ یہ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔ میں تارا بیوہ سے ملنے جا رہا تھا تو گلی کے نکڑ پر اس سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ تارا وہاں جلانے کے لئے سوکھی ٹہنیاں اکھٹی کر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے پڑوسیوں کی پیال سوکھنے کے لئے ڈالی تھی اور وہ خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ بنک کا ایک ملازم میرے ہمراہ تھا۔ اس نے تارا سے میرا تعارف کروایا۔ میں نے اس کو آپا، کہہ کر پکارا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ بظاہر اس کو ملاقات سے خوشی ہوئی تھی۔ اس نے کام روک دیا اور مجھے گھر چلنے کو کہا۔ وہ مجھے دیور کے گھر بٹھانا چاہتی تھی، کیونکہ اس کے اپنے گھر میں مہمانوں کے بٹھانے کے لئے کوئی شے نہ تھی۔ تاہم میں نے اس کے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ میں اصل میں اس کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔

خیر تارا کی مصروفیت کے پیش نظر میں نے اس وقت جانا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ اس سے دوسرے روز کی ملاقات طے کر کے میں واپس آ گیا۔

دوسرے روز صبح دس بجے اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مگر وہ گھر نہ تھی۔ اس سے میری ملاقات تقریباً دو سو گز دور ایک ہمسائے کے گھر ہوئی، جہاں وہ حسب معمول کڑی دھوپ میں دھان سکھا رہی تھی۔ یہ اس کے شوہر کے چچا کا گھر تھا جو کچھ عرصہ پہلے فوت ہو گیا ۔اس کی بیوی اب اس گھر کی مالکن تھی۔ تارا کی اپنی جھونپڑی میں دھان رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے وہ اپنے شوہر کے چچا کا گھر استعمال کر رہی تھی۔ وہ یہیں دھان کو بھگوتی اور

MashalBooks.org

خشک کرتی ہے۔ اس کے باڑے میں رہنے والے لوگوں نے کبوتروں کے چودہ پندرہ جوڑے پال رکھے ہیں۔ چنانچہ جب تارا دھان سکھانے کے لئے زمین پر ڈالتی ہے تو کبوتر وہاں پہنچ کر تباہی پھیلانے لگتے ہیں۔ تاہم شوہر کے مرحوم چچا کے گھر میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

میں جب اس گھر میں داخل ہوا تو تارہ کی بڑی بیٹی اور اس کی چچی مل کر کام کر رہی تھیں۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور باتیں کرنے کے لئے ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ تکلف سے کام نہ لیں، لہٰذا بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور بارش ہونے لگی۔ تارا کی بیٹی بھاگ کر صحن میں گئی جہاں کھجور کی چٹائیوں پر دھان خشک کرنے کے لئے ڈالا ہوا تھا۔ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے سارا دھان اکٹھا کیا اور اندر لے آئی۔ بارش تقریباً نصف گھنٹے تک ہوتی رہی۔ اس دوران میں عورتوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ تارا دودھ لینے کے لئے ساتھ والے گھر گئی تھی، مگر خالی ہاتھ لوٹ آئی۔

بارش رکی تو تارا مجھے اپنے گھر لے گئی۔ البتہ اس کی بیٹی رقیہ کام ختم کرنے کے لئے وہیں ٹھہر گئی۔ جس باڑے میں تارا رہتی ہے، اس میں اس کے سسر اور مرحوم شوہر کے چھوٹے اور بڑے بھائیوں کے گھر بھی ہیں۔ تارا کا گھر اس باڑے میں مغرب کی طرف ہے۔ یہ ایک بوسیدہ جھونپڑی ہے جس کی دیواریں پٹ سن کے ڈنٹھلوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک دیوار میں بڑا سا سوراخ ہے جو دروازے کا کام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جھونپڑی دھان، چاول یا کوئی اور قیمتی چیز سٹور کرنے کے لئے محفوظ جگہ نہیں ہے۔ اس تنگ و تاریک چھپر میں تارا بیوہ اپنے بچوں کے ساتھ رات دن گزارتی ہے۔

جھونپڑی کے اندر فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں۔ چند گھریلو چیزیں اور برتن فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف کونے میں المونیم کی ایک تھالی اور چار مٹی کے پیالے دھرے ہیں۔ دوسرے کونے میں جھونپڑی میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ جس پر تین بوسیدہ لحاف ڈالے گئے ہیں۔ برتن رکھنے والا ایک تختہ دیوار میں نصب ہے جس پر شیشے کی چند بوتلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جھونپڑی کے ایک اور کونے میں بانس جوڑ کر ایک چھوٹی سی میز بنائی گئی ہے جس پر سات آٹھ کتابیں اور ایک لکھنے والی سلیٹ پڑی ہے۔ یہ کتابیں تارا کی بیٹیوں کی ہیں۔ کتابیں ان کو سکول کی طرف سے مفت ملی تھیں۔ ایک جانب دیوار پر بانس لٹکا کر کپڑے

ٹانگنے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ اس پر تارا اور رقیہ کے بوسیدہ کپڑے اور ایک پرانا فراک رکھا ہوا ہے۔ یہ فراک دوسری بیٹی کے ہے یہ ایک ہمسائے نے اس کو دیا تھا۔ جھونپڑی کے درمیان میں لکڑی کے دو چھوٹے سٹول پڑے ہوئے ہیں۔

میں نے تارا سے اس کے ماضی کی داستان سننے کی فرمائش کی۔ وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اس سوال نے اس کے زخموں کو چھو لیا ہو۔ پھر اس نے یوں بات شروع کی کہ ''میرے باپ اور دادا کا تعلق اسی علاقے کے گاؤں اڈیلہ سے تھا مجھے یا میرے کسی بھائی بہن کو دادی دادا کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ میری پیدائش سے پہلے ہی وہ ہیضہ سے مر گئے تھے۔ ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی تو میری پھوپھی، دو چچا اور دو چچا زاد بہنیں بھی اس کی نذر ہو گئی تھیں۔ وہ سب لوگ میری پیدائش سے پہلے ہی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔

تارا بیوہ کی چالیس سالہ زندگی ناقابل برداشت دکھوں اور اذیتوں سے عبارت رہی ہے۔ اس کا کنبہ مختصر تھا۔ بس اس کے والدین تھے، ایک بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ اس کا باپ غریب آدمی تھا۔ محنت و مشقت سے وہ محض اس قدر کماتا تھا جس سے اپنے بیوی بچوں کو فاقوں سے بچا سکے۔ تارا نے بتایا کہ ''میرے باپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کر رکھی تھی، مگر میری ماں نری ان پڑھ تھی۔'' اس کے باپ کا نام عکاس میاں تھا۔ وہ اپنی بیٹی تارا کو زیور تعلیم سے آراستہ نہ کر سکا۔ وہ گھر کا کام کاج کرتے ہوئے جوان ہوئی۔

تارا نے سن رکھا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بھی اسی طرح مفلسی کے مارے ہوئے تھے۔ اس کے دادا کی تھوڑہ سی زمین تھی اور اس نے تین چار گائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ دوسروں کی زمین بھاڑے پر لے کر کاشت کرتا اور اس طرح روزی کمایا کرتا تھا۔ وہ اپنی دو تین بیگھے زمین پر بھی کاشت کاری کرتا۔ مگر اس کا خاندان افلاس اور محرومی کا شکار ہی رہا۔

دیہی علاقوں کے دوسرے غریب خاندانوں کی طرح اس خاندان کی لڑکیوں کی شادی بھی جلد کر دی جاتی تھی۔ خود تارا کی شادی چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ دولہا کا تعلق نیا کارم نامی گاؤں سے تھا۔ نوجوان تارا حسین مستقبل کے رنگین خواب لئے اپنے شوہر وزیر علی کے گھر آئی تھی۔ اس زمانے میں اس علاقے میں جہیز کا زیادہ رواج نہ تھا۔ تارا بھی خالی ہاتھ آئی تھی۔ البتہ دولہا والوں نے تارا کو روزمرہ استعمال کی دو ساڑھیاں اور خاص خاص موقعوں پر زیب تن کرنے کے لیے ایک ساڑھی دی تھی۔ شادی کے وقت وزیر علی کی عمر تیئس

MashalBooks.org

چوبیس سال تھی۔ وہ بہت ہی اچھا اور شریف النفس شخص تھا۔ تارا بیوہ کہتی ہے کہ اس کے شوہر کے بزرگ ایک زمانے میں بہت امیر کبیر ہوا کرتے تھے۔ ان کی جائیداد پر تین چار نوکر ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان کے مویشی خانے گایوں سے اور مچھلیوں کے تالاب مچھلیوں سے بھرے رہتے تھے۔ میں نے تارا سے کہا کہ وہ وزیر علی کے بزرگوں کی جائیداد کے بارے میں زیادہ وضاحت سے بتائے تو اس نے جواب دیا کہ ''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اگر وہ امیر لوگ نہ ہوتے تو پھر وہ چار بیگھے زمین پر پھیلا ہوا تالاب کیونکر بنوا سکتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک بڑے تالاب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ''یہ تالاب پرانے زمانے کے لوگوں نے بنایا تھا۔''

تارا وزیر علی کے گھر آئی تو وہاں وزیر علی کے والدین چار بھائی اور ایک بہن رہتی تھی۔ یہ ایک مشترکہ خاندان تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس خاندان نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ لیکن وزیر علی کے دادا نے دولت کا اکثر حصہ مقدمہ بازیوں پر اڑا دیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب وزیر علی کا باپ اور چچا ابھی بہت چھوٹے تھے۔ دادا کے فضول شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانی جائیداد کا بڑا حصہ نیلام ہو کر دوسروں کے قبضے میں چلا گیا۔ قانونی عمر کو پہنچنے کے بعد وزیر علی کے باپ اور چچاؤں نے یہ جائیداد واپس لینے کی کوشش کی۔ اس پر مخالف گروہ نے ان لوگوں کو بری طرح پیٹا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ جہاں ان کا علاج ہوا اور تندرست ہو کر واپس آئے۔ انہوں نے مخالفین کے خلاف مقدمات درج کروا دیئے۔ تاہم تارا کا کہنا ہے کہ وہ مقدموں کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کو جائیداد واپس لینے کی امید سے ہاتھ دھونے پڑے۔

شادی کے بعد چند سال تارا نے ہنسی خوشی بسر کئے۔ وزیر علی زراعت کار تھا۔ وہ چاق و چوبند رہتا۔ مشترکہ خاندانی نظام میں وہ اور اس کا باپ خاندانی فرائض سرانجام دیتے۔ وزیر علی کے بھائیوں نے چھوٹا سا کاروبار شروع کر رکھا تھا جب کہ سب سے چھوٹا بھائی سکول میں پڑھتا تھا۔

تارا کے ہاں پہلا بچہ شادی کے چھ سال بعد پیدا ہوا۔ اس کا نام رقیہ رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک اور بچی حاجرہ پیدا ہوئی۔ شادی کے نو سال بعد تک وزیر علی ایک اچھے باپ اور محبت کرنے والے خاوند کی طرح اپنے کنبے کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کے بعد تارا کے اچھے

دن پلک جھپکتے ہی ختم ہو گئے۔ اسکی دنیا گویا کاغذی گھروندا تھی جو دھڑم سے نیچے گر گئی۔ زندگی کے اس مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے تارا بیوہ کی آواز غم سے بوجھل ہو گئی۔ کہنے لگی ''آپ کو وہ بات کیسے بتاؤں جس نے میری ساری خوشیاں چھین لیں اور دامن کانٹوں سے بھر دیا۔ ایک روز میرا شوہر کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کام کو گیا۔ وہ مون سون کے دن تھے اور گھرے کھڈے بارش کے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک دلدل میں دھان کی کٹائی کے لئے گیا تھا۔ کام کرتے کرتے اچانک گہرے پانی میں لڑھک گیا۔ ساتھی مزدوروں نے اس کو باہر تو نکال لیا مگر وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ وہ محتاج ہو کر رہ گیا شاید دلدلوں کی کسی بدروح نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔

محتاج شوہر کے مناسب علاج معالجے کی تارا نے ہر ممکن کوشش کی۔ ڈاکٹر جو دوا کہتے یا گھر کے دوسرے افراد کسی دوا کا نام لیتے تو وہ فوراً خرید لاتی۔ عاملوں کے پاس بھی وہ اس کو لے کر گئی۔ لیکن کہیں بات نہ بنی۔ وزیر علی کی صحت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ حادثہ کے دو ماہ بعد چھوٹا بھائی وزیر علی کو مرزا پور لے گیا اور ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ ایک مہینہ ہسپتال میں رہنے کے بعد بھی بہتری کی کوئی علامت پیدا نہ ہوئی۔ تب بھائی اس کو ڈھاکہ لے گیا۔ حالانکہ یہ بہت مہنگا کام تھا۔ وہاں اس کو الیکٹرک شاک دیئے گئے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر علی کی حالت اور بھی خراب ہو گئی آخر کار اس کو گھر لے آیا گیا۔ ایک حکیم اس کا علاج کرنے لگا۔ مگر یہ سب کچھ بے سود تھا۔ تھک ہار کر اہل خانہ نے علاج بند کر دیا اور خدا سے صحت کی بھیک مانگنے لگے۔

وزیر علی کام کاج کے قابل نہ رہا تو خاندان کے مصائب شروع ہو گئے۔ وزیر علی کا ایک بھائی، عثمان علی، ٹھیکداری کرتا تھا۔ وزیر علی کی بیماری کے دنوں میں اسی نے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کئے تھے۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو حالات زیادہ خراب ہو گئے۔ اب وہ کوئی محنت طلب کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ البتہ آرام سے بیٹھ کر ہاتھوں سے کام کر سکتا تھا۔ مگر مزدوروں کو ایسا کام تو شاذونادر ہی ملتا ہے۔ تارا نے دکھی لہجے میں کہا کہ ''کبھی کبھی میرا سسر ہمیں کام نہ کرنے پر برا بھلا کہتا، حالانکہ میرے شوہر کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ میں سسر کے دل کی بات جان گئی تھی، اس لئے ہمسایہ گھروں میں کام تلاش کرنے لگی۔ مجھے دھان خشک کرنے کا کام مل گیا، اور بھی چھوٹے موٹے کام ملنے لگے۔ یوں چند پیسے

ہاتھ آجاتے۔لیکن دکھ کا احساس بڑھ جاتا۔ مجھے اپنے شوہر پر رحم آتا جواب کام کاج کے قابل نہ رہا تھا۔ مجھے خاندان کی پریشانی بھی لاحق ہوئی۔کون ہمیں کھانے کو دے گا؟ کون میری بیٹیوں کا خیال رکھے گا؟ میرے محنت مزدوری کرنے پر کسی سسرالی عزیز نے انگلی نہ اٹھائی۔''

یوں تارا نے زندگی کے دباؤ کے تحت دوسرے لوگوں کے گھروں میں ملازمت کا آغاز کیا۔

تارا کے سسر نے محتاج بیٹے کے خاندان کی مزید دیکھ بھال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس بات کو بوجھ سمجھنے لگا تھا۔سسر کا ایک اور بیٹا دوسروں کو بتائے بغیر رقم جمع کر رہا تھا اور وہ گھریلو اخراجات میں اپنا حصہ نہ دیتا تھا۔ وزیر علی کا باپ ان باتوں پر سخت نالاں تھا۔ چنانچہ اس نے بیٹوں کو الگ الگ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ہر کوئی اپنا کام کرے اور اپنا پیٹ پالے اور دوسروں کا خون نہ چوسے۔مگر تقسیم تارا کے کنبے کے لئے مزید پریشانیوں کا سبب بن گئی۔

والدین کے ساتھ وزیر علی کے تعلقات اچھے نہیں تھے، بھائیوں کی بات البتہ اور تھی، تارا اس کا اعتراف کرتی ہے۔اس نے مجھے بتایا کہ ''وزیر علی کے بھائیوں کا وطیرہ باپ جیسا ہوتا تو میں یہاں بچوں کے ساتھ نہ رہ سکتی تھی۔'' چنانچہ مشترکہ خاندان کے خاتمے کے بعد بھی دو تین ماہ تک بھائی وزیر علی کی مدد کرتے رہے۔ان لوگوں کی اپنی حالت بھی اتنی اچھی نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصے تک امداد جاری رکھ سکتے۔

یوں خاندان کی ذمہ داری بالآخر تارا کے کندھوں پر آ گئی۔سسر نے جب بیٹوں کو الگ کیا تھا تو اس نے کسی کو زمین کا کوئی ٹکڑا نہ دیا تھا۔ بیٹوں کو اس نے بس اپنی جھونپڑیوں میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ وہ خود اپنی زمین پر کاشت کرتا تھا اور اس آمدنی پر اچھا بھلا گزارہ کرتا تھا۔تارا نے بتایا کہ اس کے شوہر کے بھائیوں نے وزیر کو کچھ زمین دینے کی استدعا کی تھی۔مگر سسر نہ مانا۔اس کا جواب تھا کہ ''وزیر علی کو جہاں سے روزی ملتی ہے، کمانے دو۔''

گاؤں میں کھاتے پیتے گھرانے نہ تھے جہاں تارا مستقل ملازمت حاصل کر پاتی۔ چنانچہ اس نے چند ہندو پڑوسیوں کے لئے دھان کی صفائی کا کام شروع کر دیا۔مگر یہ محنت طلب کام ہے۔شوہر اس کے مصائب دیکھ کر کڑھتا تھا۔مگر بے بس تھا۔ وہ اکثر اوقات باپ کے رویے کے خلاف اس سے لڑتا جھگڑتا۔ تلخ لہجے میں وہ باپ سے شکایت کرتا کہ ''میں کام کرنے کے قابل نہیں رہا تو میرے بچے تمہارے لئے بوجھ بن گئے ہیں۔تم ان کے دادا ہو مگر

MashalBooks.org

تم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔''

تارا کی محنت و مشقت کا ثمر کچھ بھی نہ تھا۔ ایک من دھان کا بھوسا اتارنے پر اس کو محض ڈیڑھ روپیہ ملتا تھا۔ بچوں کو زندہ رکھنے کی خاطر اس کو روزانہ کم از کم دو تین من دھان صاف کرنا پڑتا تھا۔ کام سے واپسی پر وہ دکان سے چاول خرید لاتی تھی جو ان کی ضرورت سے ہمیشہ کم ہوتا تھا۔ کوئی اس کی مدد کرنے والا نہ تھا۔ تارا اپنی اور اپنے خاندان کی بقا کی جنگ تنہا ہی لڑ رہی تھی۔ اکثر اوقات وہ صبح سویرے کام پر نکل جاتی تا کہ سورج نکلنے سے پہلے ایک آدھ من دھان صاف کر لے۔

یہ تصور کرنا واقعی کتنا دشوار ہے کہ تارا جیسی عورت دن میں صرف ایک وقت کے کھانے پر اس قدر محنت کیا کرتی تھی۔ بیٹیاں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ ان کے بھوک زدہ چہرے تارا کا دکھ درد بڑھا دیتے تھے۔ اسی بے بسی اور بدقسمتی میں آٹھ نو سال بیت گئے۔ اس عرصے میں تارا نے دو اور بچوں کو جنم دیا، مگر اس کی آمدنی وہیں رہی۔

خدا پر تارا کو پختہ ایمان ہے۔ چنانچہ وہ کہتی ہے ''خدا نے مجھے اچھی صحت سے نوازا ہے۔ سخت محنت کے باوجود میں بیماریوں سے محفوظ رہی ہوں۔ صرف ایک بار میرے سر میں پھوڑے نکل آئے تھے۔ تب مجھے کام کے دوران شدید تکلیف ہوا کرتی تھی۔'' بڑی بیٹی رقیہ ماں کی ہمدرد ہے۔ وہ صرف کام میں ہاتھ نہیں بٹاتی بلکہ دکھ درد میں بھی شریک ہوتی ہے۔

مجھے تارا نے بتایا کہ جب وہ کام پر جاتی اس کا دل پیچھے بیمار شوہر میں اٹکا رہتا تھا۔ ایک سال کے اندر وزیر علی کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ آٹھ برس اس نے ناقابل برداشت تکالیف اٹھائیں۔ پھر اس کا انتقال ہوگیا۔ یوں وہ تارا کو بیوہ کر کے اور چار بیٹیوں کو بے سہارا چھوڑ کر اس جہاں سے کوچ کر گیا۔

تارا اب گاؤں میں تارا بیوہ کے نام سے پکاری جانے لگی۔ تاہم وہ پرانی جھونپڑی میں ہی رہتی ہے۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ یا اس کی بیٹیاں اس جگہ کو کوئی حق رکھتی ہیں یا نہیں، کیونکہ وزیر علی کا انتقال اس کے باپ کی زندگی میں ہوا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اگر بیٹے کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو جائے تو اسلامی قانون وراثت بیٹے کی اولاد کو دادا کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں دیتا۔ اس لئے تارا کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی روز وہ اس پناہ گاہ سے بھی محروم کر دی جائے گی۔ یہ خوف سسر کے رویوں سے پیدا ہوا تھا۔ ان رویوں کا اندازہ آپ یوں لگا

MashalBooks.org

سکتے ہیں کہ اس کے صحن میں آم اور کٹھل کے کئی درخت ہیں، ہر سال وہ ان درختوں کا پھل بیچتا ہے لیکن وزیر علی کی بیٹیوں کو کبھی انہیں ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتا۔

بیوہ ہونے کے بعد تارا کو اس امر کا احساس بڑھ گیا کہ بیٹیوں کا سارا بوجھ خود ہی اٹھانا ہے۔ چنانچہ اس نے جلد ہی وزیر علی کی موت کے صدمے پر قابو پانے کی کوشش کی اور کام پر دوبارہ جانے لگی۔ اپنے دکھ پر رونے کے لئے بھی اس کے پاس فرصت نہ تھی۔

میں نے تارا سے پوچھا کہ آیا بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک کا کوئی واقعہ اس کے ذہن میں ہے۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ میں نے رستے ہوئے زخم پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ پھر اس نے مجھے یہ قصہ سنایا کہ ایک روز فوجیوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک بھوار پور جا رہا تھا۔ راستے میں وہ دیکھے بھالے بغیر فائرنگ کر رہے تھے۔ کالی ہٹی کے مقام پر ان کی مکتی باہنی کے ساتھ جھڑپ ہو گئی۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور تارا چاول پکا رہی تھی۔ اس اثنا میں چاروں طرف شور مچ گیا ''فوج آ گئی!'' ''فوج آ گئی!'' ہر کوئی جان بچانے کی خاطر قاضی پاڑہ کی طرف بھاگنے لگا۔ مکتی باہنی کے افراد لوگوں کو پناہ گاہوں میں چھپ جانے کو کہہ رہے تھے۔ تارا نے چاول چولھے پر ہی چھوڑے اور دو بچیوں کو لیکر قاضی پاڑہ کی طرف بھاگنے لگی۔ بعد میں ان لوگوں نے سنا کہ بہاریوں نے ناگا باری پل کے پاس خندقیں کھودی تھیں اور مکتی باہنی پر فائرنگ کی تھی۔ اس پر مکتی باہنی نے نارا ندیہ پل کے پاس پوزیشن لے لی تھی۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد تارا بیٹیوں کو قاضی پاڑہ میں چھوڑ کر بچے کھچے چاول لینے واپس آئی اور پھر بچیوں کے پاس واپس چلی گئی۔

تارا کا کہنا ہے کہ ایک بار فوج اور رضا کاروں نے ان کے گاؤں کا محاصرہ کر کے گھر گھر تلاشی لی تھی۔ فوج کی آمد سے پہلے ہی گاؤں کے اکثر لوگ بھاگ گئے تھے۔ ایک اور موقع پر بہاریوں نے ناگا باڑی اور مولوی باڑی کے مقامات پر چند گھر نذر آتش کر دیئے تھے۔ تارا کی ایک ہمسائی سونا بانو کو فوجی پکڑ کر ساتھ لے گئے تھے۔ اس پر ایک ہمسایہ مولوی نے فوجیوں سے التجا کی کہ وہ اس خاتون کو چھوڑ دیں۔ فوجی یہ بات سن کر مشتعل ہو گئے اور انہوں نے مولوی کو گولی سے اڑانے کی دھمکی دی۔ مولوی گاؤں واپس آیا اور بہت سی مرغیاں اکٹھی کر کے ساتھ لے گیا۔ اس نے مرغیاں فوجیوں کو دیں اور سونا بانو کو چھڑا لایا۔

اس واقعہ سے تارا بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کو بیٹیوں کی جان کے لالے پڑ

گئے۔ وہ انہیں جگہ جگہ چھپانے لگی۔ پہلے وہ ان کو وزیر علی کے بڑے بھائی کے گھر لے گئی۔ بعد میں وزیر علی کی بہن کے گھر چھپا دیا۔ چند روز بعد وہ اپنی بہن کے گھر شیر پور لے گئی ایک ماہ تک وہ اسی طرح ماری ماری پھرتی رہی اور بہاریوں سے بیٹیوں کو چھپاتی رہی۔ تارا کا بہنوئی پٹ سن کا تاجر تھا۔ مصیبت کے ان دنوں میں جب تارا کا کوئی وسیلہ نہ تھا، اس نے اس بدقسمت خاندان کی مدد کی۔

1980ء کے قحط کے دن بھی ایسے ہی دردناک تھے۔ تارا کے پاس کوئی کام نہ تھا اور آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ رہا تھا۔ حکومت نے یونین کونسل کے دفتر میں خوراک کا ایک مرکز قائم کیا تھا۔ تارا کی تین بیٹیاں مٹھی بھر آٹا یا تھوڑی سی کھچڑی حاصل کرنے کی آس پر روزانہ اس مرکز پر جاتیں۔ اس طرح وہ زندہ رہنے کا سامان کر رہی تھیں۔ ان ایام میں وزیر کے بھائی عثمان کو ایک پل تعمیر کرنے کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس کام سے اس نے اچھا منافع کمایا۔ یوں وہ، دوسرے بھائیوں کی طرح، تارا کی تھوڑی بہت مدد کرنے لگا۔

1980ء کے طوفانی سیلاب نے تارا بیوہ کا گھر بھی نہ چھوڑا۔ البتہ وزیر علی کی چچی کا گھر محفوظ رہ گیا تھا۔ تارا اپنا کام اسی گھر میں جا کر کیا کرتی تھی۔ سیلاب سے پہلے تارا کی بیٹیوں نے گوبر اکٹھا کیا تھا جس سے تارا نے ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے لئے اپلے بنا لئے تھے۔ اس نے بہت سی ٹہنیاں بھی جمع کر لی تھیں جن کو وہ برسات کے دنوں میں جلانے کے لئے استعمال کرتی رہی۔ اس کی اپنی کوئی زرعی اراضی نہ تھی، اس لئے سیلاب سے اس کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچا۔

ایک بار تارا نے سنا کہ حکومت کالی ہٹی کی عورتوں کی سوسائٹی کو امداد دے رہی ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ چلا کہ سوسائٹی غریب اور نادار عورتوں کی امداد کرتی ہے۔ یوں تارا کو اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی بھی ایسی ہی ایک سوسائٹی بنانے پر غور کرنے لگی۔ چند ہی روز میں اس نے عورتوں کی ایک سوسائٹی بنائی۔ شفالی اور شانتی وانی اس کی لیڈر تھیں۔ تارا نے اس کے فنڈ میں چوبیس روپے دیئے۔ مگر ہوا یہ کہ جلد ہی شفالی اور شانتی کسی اور جگہ منتقل ہو گئیں اور سوسائٹی ٹوٹ گئی۔ شفالی اس کی سیکرٹری ہوا کرتی تھی۔ اس نے تمام ارکان کے چندے واپس کر دیئے۔ تارا کو بھی اس کی رقم مل گئی۔

دن گزرتے گئے۔ پھر ایک روز تارا نے سنا کہ گرامین بنک اس علاقے کے

MashalBooks.org

غریبوں کو قرضے دے رہا ہے۔ تارا کو خدشہ تھا کہ قرضہ واپس نہ کرنے کی صورت میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، لہٰذا اس نے قرضہ حاصل کرنے پر کوئی توجہ نہ دی۔ ماضی میں وہ چاولوں کی مٹھائی بنانے کا کام کرتی رہی تھی۔ آخر کار وہ سوچنے لگی کہ اگر بنک سے اس کو قرضہ مل جائے تو وہ یہ کاروبار خود بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے تمام خدشے بالائے طاق رکھے اور گروپ بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اپنے گاؤں میں اس نے عورتوں کا پہلا گروپ بنایا۔ وہ بنک کے قواعد وضوابط کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اس نے ہر قاعدہ اور ضابطہ زبانی یاد کر لیا تا کہ اس کو قرضہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اب اس کی بیٹیاں بڑی ہو چکی تھیں اور خاندان کی دیکھ بھال کر سکتی تھیں۔ یوں تارا کو کسی قدر فرصت میسر تھی۔ وہ اچھی گفتگو کر سکتی تھی۔ چنانچہ گروپ کی عورتوں نے اس کو اپنا چیئر پرسن منتخب کر لیا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تارا بنک کے لوگوں سے معاملات طے کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بنک والوں نے بھی اس کی اس حیثیت کو قبول کر لیا۔

مارچ 1980ء میں گرامین بنک کی طرف سے تارا بیوہ کو پانچ سو روپے کا پہلا قرض مل گیا۔ دوسرے ہی روز وزیر کے چھوٹے بھائی نے منڈی سے تین سو روپے کا تین من دھان خریدا اور تارا کی بیٹیوں کی مدد سے دھان گھر لے آیا۔ تارا نے مٹھائی بنانے کے لیے چند ضروری چیزیں خریدیں اور اس ہفتے میں اپنا کام شروع کر دیا۔ یوں تارا کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس نے دوسروں کے گھروں میں نوکری کرنا چھوڑ دیا اور خود کو اپنے کاروبار کے لئے وقف کر دیا۔ تارا کہتی ہے کہ یوں اس کی خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع سے اس نے قرضے کی قسطیں ادا کرنی شروع کر دیں اور ایک سال کے عرصے میں سارا قرض اتار دیا۔

پہلے قرضہ کے منافع سے تارا نے اپنے اور بیٹی رقیہ کے لئے ایک سو دس روپے کی دو ساڑھیاں خریدیں۔ علاوہ ازیں اس نے رقیہ کے لئے 26 روپے کا ایک پیٹی کوٹ اور 13 روپے کا ایک بلاؤز بھی حاصل کیا۔

کچھ عرصہ بعد گاؤں میں اور بھی گروپ بن گئے۔ ان گروپوں نے بنک کے قواعد پر تارا کی گرفت اور بنک کے افراد کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات کی بنا پر تارا کو سنٹر لیڈر منتخب کر لیا۔ تمام متعلقہ افراد اس انتخاب پر خوش تھے کیونکہ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ تارا دیانت

دار، کام میں دلچسپی لینے والی اور پسندیدہ شخصیت کی مالک ہے۔

سنٹر لیڈر کی حیثیت سے تارا سنٹر کی تمام ممبرز کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتی۔ وہ ان کی قسطوں کی واپسی کا بھی خیال رکھتی۔ اجلاسوں میں وہ نظم وضبط پیدا کرتی۔ تمام عورتیں اس کی کے سنٹر میں کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ تارا اپنے ریکارڈ پر فخر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تمام ممبر عورتیں فرائض کی ادائیگی میں اس کے ساتھ تعاون کیا کرتی تھیں۔ وہ تارا سے کہتیں کہ ''اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ بے شک ہمارے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ ہم ہرگز برا نہ مانیں گی۔'' جب بھی ان کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا وہ فوراً تارا سے رجوع کرتیں۔

تارا بیوہ کی بڑی بیٹی رقیہ نے بھی گرامین بنک سے قرضہ لیا تھا۔ اس نے پہلا قرضہ ایک ہزار روپے کا لیا تھا۔ رقیہ اب گروپ نمبر۲ کی چیئر پرسن ہے۔ ایک سال کی مدت میں اس نے اپنا قرض لوٹا دیا اور پھر پٹ سن کی کاشت کے لئے تھوڑی سی زمین لیز پر لی۔ یہ بات بنک کے اصولوں کے مطابق نہ تھی۔

تارا نے مجھے بتایا کہ گروپ کی اراکین اور سنٹر کی سربراہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ گروپ فنڈ سے کوئی رقم نہ نکالی جائے گی۔ وہ فنڈ بڑھانا چاہتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب مزید گروپ سنٹر میں شامل ہوں گے اور گروپ فنڈ بڑھ جائے گا تو وہ اس رقم سے دھان چھڑنے والی مشین خرید لیں گی۔ مجھ سے تارا کہنے لگی ''اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ ہماری یہ خواہش پوری ہو جائے۔''

پہلے قرضے کی واپسی کے بعد تارا نے ایک ہزار روپے کا دوسرا قرضہ لیا۔ اس کو اس بات کا افسوس ہے کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس کو وہ اپنا کہہ سکے، جو اس کو منڈی سے اشیاء لا کر دیا کرے۔ تارا کہتی ہے کہ اگر اس کو کسی شخص کی رفاقت میسر ہوتی تو وہ جوش وخروش سے محنت ومشقت کر کے اپنی زندگی سراسر بدل سکتی تھی۔ وزیر کا بڑا بھائی البتہ کبھی کبھی تارا کے کام آجاتا ہے۔ وہ اس کو منڈی سے دھان خرید کر لا دیتا ہے۔ یہ دھان گھوڑے پر لاد کر لایا جاتا ہے، جس پر کچھ رقم خرچ ہوتی ہے۔ دھان اگر ایک من سے کم ہو تو اس کی دو بیٹیاں خود ہی کسی نہ کسی طور اٹھا لاتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی گھوڑے یا مزدور کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں۔

تارا نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹیاں جنگل یا جوہڑ کے کناروں سے جھاڑیاں اور درختوں کی ٹہنیاں اکٹھی کرتی ہیں، ان کو دھوپ میں ڈال کر خشک کرتی ہیں اور پھر ایندھن کے

MashalBooks.org

طور پر استعمال کرنے کے لئے رکھتی ہیں۔ چنانچہ گزشتہ پورے سال میں تارا کو صرف دوبارہ ایندھن بازار سے خریدنا پڑا تھا۔ اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر اس کو تمام ایندھن بازار سے خریدنا پڑے تو اس کا منافع ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ لڑکیاں لکڑیاں، ٹہنیاں اور جھاڑیاں چننے کا کام کرتی ہیں اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

میں نے تارا سے پوچھا کہ گرامین بنک سے قرضہ حاصل کر کے اس کو کون سے فوائد اور مشکلات پیش آئی ہیں۔ اس سوال کا جواب اس نے بڑی خود اعتمادی سے دیا۔ کہنے لگی ''جناب مجھے تو اس بنک کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ قرضہ نہ ملتا تو میرے لئے زندہ بچنا ہی محال تھا۔ اب میری حالت بہت سدھر گئی ہے۔ مجھے یہ خوف نہیں کہ کھانا کہاں سے آئے گا۔ میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر پکاؤں گی اور کھاؤں گی۔ پہلے یہ بات نہ تھی۔ میں تو دو وقت کے کھانے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ اب ہم گھر میں پکاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی اگر مچھلی کی فرمائش کرتی ہے، تو مہینے میں ایک دو بار میں اس کے لئے چھوٹی سی مچھلی خرید لاتی ہوں۔''

تارا کے لئے سب سے زیادہ تسکین کی بات یہی ہے کہ اب اس کو روٹی کی پریشانی نہیں رہی۔ اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ ''اب مجھے صرف کام کی فکر رہتی ہے۔'' نئے ولولوں کے ساتھ اب اس نے دوسرا قرض لیا ہے۔ کہنے لگی کہ کاروبار بڑھانے کے لئے وہ مزید قرضہ لینے کا ارادہ کر رہی ہے۔ دوسرے قرضے کے تین سو روپے وہ پہلے ہی ادا کر چکی ہے۔ قسطوں کی سب رقم واپس کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کا کہنا ہے کہ ''میں قسطوں کی رقم ہمیشہ الگ رکھتی جاتی ہوں۔''

کچھ عرصے سے تارا اپنی جھونپڑی کی مرمت کے بارے میں فکرمند تھی۔ پھر اس نے مرمت کے لئے ایک مزدور کو بلا لیا۔ مرمت کے لئے درکار ساز و سامان اور مزدوری پر اس کے تقریباً ایک سو روپے خرچ ہوئے قبل ازیں وہ مرمت کا بوجھ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اسی طرح پہلے وہ صرف عید کے موقع پر ساڑھی یا کوئی اور کپڑا حاصل کرنے کی امید کر سکتی تھی۔ رشتہ دار اور پڑوسی تارا اور اس کی بیٹیوں کو خیرات یا فطرانہ وغیرہ دے دیا کرتے تھے۔ مگر وہ کبھی نئے کپڑے نہ خرید سکتی تھیں۔ صورت حال اب مختلف ہے۔ چنانچہ حال ہی میں تارا نے اپنے لئے پچاس روپے کی ساڑھی خریدی ہے۔ اپنے کاروبار کے لئے دو کار چند اشیاء بھی اس

نے خریدی ہیں۔ ان میں سیمنٹ کا بنا ہوا ایک بڑا برتن بھی شامل ہے جس میں دھان کو بھگویا جاتا ہے۔ یہ 80 روپے میں خریدا گیا ہے۔ اسی طرح ٹین اور مٹی کے ڈرم بھی اس نے خریدے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ تارا نے حال ہی میں ایک بکری بھی خریدی ہے۔

بکری کا ذکر کرنے سے تارا ہچکچا رہی تھی۔ جب میں اس کے قرضے اور منافع کا حساب کر رہا تھا تو اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ وہ بکری کا ذکر مجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو وزیر کے خاندان سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ یہاں میں آپ کو بتا دوں کہ جب میں تارا سے باتیں کر رہا تھا تو وزیر کا بڑا بھائی اور اس کی بیوی تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے تھے۔ خیر بکری کا معاملہ یہ ہے کہ تارا اس کو خرید کر اپنے گھر نہیں لائی تھی۔

سال کے بعض مہینوں میں تارا کا کاروبار بڑھ جاتا ہے اور اسی حساب سے اس کو منافع بھی زیادہ ملتا ہے۔ سال میں ایک آدھ مہینہ ایسا بھی آتا ہے جب اس کا کاروبار کم ہو جاتا ہے۔ جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو وہ اچھے کاروبار کے دن تھے۔ تارا کو اچھا منافع مل رہا تھا اور وہ اس بات پر بہت خوش تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ قرضے کی قسطیں بھی باقاعدگی سے ادا کر رہی تھی۔ مجھے بتانے لگی کہ ''اب مجھے قرضے کی واپسی کی کوئی فکر نہیں رہی۔ ایک سال پہلے مجھ میں اس قدر اعتماد نہ تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میں قسطیں ادا نہ کر پاؤں گی، یوں لوگ ہنسیں گے، میرا مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ آئندہ سر نہ اٹھانا۔ اب مجھے اس قسم کے خوف نہیں رہے۔'' اب اس کو اپنے آپ پر اعتماد ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ کوئی بڑا قرضہ بھی آسانی سے ادا کر سکتی ہے۔

ایک بار میں بہت ہی دوستانہ ماحول میں تارا سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں اس کی سب سے چھوٹی بیٹی نے رونا شروع کر دیا۔ وہ بھوکی تھی۔ تارا نے اس کو دلاسہ دیا کہ وہ جلد ہی اس کو کھانا پکا دے گی۔ اس دوران وہ چاولوں کی مٹھائی کھا سکتی ہے۔ اس نے رقیہ سے کہا کہ وہ چھوٹی بچی کو تھوڑی سی مٹھائی دے دے۔ اس پر چھوٹی بچی مطمئن ہو گئی۔ اس وقت سہ پہر کے تقریباً ساڑھے تین بجے تھے۔ چنانچہ تارا نے مجھے بھی مٹھائی کھانے کو کہا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تاہم اس کو یہ یقین دلانے میں کافی وقت لگا کہ مجھے مٹھائی کھانے میں دلچسپی نہ تھی۔

فرصت کے لمحات تارا کو اب کم ہی میسر آتے ہیں۔ وقفے کے بغیر وہ صبح سے شام تک محنت کرتی ہے۔ چاولوں کی مٹھائی تیار کرنا واقعی مشکل کام ہے۔ پھر تارا گروپ کی چیئر پرسن اور سنٹر کی لیڈر بھی ہے۔ چنانچہ اس کو کئی مہمانوں سے ملنا پڑتا ہے۔ عام طور پر عورتیں اس کے پاس قرضے کے سلسلے میں مشورے لینے آتی ہیں۔ گروپ کی عورتوں میں کوئی غلط فہمی یا رنجش پیدا ہو جائے تو وہ بھی صلح صفائی کے لئے تارا سے رجوع کرتی ہے۔ وہ یہ سارے جھگڑے نمٹا دیتی ہے۔ میں تارا سے باتیں کر رہا تھا تو چار پانچ عورتیں اس سے ملنے آگئیں۔ وہ گروپ کی کسی رکن سے ناراض تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ وہ ہمیشہ مسائل پیدا کرتی ہے، لہٰذا اس کو گروپ سے نکال کر اس کی جگہ کوئی اور لڑکی شامل کرنی چاہئے۔ تارا نے ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی بیٹی رقیہ سے مشورہ کریں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں، رقیہ ایک اور گروپ کی چیئر پرسن ہے۔

حالیہ مہینوں میں تارا کی سماجی حیثیت اور مرتبے میں کافی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ بنک کے قرض داروں کے علاوہ زرعی جائیداد رکھنے والے افراد بھی اپنی زمینوں پر کاشتکاری کے لئے قرضے لینے اس کے پاس آتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ماضی میں اس کو منہ نہ لگاتے تھے۔

تارا رقیہ کی شادی کے بارے میں بھی سوچ رہی ہے۔ بکری اصل میں اس نے شادی کی دعوت کی خاطر ہی خریدی تھی۔ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ کچھ رقم بھی جمع کر رہی ہے۔

گرامین بنک کی امداد سے پہلے تارا ہر وقت بقا کی فکر میں گم رہتی تھی۔ حالات اب بدل گئے ہیں۔ چنانچہ وہ چھوٹی بیٹیوں کو تعلیم دلوانے کی امید بھی رکھتی ہے۔ اس نے بنک میں عورتوں کو ملازمت کرتے دیکھا ہے۔ اسی طرح بعض سرکاری ملازم خواتین اور دوسری پیشہ ور عورتیں اس سے ملنے بھی آتی رہی ہیں۔ وہ یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ بڑی ہو کر اس کی بیٹیاں بھی اسی طرح کام کیا کریں گی۔

تارا اپنے رہن سہن کو بہتر بنانا چاہتی ہے۔ خاص طور پر وہ اپنے گھر کو بہتر بنانا چاہتی ہے۔ جب وہ مستقبل کے منصوبوں کا ذکر مجھ سے کر رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک تھی۔ وہ مطمئن اور خوش نظر آتی تھی۔

MashalBooks.org

تارا میں توانائی ہے اور جوش وخروش بھی۔ یہی صفات اس کے کامیاب مستقبل کی ضامن ہیں۔ اس کو پوری امید ہے کہ جلد ہی اس کا کاروبار زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ اس کے وسائل ہوں گے اور وہ اپنی بیٹیوں کی شادی اچھ انداز میں کر سکے گی۔ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر وہ مزید قرضہ لے گی۔ وہ باعزت زندگی کی آرزومند ہے اور یہ آرزو محنت ہی سے پوری کر سکتی ہے۔

بیٹیاں بھی ماں کی ہمدرد ہیں۔ وہ تارا کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ اسی طرح وہ کاروبار اور محنت کی قدر کرنا سیکھ رہی ہیں۔ اس نے خوشی خوشی مجھے بتایا کہ رقیہ اس سے بھی اچھی چاولوں کی مٹھائی تیار کرتی ہے۔

ایک روز میں دوبارہ تارا سے ملنے گیا تو رقیہ کام میں مصروف تھی۔ اس نے آگ جلا رکھی تھی اور چاولوں کی مٹھائی بنا رہی تھی۔ پسینے سے اس کا سارا بدن شرابور تھا۔ تارا نے مجھے بتایا کہ وہ صبح سے اسی لگن کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ سہ پہر ہو چکی تھی، مگر اس نے کام جاری رکھا تھا۔

ان لوگوں کو دیکھ کر اب کوئی یہ الزام نہیں دے سکتا کہ یہ سست اور کاہل لوگ ہیں اپنے حالات بدلنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔

MashalBooks.org

آسیہ کی نجات

بعض ایسے قسمت کے مارے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو زندگی میں رنج والم، ذلت و خواری اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ ہر نیا دن ان کے لئے نئے دکھ اور نئی محرومیاں لے کر طلوع ہوتا ہے۔ آسیہ بیگم ایسی ہی ایک بدنصیب عورت ہے۔ معاشرے نے اس کو تیاگ دیا ہے۔ اس کی ساری امیدیں اور تمنائیں آنسوؤں میں ڈھل چکی ہیں۔ اس نے خوش باش خانگی زندگی کے سوا کوئی آرزو نہ کی تھی۔ انسان ہونے کے ناطے یہ اس کا حق تھا۔ وہ اس خواب کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی رہی۔ مگر تین شادیاں کرنے کے باوجود اس کے خواب ادھورے رہے۔

سینکڑوں ان چاہے حادثوں نے آسیہ کی زندگی میں تلخیاں بھر دیں۔ وہ دوسروں کے تمسخر کا نشانہ بن کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ درخت سے ٹوٹے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح وہ اپنی منزل سے محروم ہو کر دربدر ٹھوکریں کھاتی رہی۔ زندگی کے اس عذاب نے اس کو اور بھی اپنی ذات میں سمٹنے پر مجبور کر دیا اور وہ شرم کے احساس تلے دب کر رہ گئی۔ اس کو لگتا کہ جنگل میں اگے ہوئے گھاس پھوس کی مانند اس کا وجود بے معنی ہے اور بے قدر بھی۔ زندگی کی بے رحم حقیقتوں نے اس کو کچل دیا اور وہ بے کراں اذیت سے ڈوب گئی۔

آسیہ کے معصوم خواب ایک ایک کر کے ٹوٹے تھے۔ زندگی کے جبر نے اس کی روح کی ساری گرم جوشیاں سرد کر دی تھیں۔ سارے ولولے ماند پڑ گئے تھے اور وہ زندگی سے نفرت کرنے لگی تھی۔

آسیہ 1950ء کے لگ بھگ ٹنگائیل ضلع کے ڈگرہ نامی گاؤں میں مولوی قاسم منشی کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ گاؤں کے مکتب کا منشی تھا اور سب لوگ اس کو منشی ہی پکارتے

MashalBooks.org

تھے۔ منشی صاحب کی تھوڑی سی زمین بھی جس پر وہ خود ہی کاشت کیا کرتے تھے۔ مکتب سے ان کو باقاعدہ تنخواہ تو نہ ملتی تھی، البتہ ہر کٹائی کے موسم میں تنخواہ کے عوض ان کو پانچ من دھان دیا جاتا تھا۔ منشی صاحب کا گھرانہ یوں سمجھئے کہ خاصا بڑا تھا۔ وہ خود تھے، بیگم تھیں اور تین بیٹے اور چار بیٹیاں بھی۔ آپ اندازہ کر ہی سکتے ہیں کہ مشکل سے ان کی گزر اوقات ہوتی ہوگی۔ گویا آنکھ کھولتے ہی آسیہ کو مصیبتوں اور محرومیوں سے پالا پڑ گیا تھا۔

منشی صاحب کے افلاس زدہ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میاں بیوی الجھ پڑتے۔ منشی صاحب کبھی کبھی بیوی کو پیٹ بھی دیا کرتے تھے۔ اس بدنصیب کا قصور بس یہ ہوتا کہ کبھی کھانا تیار کرنے میں تاخیر ہو جاتی اور کبھی صحن صاف کرنا بھول جاتی۔ جھگڑوں کی اصل وجہ تو مفلسی تھی۔ آسیہ کی ماں نے کئی بھوکے پیٹ بھرنے ہوتے تھے۔ جب چاول کم پڑ جاتے تو وہ بے چاری ہمسایوں سے ادھار لے لیتی یا مانگ ہی لیتی۔ لہٰذا ہر روز وقت پر کھانا تیار کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ مگر کھانے میں دیر ہوتی تو منشی صاحب پر گویا غصے کا جنون سوار ہو جاتا۔ لوگ اسی لئے ان کو، جنونی کہا کرتے تھے۔ جب وہ غصے میں ہوتے تو گھر کا کوئی فرد ان کے روبرو زبان کھولنے کی جرات نہ کر سکتا تھا، وگرنہ وہ فوراً ہی مار کٹائی پر اتر آتے تھے۔ آسیہ کی ماں کو ان کی وحشت کا اکثر نشانہ بننا پڑتا تھا۔ اسی طرح مار پیٹ سہتے سہتے اس غریب نے ان تمام بچوں کو جنم دیا تھا۔

آسیہ قاسم منشی کے سب سے بڑی بیٹی تھی، البتہ اس سے بڑے دو بھائی تھے۔ تیسرا بھائی خاندان میں سب سے چھوٹا تھا۔ آسیہ کا دوسرا بھائی طاہر علی پانچ سال کی عمر میں ٹائفائڈ کا شکار ہوا تھا۔ بخار نے اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج کر دی تھیں۔ آسیہ خود بھی پانچ برس کی عمر میں شدید بیمار ہوئی تھی۔ اس کے سارے جسم میں خارش ہوتی تھی۔ لیٹنا اور بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ان دنوں باپ نے اس کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ وہ خود جڑی بوٹیوں سے مرہم بناتا اور آسیہ کے سارے جسم پر لگاتا۔ بعد میں اس کو گرم پانی سے نہلاتا ماں بھی ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی۔ یوں ایک ماہ تک بیمار رہنے کے بعد آسیہ آہستہ آہستہ تندرست ہوگئی۔

قاسم منشی اپنے بچوں کو، غربت کے سبب، تعلیم نہ دلا سکا۔ شاید اس نے کوشش بھی نہ کی تھی، یوں آسیہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتے اور ماں کا ہاتھ بٹاتے جوان ہوگئی۔ تاہم اس سے بھی پہلے، جب آسیہ دس سال کی بھی نہ تھی، منشی صاحب نے اس کے لئے رشتے کی

تلاش شروع کر دی تھی۔

1960ء میں آسیہ کی شادی حامد میاں نامی ایک نوجوان سے ہوگئی۔ آسیہ کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ دولہا کی طرف سے اس کے چچا نے منشی صاحب کو شادی کا پیغام دیا تھا۔ بعد ازاں دونوں خاندانوں میں اس موضوع پر بات چلتی رہی اور آخر کار شادی طے پا گئی۔ آسیہ کے باپ نے اس شادی پر ایک سو بیس روپے خرچ کئے۔ تقریب میں تقریباً چالیس مہمان مدعو کئے گئے تھے۔ دولہا کو ایک لنگی دی گئی اور دلہن کی ایک ریشمی ساڑھی۔ جب کہ دولہا کو چاندی کا ایک ہار، چاندی کی تین چوڑیاں، کانوں کے سنہری بندے اور سونے کا ناک کا ایک چھلا دیا۔

حامد کے باپ کا خاندان خاصا بڑا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں اور آٹھ بچے۔ حامد کی ایک سگی بہن اور ایک بھائی تھا۔ اس کے باپ کی سات ایکڑ کے قریب زرعی اراضی تھی۔ حامد خود آرہ کش کا کام کرتا تھا اور 80 روپے ہفتہ کما لیتے تھے۔ وہ اور اس کے بھائی باپ کی زمین پر بھی محنت کرتے تھے۔ یوں زمین اور حامد کی مشترکہ آمدنی سے اس خاندان کا گزارہ ہو رہا تھا۔ حامد کی ماں ایک بچی کو جنم دے کر فوت ہوگئی تھی۔ اس بچی کا نام حنیفہ بیگم تھا۔

آسیہ بڑی امیدیں لے کر حامد کے گھرانے کے ساتھ رہنے آئی۔ یہاں وہ کھانے پکانے کے علاوہ دوسرے گھریلو کام بھی کرنے لگی۔ دن رات وہ کام میں جتی رہتی۔ مگر سسرال والے پھر بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ آسیہ کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی جو اس کو حامد کے خاندان کی توقعات کے مطابق جہیز نہ دے سکا تھا۔ حامد کی سوتیلی ماں تو پہلے دن سے ہی آسیہ کے خلاف ہوگئی تھی۔ ہر وقت وہ حامد سے اس کے خلاف شکایتیں کرتی رہتی۔ وہ ان نوجوانوں کی مثالیں دیتی رہتی جن کو شادی سے بہت فائدہ پہنچا تھا اور جو دلہن کے ساتھ بہت سا ساز و سامان بھی لائے تھے۔ پھر وہ طعنے دیتی کہ آسیہ کا باپ تو شادی کے مہمانوں کی تواضع بھی ڈھنگ سے نہ کر سکا تھا۔ آہستہ آہستہ سوتیلی ماں کے یہ زہریلے الفاظ حامد کے دل پر نقش ہونے لگے اور وہ اپنے سسرالی عزیزوں سے منہ پھیرنے لگا۔ اپنے سسر سے تو وہ ناراض ہی رہنے لگا تھا۔ بات بڑھتی گئی، یہاں تک کہ شادی کے صرف ایک سال بعد نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حامد نے اپنا سارا زیور پاس رکھ لیا اور آسیہ خالی ہاتھ باپ کے گھر واپس آگئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ابھی کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔

آسیہ واپس تو آ گئی، مگر وہ باپ کے لئے ناگوار بوجھ تھی۔ اس کے دو بھائی محنت مزدوری کرتے تھے۔ وہ طویل خشک سالی کے دن تھے۔ فصلیں اچھی نہ ہو رہی تھیں اور روزگار کے مواقع بھی ناپید ہو رہے تھے۔ دونوں بھائی سارے دن کی مشقت کے بعد مٹھی بھر چاول لئے گھر آتے تھے۔ یہی ان کی محنت کا صلہ تھا۔ خاندان بڑا تھا اور آمدنی کے وسائل نہ تھے۔ ان مشکل حالات میں آسیہ نے اپنے کنبے کی مدد کے لئے محنت مزدوری کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ پڑوس میں دھان کا بھوسا اتارنے کا کام کرنے لگی۔ ہر روز وہ ایک من دھان صاف کرتی۔ یوں اس کو دو وقت کی روٹی اور ایک پاؤ چاول روزانہ معاوضے کے طور پر ملنے لگے۔ دو سال یونہی بیت گئے۔

1963ء کا سال آیا تو منشی صاحب نے اپنے ہی گاؤں کے ایک 35 سالہ شخص، بصارت علی سے آسیہ کی شادی کر دی۔ اس موقع پر بصارت علی نے آسیہ کو سونے کی نتھ، چاندی کی چوڑیاں، چاندی کا ہار اور دو ساڑھیوں کا تحفہ دیا۔ اس بار بھی آسیہ کا باپ بیٹی کی شادی دھوم دھام سے نہ کر سکا۔ بصارت علی کی تین ایکڑ کے قریب زمین تھی اور اس کا باڑہ آدھے ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔

بصارت علی بھی گاؤں کے مدرسہ میں منشی تھا۔ تدریسی خدمت کے عوض اس کو ہر سال آٹھ من دھان ملا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دیسی دوائیں بھی بیچا کرتا تھا جس سے ہر ماہ اس کو بیس روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ آسیہ کو گھر لانے سے پہلے وہ تین شادیاں کر چکا تھا۔ اس کی پہلی بیوی ایک بیٹا پیدا کرنے کے بعد چل بسی تھی۔ دوسری بے حد کاہل تھی اور بدصورت بھی۔ اس کو بس کھانے اور سونے سے دلچسپی تھی یا پھر ہمسایہ عورتوں سے گپ بازی میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر بصارت علی نے اس سے چھٹکارہ پا لیا تھا۔ تیسری بیوی کو اس نے جھگڑالو ہونے کے سبب طلاق دے دی۔ اس پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ بصارت علی کے پہلی بیوی سے ہونے والے بیٹے، منصور علی، سے نفرت کرتی تھی۔

اب آسیہ بصارت علی کی چوتھی بیوی بن کر آئی تھی۔ منصور علی اس وقت پانچ برس کا ہو چکا تھا۔ جب کہ بصارت علی کے والدین بہت عرصہ پہلے اس جہاں فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ اس کا بھائی کوئی نہ تھا، البتہ دو بہنیں تھیں جن کی عرصہ ہوا شادی ہو چکی تھی۔ یوں اس کا کنبہ مختصر تھا اور اس کو آسیہ کے باپ جیسے مسائل درپیش نہ تھے۔ گھر کا سارا کام کاج آسیہ

کرتی تھی۔ شادی کے تقریباً ایک سال بعد آسیہ نے ایک بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام حاجرہ خاتون رکھا گیا۔حمل کے دنوں میں بصارت علی نے بیوی کا بہت خیال رکھا۔ اچھا کھانے کو دیا اورضرورت کے وقت اپنی دوائیاں دیں۔کبھی کبھی وہ بیوی کے لئے بازار سے دودھ بھی لے آتا۔لیکن لڑکی کے پیدا ہونے پر وہ زیادہ خوش نہ تھا۔

تھوڑے دنوں بعد تندرست ہونے پر آسیہ نے معمول کا کام شروع کردیا۔ ایک سال بعد وہ پھر حاملہ ہوگئی۔ اس بار ایک اور بچی آگئی۔لیکن چند ہی روز زندہ رہ کر اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوگئی۔ بصارت علی یکے بعد دیگرے دو بچیوں کی پیدائش پر نالاں تھا۔آسیہ کے لئے اس کی محبت کم ہونے لگی۔ایک سال گزرا تو آسیہ نے ایک اور بچی پیدا کردی۔اس بار بصارت علی اپنے غصے اور مایوسی کو چھپا نہ سکا۔ وہ چڑچڑا ہوگیا اور بات بات پر آسیہ کو پیٹنے لگا۔

لگتا تھا کہ قسمت آسیہ سے روٹھ گئی ہے۔ایک کمینے پڑوسی نے بصارت کو مشورہ دیا کہ وہ آسیہ طلاق دے دے۔ اس نے بصارت کو سمجھایا کہ ''یہ عورت کبھی لڑکا نہ جنے گی۔ تمہیں احساس کرنا چاہیے کہ اگر تم آسیہ سے چمٹے رہے تو تمہارا بیٹا منصور بڑھاپے میں تمہاری پروانہ کرے گا۔ پھر تم کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرو گے۔'' بصارت علی تین لڑکیوں کی پیدائش پر پہلے ہی بگڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے دوست کی اس احمقانہ منطق کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ آسیہ کے لیے اس کے تمام جذبے مر گئے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر وہ اس کو مارنے پیٹنے لگا۔ آسیہ تیسری بیٹی کی پیدائش سے ابھی پوری طرح سنبھلی نہ تھی کہ مشین کی طرح کام میں جت گئی۔ وہ دھان صاف کرتی، پانی لے کر آتی اور صحت کی خرابی کے باوجود گھر بھر کا کام کاج کرتی۔ دوسری طرف بصارت علی اب بیوی بچوں سے بالکل بے نیاز ہوگیا تھا۔ ماں کا دودھ سوکھ جانے کے سبب بچی کو مناسب خوراک نہ مل رہی تھی۔ وہ بیمار ہوگئی، لیکن باپ اس کے لئے ایک قطرہ دودھ بھی لے کر نہ آیا۔ آسیہ منتیں کرتی رہی، مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی نتیجہ یہ ہوا کہ بچی کی بیماری بڑھتی گئی اور پھر ایک رات اس نے دم توڑ دیا۔

آسیہ خاموشی سے یہ دکھ سہتی رہی۔ اپنے مقدر پر وہ صرف آنسو ہی بہا سکتی تھی۔مگر اس طرح اس کے مسائل حل نہ ہوئے۔ بچی کی وفات کے چند روز بعد کا ایک واقعہ وہ اب دہراتی ہے، چنانچہ اس نے بتایا کہ ایک روز صحن میں جھاڑو دینے میں اس تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ بصارت علی اس پر غصے سے لال پیلا ہوگیا اور اس کو ٹھڈے مارنے لگا۔ آسیہ صحن میں گر گئی اور

بری طرح زخمی ہوگئی۔ اس کی کمر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ مگر شام کو اس نے حسب معمول دھان صاف کرنا تھے۔ اس واقعہ کے دوروز بعد آسیہ کو منصور کے لئے کھانا تیار کرنے میں دیر ہوگئی اور وہ وقت پر سکول نہ جا سکا۔ دوپہر کے وقفے میں بصارت گھر آیا تو یہ بات سن کر قابو سے باہر ہوگیا۔ اسی لمحے اس نے آسیہ کو طلاق دے دی اور طلاق کا کاغذ بھی لکھ دیا۔ اسی شام کو بصارت علی نے آسیہ کے بڑے بھائی سکندر علی کو بلایا اور آسیہ کو ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔

بدقسمتی کے اس سیاہ لمحے سے پہلے آسیہ کا والد جہاں سے کوچ کر چکا تھا۔ اس کا دوسرا بھائی، طاہر علی جو ٹانگوں سے مفلوج تھا، شادی کر کے خاندان سے نکل چکا تھا۔ آسیہ کی تینوں بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ باپ نے جو ذرا سی زمین چھوڑی تھی، وہ طاہر اور سکندر نے آپس بانٹ لی تھی۔ زمین قاسم منشی بیٹیوں کی شادی کے لئے اپنی زندگی ہی میں بیچ گیا تھا۔ آسیہ کی ماں زندہ تھی اور وہ سکندر علی کے ساتھ رہتی تھی۔ سکندر علی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور وہ محنت مزدوری کر کے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ کسی اور کا بوجھ اٹھانے کی اس میں سکت نہ تھی۔

آسیہ ایک بار پھر نشانہ ستم بنی تھی۔ زندہ رہنے کی خاطر اس نے پڑوسیوں کے گھروں میں دھان صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کی بیٹی حاجرہ خاتون اس کام میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ دن بھر کی مشقت کے بعد دونوں ماں بیٹی آدھا سیر چاول لئے شام کو واپس آتیں۔ پھر 1968ء میں آسیہ کی ماں بھی مرگئی اور یوں وہ مکمل طور پر بھائیوں کی محتاج ہو کر رہ گئی۔

آسیہ کا قدرت نامی ایک کزن تھا جس کی بیوی صالحہ شدید بیمار ہوگئی۔ ان دنوں آسیہ چھ ماہ سے اپنے بھائی سکندر کے ہاں رہ رہی تھی۔ صالحہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کو سونپ دی گئی اور وہ پورے خلوص سے یہ فرض ادا کرنے لگی۔ رات دن وہ صالحہ کی تیمارداری کرتی۔ تقریباً ایک ماہ بعد صالحہ تندرست تو ہوگئی مگر ٹائفائیڈ کا شدید بخار اس کے دماغ پر اثر چھوڑ گیا۔ چنانچہ وہ مخبوط الحواس ہوگئی۔ قدرت کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی اور صالحہ اب ان کو پال پوس کے قابل نہ رہی۔ کنبے میں اور بھی مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ گھر میں باقاعدگی سے کھانا تیار نہ ہوتا اور بچوں کو اکثر اوقات بھوکے رہنا پڑتا۔ گھر کا سارا نظام ہی صالحہ کی

حالت کے سبب درہم برہم ہو گیا تھا۔ ایسے میں قدرت علی نے سوچا کہ اگر وہ آسیہ کو اپنے نکاح میں لے لے تو اس کا گھر بار ٹھیک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک روز اس نے سکندر علی سے آسیہ کا رشتہ مانگ لیا۔ سکندر علی نے اس معاملے پر غور وفکر کے بعد ہاں کر دی۔ یوں آسیہ تیسری بار بیاہی گئی۔

یہ 1969ء کا سال تھا۔ آسیہ انیس برس کی ہو چکی تھی اور اس کی بیٹی حاجرہ چھ سال کی تھی۔ شادی کے بعد ماں بیٹی نئے گھر میں آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں محفوظ مستقبل کے خواب تھے اور وہ امید کرتی تھیں کہ مصیبتیں کم ہو جائیں گی۔ زندگی قابل برداشت ہو جائے گی۔

شادی کے موقع پر قدرت علی نے آسیہ کو کوئی زیور نہ دیا تھا۔ اس کی سات ایکڑ زرعی زمین تھی۔ آسیہ کے باپ کی وفات کے بعد مکتب میں جو جگہ خالی ہو گئی تھی، وہ قدرت علی نے سنبھالی تھی۔ چنانچہ وہ مکتب میں پڑھانے لگا تھا۔ تدریس کے عوض اس کو سالانہ دس من دھان ملتا تھا۔ نئے گھر کا سارا کام آسیہ نے سنبھال لیا۔ وہ کھانا پکاتی، بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور دوسرے کاموں کے علاوہ قدرت علی کی پہلی بیمار بیوی کی تیمار داری بھی کرتی خیر، تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ اس کو حمل ٹھہر گیا اور شادی کے تقریباً ایک سال بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ قدرت علی نے اس کا نام مختار حسین رکھا۔ زچگی کے ایام میں آسیہ کو مناسب خوراک میسر نہ ہوئی اور جو کچھ گھر میں ہوتا، وہ اسی پر گزارا کرتی رہی۔ اچھی خوراک کی اس کو پرواہ بھی نہ تھی۔ وہ تو بس تحفظ کی طلب گار تھی۔ وہ خود سے کہتی ''قدرت علی میرا کزن ہے۔ وہ مجھے دھکا نے دے گا۔ خوراک کے بغیر میں مر نہ جاؤں گی۔'' ان خیالات سے اس کو تسکین ملتی، لیکن، درحقیقت وہ اب بھی سیراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بدقسمتی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔

آسیہ نے صالحہ بیگم کی تیمار داری اس قدر تندہی سے کی کہ رفتہ رفتہ وہ ٹھیک ہو گئی۔ مگر ٹھیک ہونے کے بعد وہ آسیہ کو ایک پل کے لئے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ آسیہ نے دن رات خدمت کر کے نہ صرف صالحہ کو بیماری کے منہ سے نکالا تھا، بلکہ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کی تھی اور اس کے گھر کو سنبھالا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ قدرت سے اس نے اپنی مرضی سے شادی نہ کی تھی۔ پہل تو خود قدرت نے کی تھی لیکن صالحہ کوئی معقول بات سننے پر آمادہ نہ تھی۔

پھر یوں ہوا کہ جوں جوں صالحہ تندرست ہونے لگی، آسیہ کے مصائب بڑھنے لگے۔ ہر بات پر صالحہ اس میں کیڑے ڈالتی اور شوہر کے کان بھرتی۔ قدرت اس کی باتوں میں آ گیا اور آسیہ کے خلاف ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر صالحہ آسیہ کو برا بھلا کہتی اور ڈانٹتی۔ وہ آسیہ کو لوگوں کے گھر برباد کرنے والی بلا قرار دیتی جواب اس کا اپنا گھر خراب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ آسیہ کے معاملے میں وہ بے حد بے رحم اور ستم شعار ثابت ہوئی۔

آسیہ اس ستم ظریفی پر کیا کرتی۔ خاموشی سے ایک بار پھر دکھ سہنے لگی۔ اگر صالحہ کو کوئی جواب دیتی تو شوہر بھی صالحہ کا ساتھ دیتا۔ یوں وہ حالات کے ہاتھوں بے بس ہو گئی۔ مقدر جان کر اس نے یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔ گھر کے تحفظ کی خاطر وہ ساری ذلتیں برداشت کرنے پر تیار تھی، لیکن تحفظ کی امید بھی جلد دم توڑ گئی اور آسیہ کو ایک بار پھر اپنے بے رحم مقدر کے آگے سر جھکانا پڑا۔ ایک روز ان دونوں عورتوں میں جھگڑا ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔ مگر قدرت علی نے صالحہ کا ساتھ دیا اور آسیہ کو گھر سے نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے آسیہ کو طلاق دی اور بھائی کے گھر واپس بھیج دیا۔ تب حاجرہ کی عمر نو سال تھی اور مختار صرف دو برس کا تھا۔

پناہ کی خاطر بچوں کو ساتھ لے کر آسیہ ایک بار پھر بھائیوں کے در پر آ گئی۔ مگر اس کے بھائیوں نے شدت سے مخالفت کی۔ بھائیوں کی مالی حالت پہلے بھی اچھی نہ ہوا کرتی تھی اور اب تو زیادہ ہی خراب تھی۔ غربت خون کے رشتوں کو بھی کر دیتی ہے۔ چنانچہ آسیہ کے بھائیوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بے بسی کے عالم میں آسیہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ کہیں اور پناہ ڈھونڈے۔ چنانچہ وہ پناہ کی تلاش میں براہمن ساشن نامی گاؤں چلی گئی جہاں اس کا رشتے کا ایک چچا، خورشید میاں رہتا تھا۔ خورشید میاں کی بوڑھی ماں ابھی زندہ تھی۔ آسیہ کی دکھ بھری داستان سن کر اس کا دل بھر آیا۔ دو دن کے بعد خورشید میاں آسیہ کے معاملے پر بات کرنے کی خاطر اس کے بھائیوں کے گھر گیا۔ اس نے بھائیوں کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ آسیہ ان کی زمین کے ایک کونے میں جھونپڑی ڈال لے تا کہ اس کو سر چھپانے کی جگہ میسر آ جائے۔ خورشید میاں نے جھونپڑی بنانے میں اس کی مدد بھی کی۔

یوں آسیہ اس جھونپڑی میں رہنے لگی۔ دونوں بچے اس کے ساتھ تھے۔ ایک بار پھر

وہ روزی کمانے کے لئے دھان کا بھوسہ اتارنے کا کام کرنے لگی۔ کام ملتا تو روٹی مل جاتی، وگرنہ آسیہ اور اس کے بچوں کو آٹا گھول کر پینا پڑتا۔ کبھی کبھی وہ دور کے دیہات میں بھیک مانگنے بھی نکل پڑتی۔ اپنے گاؤں میں مانگتے ہوئے اس کو شرم آتی تھی۔ اس طرح وہ دو تین سیر چاول اکٹھے کر لیتی اور کچھ آئندہ کے لئے بچا لیتی۔ کئی باریوں بھی ہوتا کہ وہ مانگنے نکلتی اور اس کی بھابیاں جھونپڑی میں آ کر اس کے چاول چرا لے جاتیں۔ آسیہ اب ان کی محتاج نہ رہی تھی، مگر وہ ان پر چوری کا الزام لگانے کی جرات نہ کر سکتی تھی۔ وہ ناراضگی کا اظہار کرتی تو بھابیاں آ کر اس کی جھونپڑی کو نقصان پہنچاتیں۔ تین ماہ تک یہی صورت حال رہی۔ آخر تنگ آ کر آسیہ ایک بار پھر پناہ کے لئے خورشید میاں کے ہاں چلی گئی۔ وہاں اس نے جھونپڑی ڈالی اور دونوں بچوں کے ساتھ رہنے لگی۔ زندہ رہنے کے لئے وہ محنت مزدوری کرتی اور بھیک بھی مانگتی۔ اکثر اوقات اس کو جنگلی سبزیوں اور جڑی بوٹیوں پر گزارہ کرنا پڑتا۔ دن بھر وہ براہمن ساشن کی گلیوں میں بھیک مانگتی اور شام کو تھکی ہاری لوٹ آتی۔

بنگلہ دیش کے قیام کے لئے جب جنگ ہوئی تو ان دنوں آسیہ تیسرے خاوند کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مختار صرف چند ماہ کا تھا۔ جنگ کے دنوں میں قدرت پہلی بیوی اور بچوں کو لے کر پہلی بیوی کے آبائی گھر چلا گیا۔ آسیہ بیگم نے بھی گھر چھوڑ دیا اور اپنی بھابی کے ساتھ دور افتادہ پہاڑی علاقے میں پناہ کی خاطر چلی گئی۔ اس کے میکے میں رہنا خطرناک ہو گیا تھا، کیونکہ آسیہ کے والدین کا گھر ڈھاکہ جمال پور ھائی وے پر واقع تھا۔ بدامنی کے ایام میں فوجی کارروائیوں سے ڈر کر لوگ عموماً جنگلوں کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ انہی دنوں آسیہ کی ملاقات ایک ہندو خانوادے سے ہوئی، اس خاندان کی ایک عمر رسیدہ عورت علیل تھی۔ آسیہ کچھ عرصہ اس کی نگہداشت کرتی رہی۔ آسیہ اور اس کے بچے اسی ہندو کے گھر میں کھانا کھاتے تھے۔ گھر کے قریب مکتی باہنی کا ایک اڈا بھی تھا۔ آسیہ وہاں کھانا تیار کرنے کی خدمت سرانجام دینے لگی تھی۔ اس خدمت کے عوض اڈے سے اس کو چاول اور دالیں مل جاتی تھیں۔ بنگلہ دیش وجود میں آ گیا تو آسیہ نئی آشائیں لئے اپنے شوہر قدرت کے گھر لوٹ آئی۔

آسیہ کے حافظے میں 1974ء کے قحط کی اذیت ناک یادیں بھی محفوظ ہیں۔ وہ دن اس نے ناقابل بیان تکلیفوں میں بسر کیے تھے۔ کئی کئی روز تک جنگلی جڑی بوٹیاں کھانے پر اس کا گزارہ تھا۔ عام طور پر جو چیزیں پھینک دی جاتی ہیں، وہ ان کو اٹھا کر خوراک کے طور

پر استعمال کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی اس کو سرکاری امدادی مرکز سے خشک دودھ میسر آجاتا۔ وہ دودھ میں چاول ڈالتی اور ابال کر کھالیتی۔ قریبی کاڈاماتلی بازار میں حکومت نے ایک امدادی مرکز قائم کیا تھا۔ آسیہ بچوں کو لے کر وہاں چلی جاتی اور جو کچھ ہاتھ، آتا اس پر گزارہ کرتی۔

خورشید میاں کے گھر جب آسیہ دوسری بار رہنے کے لئے آئی تو وہ ناقابل برداشت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ اس کا سکون غارت ہو چکا تھا اور ہر شے غیر یقینی ہوگئی تھی۔ ساری زندگی بھیک مانگنے کے سوا اس کو کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ زندگی میں اندھیرا تھا۔ روشنی کی کوئی کرن نہ تھی۔ قحط نے زندگی کا بوجھ مزید بڑھا دیا تھا۔ آسیہ کو بچوں کی فکر تھی اور اپنی جان کی بھی۔ اس صورت حال نے آسیہ کو اپنی زندگی کا بھرپور جائزہ لینے اور حالات کو بہتر بنانے کی خاطر کوئی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

یہ کوئی چھ سال پہلے کی بات ہے۔ آسیہ نے خورشید میاں سے تیس روپے ادھار لیے اور پھیری لگانے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے پان کے پتے، چھالیہ، تمباکو اور دوسری متعلقہ چیزیں مادھو پور سے خریدیں اور گلی گلی پان بیچنے لگی۔ بیٹی حاجرہ اس کے ساتھ ہوتی۔ اس کام سے وہ اوسطاً پانچ سات روپے روزانہ کمانے لگی۔ خورشید میاں سے اس نے جو رقم ادھار لی تھی۔ اس پر آسیہ کو کوئی سود نہیں دینا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ خورشید میاں کے گھر کا کوئی کام کاج کر دیا کرتی تھی۔ پان فروشی کو خاصی منافع بخش محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نے اس کام پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ جلد ہی اس کا سرمایہ تیس روپے سے بڑھ کر پچاس روپے ہو گیا۔ خشک موسم اور دھان کی کٹائی کے دنوں میں اس کی بکری بڑھ جاتی۔ پھر یوں بھی ہوتا کہ بعض لوگ اس سے پان لے کر نقد پیسے دینے کی بجائے اس کو دھان دے دیتے۔ کٹائی کے دنوں میں آسیہ بیس پچیس سیر دھان اسی طریقے سے اکٹھا کر لیتی۔ یوں اس کا منافع خاصا بڑھ جاتا اور آٹھ دس روپے یومیہ تک پہنچ جاتا۔ ان میں سے آسیہ دو تین روپے روزانہ بچت کرنے لگی۔ یہ رقم وہ اپنی جھونپڑی کے ایک بانس کے سوراخ میں ڈال دیتی۔ برسات کے دنوں میں جب پھیری کے لئے جانا محال ہو جاتا یا پھر جب وہ بیمار ہو جاتی تو گھر کا خرچ اسی بچت سے چلایا جاتا۔ یوں بھی برسات کے دنوں میں اس کا کاروبار مندا ہی رہتا۔ چنانچہ ان دنوں میں وہ ہمسایوں کا دھان صاف کرنے کا کام کرتی۔

1980ء میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے سیلاب آ گئے۔ آسیہ کے پاس

اپنی کوئی کشتی نہ تھی۔ لہٰذا اس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ دھان کے کام پر جانا بھی ممکن نہ رہا۔ حکومت نے ایک بار پھر امدادی مرکز قائم کیا، مگر کھانے کو جو کچھ وہاں سے ملتا، وہ بہت ہی ناکافی ہوتا۔ انہی دنوں آسیہ نے گاؤں کے ایک ساہوکار سے پندرہ روپے ماہوار کے سود پر ایک سو روپے ادھار لئے۔ بعد میں اس نے سود سمیت یہ قرض پھیری کے کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع میں سے ادا کر دیا۔

اسی سال آسیہ نے اپنی بیٹی حاجرہ کی شادی نواحی گاؤں کے مالک میاں کے بیٹے مرتضٰی سے کر دی۔ شادی کے وقت حاجرہ کی عمر سولہ سال تھی اور دولہا اس سے ایک سال بڑا تھا۔ مرتضٰی مالک میاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مالک اور اس کے بیٹے مزدور پیشہ تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا باڑہ تھا۔ زرعی اراضی کوئی نہ تھی۔ شادی کے موقع پر آسیہ نے سو روپے کا جہیز دیا۔ علاوہ ازیں اس نے بیٹی کو ایک ساڑھی اور داماد کو کرتا دیا۔ مرتضٰی نے دلہن کو چاندی کا ہار، چوڑیاں اور سونے کا ناک کا چھلا دیا۔ شادی کی تقریب میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔

حاجرہ کا مقدر بھی ماں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہ غریب تھی خوش باش گھریلو زندگی سے لطف اندوز نہ ہو سکی۔ جلد ہی اس کو گھریلو اخراجات کے لئے محنت مزدوری شروع کرنی پڑی۔ شوہر کے گھر کا سارا کام کاج کرنے کے علاوہ وہ دھان صاف کرنے کی مشقت میں بھی جت گئی۔ اس کام کے لیے ساس نے جلد ہی اس کو پڑوسیوں کے گھروں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اس کا نازک بدن شدید اور مسلسل مشقت کا بوجھ نہ سہار سکا۔ چنانچہ وہ بیمار پڑ گئی۔ علاج پر خاوند نے توجہ دی اور نہ ہی ساس نے۔ آسیہ کو خبر ہوئی تو وہ ماںتا کی ماری فوراً چلی آئی۔ اپنی جیب سے اس نے دوائیں بھی لا دیں۔ حاجرہ تندرست تو ہو گئی مگر اس کی خوشیاں چھن گئیں۔

حاجرہ ساس کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ہر وقت وہ بہو کے لئے مشکلات پیدا کرتی رہتی۔ حاجرہ کا شوہر ابھی نوجوان تھا۔ گھر کے کسی کام میں وہ دلچسپی نہ لیتا اور بے کاری میں دن گزار دیتا۔ اس کو بھی حاجرہ میں خامیاں ہی نظر آتیں اور وہ اس کو اس کی ماں کے ماضی کے طعنے بھی دینے لگا تھا۔ سسر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ منہ سے کچھ نہ کہتا۔ لیکن ساتھ بیٹے کا دیتا۔ ان حالات میں حاجرہ کی ازدواجی زندگی کا مستقبل روشن نہ رہا۔ یہاں تک کہ اگست 1981ء میں مرتضٰی نے حاجرہ کو طلاق دے دی اور اس غریب کو ماں کے پاس بھیج دیا گیا۔ مرتضٰی نے

MashalBooks.org

شادی پر اس کو جو زیور دیئے تھے، وہ سسرال والوں نے رکھ لئے، البتہ آسیہ نے جو کپڑے دیئے تھے، وہ بھی ساتھ ہی روانہ کر دیئے تھے۔

حاجرہ اب ماں کے پاس رہتی ہے اور آسیہ کی سب سے بڑی تشویش وہی ہے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ بیٹی کا نصیب بھی اس جیسا ہی ہوگا۔

اس سارے عرصے میں گاؤں والوں کا رویہ ہمدردانہ رہا ہے۔ آسیہ کی مدد کرنے کی خاطر وہ اس کو چھوٹے موٹے کام دیتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی آسیہ کو روزی کمانے کی خاطر کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ یہ صرف خورشید میں تھا جس نے پھیری کا کام کرنے کے لئے آسیہ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

گرامین بنک پراجیکٹ نے نومبر 1979ء میں ڈگرہ یونین میں ایک برانچ قائم کی تھی۔ شروع شروع میں یہ شاخ صرف مردوں کی امداد کرتی تھی۔ چنانچہ آسیہ کے گاؤں کے چند مردوں نے بھی اس برانچ سے قرضہ لیا۔ اس قرضے سے انہوں نے چھوٹے موٹے کاروبار شروع کئے اور منافع میں سے ہفتہ وار قسطوں کے ذریعے قرض واپس کر دیئے۔ ان کی کامیابیوں کا چرچا سن کر آسیہ کے دل میں اس بنک سے قرضہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر ایک روز وہ سیدھی بنک پہنچی اور مقامی فیلڈ مینجر سے گفتگو کی۔ فیلڈ مینجر نے اس کو بتایا کہ قرض تو اس مل سکتا ہے، تاہم پہلے اس کو گاؤں کی پانچ عورتوں کا ایک گروپ بنانا ہوگا۔ آسیہ کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چند ہی روز میں اس نے گروپ بنایا اور فیلڈ مینجر کو اس بارے میں اطلاع دے دی۔ بعد ازاں اس نے اپنے گروپ کی رکن عورتوں کے باقاعدہ اجلاس شروع کر دیئے۔ ان اجلاسوں میں وہ بنک کے قواعد وضوابط پر گفتگو کرتیں اور ساتھ ہی ساتھ گروپ میں نظم و ضبط قائم کرنے پر تبادلہ خیال بھی ہوتا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد بنک نے آسیہ کے گروپ کو رسمی طور پر قبول کر لیا۔ مامتا بیگم اس گروپ کی چیئر پرسن اور آسیہ سیکرٹری منتخب ہوئیں۔ ان کے علاوہ گروپ میں زلیخا، زرینہ اور سہاگی خاتون شامل تھیں۔ تقریباً ایک ماہ بعد بنک نے اسی گاؤں کی عورتوں کے دو اور گروپوں کو منظور کر لیا۔ ان تینوں گروپوں نے مل کر مامتا کے گھر میں ایک سنٹر بنا لیا۔

مارچ 1981ء کے پہلے ہفتے میں آسیہ اور مامتا دونوں کو پانچ پانچ سو روپے کے قرضے مل گئے۔ آسیہ یہ رقم اپنے پھیری کے کاروبار میں لگانا چاہتی تھی۔ چونکہ اس گروپ کی

تمام ارکان بنک کے قواعد وضوابط کی پابندی کر رہی تھیں، لہٰذا ایک مہینے کے اندر زلیخا اور زرینہ کو بھی ایک ایک ہزار روپے کا قرضہ حاصل ہو گیا اور پھر چند روز بعد سہاگی کو بھی پانچ سو روپے کا قرضہ مل گیا۔

آسیہ کی ہفتہ وار قسط دس روپے تھی، مگر اس کا کاروبار چمک رہا تھا، چنانچہ وہ دس روپے کے بجائے بیس تیس روپے اور کبھی کبھی چالیس روپے ہر ہفتے واپس کرنے لگی۔ قرضے کی رقم اس نے اپنے کاروبار میں لگائی تھی اور خاصا منافع ہونے کے باعث مقررہ وقت سے بہت پہلے اس نے بنک کی ساری رقم واپس کر دی۔ اس کے باوجود تین سو روپے کا منافع اس کے پاس بچ گیا۔ یہ رقم اس نے آئندہ کے منافع کے لئے لگا دی۔ اس نے اپنی جھونپڑی سے ملحقہ چار مرلے کا پلاٹ لیز پر حاصل کیا اور سرما کہ مختلف فصلوں کے لئے اس کو تیار کیا۔ اس خالی جگہ میں اس نے مرچیں، کدو اور پیاز وغیرہ اگا دیا۔ جب سبزیاں تیار ہو گئیں تو اس نے نہ صرف اپنے کنبے کی ضروریات پوری کیں بلکہ فالتو سبزیاں ڈیڑھ سو روپے میں فروخت بھی کر دیں۔ بعد ازاں آسیہ نے اسی پلاٹ میں دھان اگایا جس سے اس کو دو من چاول حاصل ہو گئے۔

مقررہ وقت سے پہلے اپنا پہلا قرضہ واپس کرنے کے بعد آسیہ نے بنک کو بارہ سو روپے کا قرضہ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ جلد ہی یہ رقم اس کو مل گئی۔ پہلے کی طرح اس نے یہ رقم بھی اپنے کاروبار میں لگائی اور قسطوں میں مقررہ وقت پر یہ قرضہ بھی اتار دیا۔ اس نے کبھی ایک قسط کی ادائیگی میں بھی کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی کبھی سنٹر کے کسی ہفتہ وار اجلاس سے غیر حاضر ہوئی ہے۔

اگست 1981ء کے آخری دنوں میں آسیہ نے تین ہزار روپے کا تیسرا قرضہ وصول کیا۔ اس رقم کی مدد سے اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی دکان کھول لی ہے، تاہم پھیری کا کام اس نے بند نہیں کیا۔ پان کے علاوہ اب وہ بعض دوسری چیزیں، مثلاً چوڑیاں، ربن، کولڈ کریم، پاؤڈر وغیرہ بھی بیچتی ہے۔ دن کے وقت وہ پھیری لگاتی ہے۔ اور شام کو اپنی دکان چلاتی ہے۔ ہفتے میں پانچ دن وہ یہ کاروبار کرتی ہے۔ ہر جمعے کو وہ سامان خریدنے مادھو پور جاتی ہے جب کہ ہر جمعرات کو دھان صاف کر کے چاول بناتی ہے۔ البتہ شام کو دکان بھی کھولتی ہے۔

جب آسیہ نے تیسرا قرضہ لیا تھا تو انہی دنوں اس کے گروپ فنڈ میں پانچ سو روپے جمع تھے۔ وہ یہ رقم کسی ذاتی ضرورت پر صرف کرنا نہیں چاہتی۔ زندگی کے تلخ تجربے سے اس نے یہ حقیقت جان لی ہے کہ وہ بوڑھی ہوگی اور کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہے گی تو کوئی اس کی مدد کو نہ آئے گا۔ اپنے ہی وسائل پر اس کو بھروسہ کرنا ہوگا۔ اسی لئے وہ اپنی بچت محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔

آسیہ اب اپنی خالہ کے بیٹے خالق کے باڑے میں رہتی ہے۔ اس کی چھوٹی سی جھونپڑی نو دس فٹ لمبی ہے اور پٹ سن کے ڈنٹھلوں سے بنی ہوئی ہے۔ مامتا جو گروپ کی چیئرپرسن ہے وہ اسی خالق کی شریک حیات ہے، خود خالق نے بھی گرامین بنک سے قرضہ حاصل کر رکھا ہے۔

آسیہ اور مامتا ایک دوسرے کی ہمدرد اور اچھی سہیلیاں ہیں۔ دونوں کا باورچی خانہ مشترک ہے۔

آسیہ کی گھریلو ضروریات بہت مختصر ہیں۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ گزشتہ ہفتے اس نے اپنے خاندان کے کھانے پینے کی اشیاء پر پچیس روپے صرف کئے تھے۔ اس رقم میں سے آسیہ نے دس روپے کی مچھلی، ایک روپے کا نمک، دو روپے کی مرچیں، چار روپے کا سرسوں کا تیل، دو روپے کا مٹی کا تیل، تین روپے کے آلو، دو روپے کا پیاز اور ایک روپے کا ادرک خریدا تھا۔

روزانہ آسیہ کو تقریباً سوا سیر چاول درکار ہوتے ہیں۔ گویا ہفتے میں دس سیر اور مہینے میں تقریباً ایک من چاول اس کو اپنے خاندان کے لئے چاہئیں۔ آسیہ کے گاؤں میں ایک من چاول تقریباً دو سو روپے میں ملتے ہیں۔

آسیہ کا نیا گھر براہمن ساشن بازار کے ایک نواحی گاؤں میں اس کے خالہ زاد خالق کے باڑے میں واقع ہے ہر روز صبح سات بجے وہ چھابڑی سر پر اٹھا کر پھیری لگانے جاتی ہے۔ وہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ڈگرہ یونین کے ہر گاؤں میں سودا بیچنے جاتی ہے۔ بعض گھرانے اس کے باقاعدے گاہک بن چکے ہیں۔ روزانہ وہ تین چار میل پیدل چلتی ہے۔ تاہم اگر وہ معمول سے کم وقت میں بیس سیر دھان اکٹھا کر لے تو بہت خوش ہوتی ہے اور واپس چلی آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں بیس سیر سے زیادہ وزن اٹھا نہیں سکتی۔

آسیہ پان اور اس متعلقہ اشیاء دھان کے بدلے فروخت کرتی ہے۔ بہت سی گھریلو خواتین اس کی باقاعدہ گاہک بن چکی ہیں۔ اس طرح جو دھان حاصل ہوتا ہے، جمعرات کے روز وہ اس کو صاف کرتی ہے۔ اس کا بھوسہ اتارتی ہے اور چاول نکالتی ہے۔ یہ چاول پھر وہ بیچ دیتی ہے اور یوں اس کو خاصا منافع مل جاتا ہے۔ آسیہ کا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ان چاولوں سمیت وہ ہر ہفتے تقریباً چھ سو روپے کی اشیاء فروخت کرتی ہے۔ گویا اس کی ماہوار فروخت ڈھائی ہزار روپے لے لگ بھگ ہے۔ اس میں سے ہفتہ وار منافع تقریباً 256روپے ہوتا ہے۔ یوں اس کی ماہوار آمدنی1060 روپے کے قریب بنتی ہے۔ اس رقم میں سے ہر مہینے360 روپے خوراک اور دوسری ضروریات پر خرچ کرتی ہے اور240 روپے کی چار ہفتہ وار قسطیں ادا کرتی ہے۔ یوں اس کو پانچ سو روپے ماہوار بچت ہو جاتی ہے۔

خیر، گزشتہ برس آسیہ کی اوسط ماہوار بچت پانچ سو روپے سے کم ہی رہی تھی۔ پھر بھی اس نے خاصی رقم بچالی تھی۔ اپنی جھونپڑی کی مرمت کے علاوہ اس کو کپڑے، برتن اور بعض دوسری اشیاء خریدنے پر کافی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ آسیہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے بارہ مرلے قابل کاشت زمین آٹھ سو روپے میں پٹے پر حاصل کی ہے۔

آسیہ اب اپنے مستقبل کے بارے میں بہت پر امید ہے۔ مایوسی کے دن بیت گئے ہیں۔ وہ محنت کرتی ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ وہ مزید اچھے دنوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اپنی بیٹی حاجرہ کے لئے وہ اچھا سا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کی شادی کے لئے آسیہ نے کچھ رقم پہلے ہی الگ رکھ چھوڑی ہے۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی کہ ''جب میرا مختار جوان ہوگا تو میری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔''

☆☆☆

MashalBooks.org